إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ
علمی دینی اصلاحی اور معلوماتی
اللطیف
ویلور
دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور

زیر حمایت وسرپرستی

شیخ المشائخ اعلیحضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری

دامت برکاتہم العالی سجادہ نشین خانقاہ حضرت قطبؒ ویلور

مدیر و مؤسس

حضرت اقدس مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اجرأ

برموقعہ جلسہ تقسیم اسناد: ۱۰ رشعبان المعظم ۱۴۱۴ھ م 23 ر جنوری 1994ء

○ زیرِ نگرانی :

مولانا مولوی سید شاہ عثمان پاشاہ صاحب قادری عرف فصیح پاشاہ
بی کام (عثمانیہ) ادیب فاضل (مدراس) ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور۔

مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری عرف ہلال پاشاہ ادیب فاضل
نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

○ زیرِ ادارت :

مولانا مولوی پی محمد ابوبکر صاحب ملیباری لطیفی قادری مدرس دار العلوم لطیفیہ

مولانا مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری مدرس دار العلوم لطیفیہ

○ نمائندگانِ طلباء :

- مولوی سید نور اللہ حسینی لطیفی۔ بیجاپور۔ (کرناٹک)
- مولوی۔ ایل رحمت اللہ لطیفی۔ پی۔ ٹی۔ ایم (آندھرا)
- حافظ شیخ ہارون		پی ٹلور۔ (تامل ناڈو)
- عبد الرشید		نل لاری (کیرلا)

فہرست مضامین اللطیف ۱۹۹۴ء

منظومات :

رباعیاتِ امجد

امجد حسین امجد
حیدرآبادی

کلام اللہ

قرآنِ کریم میں یہ کرامت دیکھی
ہر جزو کے ساتھ کُل کی شرکت دیکھی
ہر منزل کو اُسی کی منزل پایا
ہر سورۃ میں خدا کی صورت دیکھی

فرمانِ نفس

اچھا نہیں یہ غرور جلدی کیجے
حتی الامکاں ضرور جلدی کیجے
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے
چلنے کے لیے حضور جلدی کیجے

راحتِ منزل

اس عالمِ فتنہ زا سے روپوش ہوا
جاں بیچ کے قبر سے ہم آغوش ہوا
تسکینِ جگر نے، دل نے راحت پائی
تن خانہ بدوشی سے سبکدوش ہوا

بے ثباتی

بحرِ متلاطم میں بہا جاتا ہوں
ہر دم طرفِ لحد کھنچا جاتا ہوں
بازارِ فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے
میں صرف کفن لے کے چلا جاتا ہوں

پیشکش: مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری المعروف بہ ہلال پاشاہ صاحب
ادیب فاضل - نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ - حضرت مکان ویلور

غزل

از

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین
شیخ المشائخ حضرت
رکن الدین سید شاہ
ابوالحسن قادری
المتخلص بہ قربی
ویلوری رحمۃ اللہ علیہ

تجے دل میں اپس کے دیک دلبر کا جھلک دستا
یقیں سو کفر و ایماں پر تو مل کر ہور الگ دستا

وہی یک نور شاہد کا ہے رنگا رنگ کسوت میں
کہ جیوں آ ایک کثرت میں ہزاراں ہور لک دستا

نہیں ہے پست و بالا کچھ سخن میں اس وہی شاہد
زمیں دستا ہے پستی میں بلندی میں فلک دستا

وہی یک ذات ہے یاراں یقیں کے چشم سوں دیکھو
ضلالت ہور ہدایت میں کہ ابلیس و ملک دستا

میرا دل طور سینا ہے یقیں سوں بوجھتا ہوں میں
کہ اس میں جب تجلیا نارِ موسیٰ کا جھلک دستا

نگاہ تجہ لطف کے دلدار عینِ جاں نوازی ہے
اگرچہ قتل میں عاشق کے خنجر ہر پلک دستا

صنم کے چاند سے رخسار کے گوشے میں مہوش کے
ستارے تیوں او موتی گوشوارے کے دہلک دستا

سنیا! او ماہ رخ پر تو اپس رخسار کا قربی!
کہ دل تیرا مثالِ مہرِ نورانی دلک دستا

عصرِ حاضر میں یہ فضا بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے کہ قرآن وحدیث، فقہ واصولِ فقہ اور عقائد اور عربی زبان وادب سے براہِ راست علم وواقفیت کے بغیر احکام ومسائل کا استخراج کیا جا رہا ہے۔ اور ہر شخص اپنی فکر وخیال اور فہم ورائے کو صحیح ودرست قرار دے رہا ہے۔ اور جو بات بھی اس کی فہم وفکر اور رائے کے خلاف نظر آئے اس کو غلط اور گم راہ قرار دے رہا ہے۔ اگر ذرا غور وفکر کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ اس بے بنیاد فکر ورائے کے اظہار کے پیچھے صرف طلبِ وجاہت اور اپنی اپنی بے اصل رائے کی اشاعت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور یہی وہ صورتِ حال ہے جو امت کے درمیان اختلاف وتفرقہ اور دینِ متین کے اندر بحث ومباحثہ، افراط وتفریط، غلو وتعصب کا باعث بنی ہوئی ہے۔ امام غزالی نے بڑی معنی خیز اور دُور رس بات کہی تھی۔

عوام کا حق صرف یہ ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں اور اپنی عبادات میں لگے رہیں اور اپنی معاش و روزگار میں مشغول رہیں۔ اور علم کو اہلِ علم کے لیے چھوڑ دیں۔ اور جو شخص دین میں اتقانِ علم کے بغیر گفتگو کرے گا تو وہ انجانے طور پر گمراہی اور ضلالت کے بھنور میں پھنس جائے گا۔ اور عقائد و مذہب کے باب میں شیطانی مکائد کی کوئی حد ہی نہیں۔

یہی وہ خدشات اور امکانات تھے جس کی وجہ سے ہر دور کے علماء و فقہا کی اکثریت اس بات پر متفق رہی کہ ایک عامی شخص کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ ہو جائے اور ائمہ مجتہدین میں امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے مذہب سے متعلق یہ اجماع قائم ہو گیا۔ کہ خانۂ دین میں داخل ہونے کے لیے یہ چار دروازے ہیں اور جو شخص ان دروازوں میں سے کسی ایک دروازہ سے بھی آجائے تو وہ دین میں داخل ہو جائے گا اور ان چاروں راستوں سے دُوری وعلیحدگی گمراہی اور گمراہ کن ہے۔

اس سلسلہ میں مجددِ جنوبی ہند حضرت قطبِ ویلور کی بصیرت افروز تحریریں مینارۂ نور ثابت ہو سکتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"قرآن وحدیث سے احکام استنباط واستخراج کرنے کا حق ایک مقلد کو نہیں پہنچتا۔ مجتہد کا قول ہی

اس کے لیے دلیل وحجت ہے۔ اور اسے مجتہد کی رائے کے خلاف قرآن وحدیث سے احکام اخذ کرکے ان پہ عمل پیرا ہونے کا حق نہیں۔

عہدِ نبوّت کے بعد جو احکام ائمۂ مجتہدین کے اجتہاد سے حاصل کئے گئے ہیں وہ المجتھد یخطی ویصیب (مجتہد سے خطا اور صواب دونوں ممکن ہے) کے حکم کی رُو سے خطا اور صواب کے درمیان متردد ہیں لہٰذا موجبِ ظن ہے۔ موجبِ اعتقاد نہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل مفید ہے۔

مجتہد کا حکم حقیقت میں کتاب وسنّت کا حکم ہے۔ اس سبب سے کہ یہ حکم کتاب وسنّت میں پوشیدہ ہے اور صراحتًہ مذکور نہیں۔ اس حکم کے دریافت کرنے میں مجتہد سے اگر خطا بھی ہو جائے تو اس کو ایک اجر ہے اور اس مجتہد کی تقلید اگرچہ کہ خطا ہو، نجات کا باعث ہے۔

ایک مقلد کو بغیر کسی سبب اور وجہ کے اپنے امام کے مسلک کے خلاف عمل کرنے کا حق نہیں۔ خانۂ دین کے چار دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کو پسند کرتے ہوئے دوسرے دروازہ اختیار کرنا عبث ہے اور کارخانۂ عمل کو ربط وضبط سے خارج کرنا ہے۔ ہاں اگر ورع وتقویٰ اور احتیاط کے راستے پہ چلنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اپنے پسندیدہ مذہب کی وہ روایت اختیار کرے جس کی دلیل احسن ہے اور اقویٰ ہو۔ اور جس کا فائدہ زیادہ عام اور زیادہ مکمل ہو اور اس میں احتیاط زیادہ ہو۔ رخصت وسہل انگاری اور حیلہ جوئی کی راہ اختیار نہ کرے۔

مقلد کو حق نہیں کہ بعض فقہا کے مذہب کو بعض دوسرے فقہا کے مذہب پہ ترجیح دے زیادہ سے زیادہ اس کا کام اتنا ہے کہ وہ فقہا کے اختلاف اور فقہا نے جس چیز کو اختیار کیا ہے اس کا بیان کردے۔ بعض فقہا کے مذہب کو بعض دوسرے فقہا کے مذہب پہ ترجیح اور فوقیت کے بارے میں گفتگو نہ کرے بلکہ مذاہب کو قبولیت کے درجے میں رکھے۔ جمہور اہلِ سنت کے نزدیک مذاہبِ اربعہ میں حق دائر ہے۔

اہلِ سنّت والجماعت کے اختلافات اس نوع کے نہیں ہیں کہ ایک جانب سے دوسرے جانب کی تکفیر و تضلیل کی جائے۔ بلکہ حق ان چاروں مذاہب میں دائر اور شامل ہے۔ اگر ایک مذہب کی دلیل زیادہ راجح ہو تو دوسرے مذہب کو گم راہ اور غلط نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور اختلافی مسائل کے اندر ایک دوسرے پہ نکتہ چینی اور طعن و تشنیع نہیں کرنی چاہیے۔ اور باہم ایک دوسرے کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ بھی کسی دلیل ہی کے تحت مسئلہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ کہ وہ دلیل ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ اور کسی بھی اختلافی مسئلہ میں ایک ہی جانب حق ہونے کا یقین کرلینا اور اسی کو اہمیت وترجیح دینا اور اس کے اندر تعصب وغلو سے کام لینا یہ علمی وفقہی اختلاف کا غیر مناسب طریقہ ہے۔''

حضرت قطبؒ ویلوری کی فکر ورائے اور مسلک وموقف کو پڑھ لینے کے بعد اربابِ علم وفہم پہ یہ حقیقت

بآسانی شکار ہو سکتی ہے کہ یہی وہ حکیمانہ و معتدلانہ راہ وروش ہے جس پر گامزن رہنے میں اُمّت کی فلاح و بہبودی اور سلامتی و نجات ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کے چاروں مذاہب کی صداقت و حقّانیت، صحت و درستگی اور حق و صواب کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عہدِ تابعین سے لے کر آج تک ملّت اسلامی کی نہ صرف عوام بلکہ علماء و فضلا اور اہل اللہ و صوفیہ بھی ان مذاہب کے پیرو اور متبع رہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے علم و فضل اور کمال سے ایک دنیا فیض یاب ہوئی اور ہو رہی ہے لیکن اس عظمت و جلالت کے باوجود آپ امام احمد بن حنبل کے مذہب کی اتباع کرتے تھے۔ دنیائے تصوّف کی عظیم روحانی شخصیت حضرت شبلی امام مالک کے مذہب کی اتباع کرتے تھے اور کوہ پیکرِ علمی ہستی حضرت جنید امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اتباع کرتے تھے اور علم و فضل سے آراستہ بزرگ حضرت محاسبی امام شافعی کے مذہب کی اتباع کرتے تھے۔ امام ابویوسف، امام محمد، امام حسن بن زیاد، امام زفر اجتہاد و استنباط کی غیر معمولی استعداد رکھنے کے باوجود حنفی تھے۔ اور امام مزنی اور امام بویطی اجتہاد کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھنے کے باوجود شافعی تھے۔ اور ہندوستان میں شاہ عبدالحق محدّث دہلوی شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، شاہ اسماعیل دہلوی، امام ربانی مجدّد الف ثانی، حضرت سید احمد مجاہد اور ان حضرات کے مشائخ کبار امام اعظم ابوحنیفہ کے مذہب کی اتباع کرتے تھے۔ غرض تمام ائمۂ طریقت، اساطینِ ملّت اور جلیل القدر علماء و فضلا اور صوفیا اور امت کی اکثریت مذاہبِ اربعہ ہی کی اتباع کرتی رہی اور کر رہی ہے۔

ما راٰہ المسلمون حسنا فھو حسن: مسلمانوں کی اکثریت جس چیز کو اچھا خیال کرے وہ اچھی ہے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علیکم بالسواد الاعظم: تم پر لازمی ہے کہ سوادِ اعظم کی اتباع و پیروی کریں۔ لا تجتمع امتی علی الضلالۃ: میری امّت کی اکثریت گمراہی و ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔

ائمۂ اربعہ کی اتباع و پیروی کی ضرورت و اہمیت کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کے قائل اور معترف بھی ہیں کہ جن اشخاص کے اندر درج ذیل امور موجود ہوں تو وہ خود کو ائمہ کی تقلید سے آزاد کر لیں اور قرآن و حدیث سے مسائل استخراج کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو جائیں۔

اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر پانچ قسم کے علم جمع ہوں: کتاب اللہ[1] اور سنت رسول[2] کا علم، علمائے سلف[3] کے اقوال کا علم کہ کس بات میں ان سب نے اجماع کیا ہے اور کس بات میں اختلاف کیا ہے۔ لغت[4] کا علم، قیاس[5] کا علم۔

جس وقت کوئی حکم قرآن شریف و حدیث اور اجماع میں نہ مل سکے تو اس حکم کو کتاب و سنت سے قیاس کر کے نکالا جائے اور اس کام کے لیے ضروری ہے کہ علوم قرآن میں سے ان تیرہ[13] باتوں کا علم ہو۔ ناسخ، منسوخ مجمل، مفسر، خاص، عام، محکم، متشابہ، کراہت، تحریم، اباحت، ندب، وجوب۔

جس طرح علوم قرآن میں سے مذکورہ امور کی معرفت ضروری ہے اسی طرح حدیث رسول ؐ میں بھی ان تیرہ ۱۳ چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صحیح، ضعیف، مسند اور مرسل کا جاننا اور کتاب وسنت کا رتبہ نگاہ میں رکھنا اور ان کے حکم کو موافق (تطبیق) کرنا۔

اور اسی قدر لغت کا جاننا ضروری ہے جس قدر لغات ان آیات اور احادیث میں آئی ہیں۔ جن میں احکام شرع موجود ہیں اور لغت میں اس قدر دخل ہونا چاہیے جس سے کلام عرب کے مطلب کو دریافت کرسکیں اور مقام اور احوال کا اختلاف سمجھ سکیں۔ کیوں کہ اللہ اور رسول ؐ نے عربی زبان میں حکم فرمایا ہے۔

اور اس بات کا جاننا اور واقف ہونا ضروری ہے کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال جو احکام شرع میں وارد ہیں اور فقہائے امت کے اقوالِ معتبرہ سے جو فتاوی صادر ہوئے ہیں تاکہ ان لوگوں کے قول کی مخالفت نہ ہوسکے جب کسی شخص میں مذکورہ تمام باتوں کا علم جمع ہو اور وہ شخص خواہشِ نفسانی اور بدعات سے کنارہ کش ہو صاحبِ تقویٰ ہو اور گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو اور گناہِ صغیرہ پر مداومت اختیار کرنے والا نہ ہو تو اس کے لیے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے مسائل واحکام استخراج کرے اور اجتہاد واستنباط کرے۔ اور جس شخص کے اندر مذکورہ باتیں جمع نہ ہوں تو اس کو کسی ایک امام کی اتباع وپیروی کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔

حاصل کلام!

مذکورہ تشریحات اور توضیحات سے دو باتیں سامنے آرہی ہیں۔ ایک یہ کہ عامی شخص کے لیے ضروری ہے کہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی اتباع وپیروی کو اپنے اوپر لازم کرلے۔ اور اس کے لیے اس بات کی ممانعت ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے احکام ومسائل استخراج کرکے ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ اس شخص کا اپنے امام کے مسائل واحکام پر عمل کرنا ہی قرآن وحدیث پر عمل کرنا ہے۔ اور اپنے امام کی مخالفت بجز چند صورتوں کے جائز نہیں۔ جس کی تفصیل سیاق میں گزر چکی ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر کوئی صاحب ایسے ہوں جن کے اندر اجتہاد واستنباط کے وہ شرائط پائے جاتے ہیں جن کا ذکر ہم نے سیاق میں کیا ہے۔ ان کے لیے یہ حق واختیار حاصل ہے کہ وہ کسی ایک امام کی اتباع وپیروی سے آزاد رہیں اور قرآن وحدیث سے احکام ومسائل اخذ کرکے اُن پر عمل کریں۔

فقہائے کرام نے ایک طرف عوام کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید ضروری اور لازمی قرار دے کر دین میں فتنہ وانتشار کا سدِّ باب فرمایا تو دوسری طرف استنباط واستخراج کی صلاحیت رکھنے والے اربابِ علم وفضل اور تقویٰ کے ذریعہ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا رکھا تاکہ قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں جدید مسائل کو حل کیا جاسکے۔ اور ان کے اخذ کردہ مسائل سے عوام کے لیے روشنی ملتی رہے۔

ان تفاصیل کے مطالعہ اور جائزہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے پوری سنجیدگی اور وسعتِ قلبی کے ساتھ تین طلاقوں کے بارے میں ہونے والی عام بحث پر ایک نظر ڈالیے کہ کس انداز سے اس مسئلہ کو اخبارات اور رسائل وجرائد میں کھڑا کیا گیا ہے جس پر ہر شخص اپنی فکر و خیال اور رائے کو اس زور و اعتماد کے ساتھ بیان کر رہا ہے کہ یہی صحیح اور درست ہے اور ساری ملت کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ کیا اس صورتِ حال سے اسلام مخالف قوتوں کے لیے نئی ہمتیں اور نئی راہیں ہموار نہیں ہو سکتیں جو مسلمانوں کے عائلی قانون میں تبدیلی و ترمیم کے درپے ہیں اور کیا اس روش سے ملت کی عوام کے دل میں شریعت اسلامی اور ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرف سے شک و شبہ اور بے اعتمادی پیدا نہیں ہو سکتی اور یہ اس قسم کا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ اس کے متعلق اجتہاد و قیاس سے کام لے کر تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیں۔ حالاں کہ عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک اہل سنت کے چاروں مذاہب میں یہ مسئلہ متفق علیہ رہا ہے۔ شارح مسلم امام نووی فرماتے ہیں:

قد اختلف العلماء فی من قال لامرأته انت طالق ثلاثاً فقال الشافعی و مالك و ابو حنیفه و احمد و جماهیر العلماء من السلف والخلف تقع الثلث

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ تجھے تین۳ طلاقیں ہیں تو اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام مالکؒ امام ابو حنیفہ امام احمد بن حنبل اور سلف و خلف کے جمہور و ثقہ علماء و فقہاء کی رائے یہ ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

و ذهب جمهور من الصحابة والتابعین ومن بعدهم من ائمة المسلمین الی انه تقع الثلث

جمہور صحابہ کرام، حضرات تابعین اور بعد کے ائمہ کرام کی رائے ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

حضرت ابو رکانہؓ کی طلاق کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو بنیاد بنا کر تین طلاق کو ایک ہی طلاق قرار دیتے ہوئے عمل کیا جائے تو یہ اقدام جمہور صحابہؓ و تابعین، ائمہ اربعہ اور ہر دور کے علماء و فقہا کی اکثریت کی اجماعی واتفاقی مسئلہ سے انحراف کرنا ہے اور یہ ایسے شخص کے لیے جائز نہیں جو ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی اتباع کر رہا ہو۔ علاوہ ازیں ائمہ اربعہ کے مذاہب کی اتباع سے روگردانی کرتے ہوئے صرف حدیث پر عمل کرنا ایک عامی شخص کے لیے انتہائی دشوار اور مشکل ہے۔ کیوں کہ مسئلہ طلاق ہی نہیں ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن کے اندر احادیث مختلف و متضاد واقع ہوئی ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ ایسی صورت میں ایک عامی شخص کس حدیث پر عمل کرے گا اور کس حدیث کو ترک کر دے گا۔ اس کو سوائے حیرانی اور پریشانی کے کوئی چیز حاصل نہ ہوگی اور آخر کار وہ کسی صاحبِ علم کی تقلید کا محتاج ہوگا جو اس کی رہ نمائی کر سکے۔ ●●

روداد دارالعلوم لطیفیہ

ادارہ

الحمدللہ والمنۃ یہ مدرسہ ساداتِ کرام اور خاندانِ اہل بیت کا ہے۔ خدا کی مدد اور بزرگانِ حضرت مکان کی یہ زندہ کرامت ہے کہ مدرسہ اسلاف اور مشائخ دین کی روایات کو قائم و باقی رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ اس دورِ پُر فتن کی مسموم فضا میں محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔

جو طلباء اس دارالعلوم سے اکتسابِ علم کرتے ہیں انہیں ایک ڈسپلین اور سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے علم کی لازوال دولت کے ساتھ ساتھ بزرگانِ مکان کی عنایات و توجہات ان کے حال پر مبذول رہتی ہے۔ اس طرح تمام انوار و برکات کے سایہ میں علم و عمل کی راہ میں عروج و ترقی کی منزل کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

آغازِ سالِ نو

۱۲ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۳ھ مطابق 5 اپریل سنہ 1993ء روز دوشنبہ، دارالعلوم کا تعلیمی سال شروع ہوا۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں سے طلباء کی آمد ہوئی۔ اور سال بھر تحصیلِ علم میں مشغول رہے اور ۱۰ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۴ھ مطابق 23 ماہ جنوری سنہ 1994ء کو یہ سلسلہ ختم ہوا۔

دورۂ حدیث

۲۵ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۳ھ بروز دوشنبہ، تقدس مآب اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری قبلہ مدظلہ العالی سجادہ نشین مکانِ حضرت قطبِ ویلور قدس سرہٗ العزیز کی مخلص دعاؤں اور اجازت سے بدست مبارک عالی جناب مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری صاحب ایم اے، ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور، امسال دورۂ حدیث کا آغاز ہوا۔ بحمد اللہ! مورخہ ۱۰ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۴ھ مطابق 23 ماہ جنوری سنہ 1994ء روز یکشنبہ اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہ العالی کی دعاؤں سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ادبی وافتتاحی اجلاس

اس انجمن کا مقصد طلبا ء میں تقریر وخطابت کی قوت بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ اسلام کے پیغام کو اچھے اور عمدہ طریقے سے قوم کے سامنے پیش کرسکیں۔ مذکورہ انجمن کا یہ اجلاس ہفتہ وار ہوتا ہے۔ ایک شب جمعہ اور دوسرا صبح جمعہ۔ اول الذکر اجلاس کی صدارت باری باری محترم ومکرم عالی جناب ناظم صاحب ونائب ناظم صاحب اور اساتذہ کرام کرتے ہیں۔ جس میں مقررین طلبا کی خامیوں کی نشان دہی کرکے اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حسبِ معمول اس سال بھی انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس بزیر صدارت عالی جناب مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری صاحب ایم اے، ناظم دارالعلوم مورخہ ۲۱ ر ماہ ذی قعدہ ۱۴۱۳ھ مطابق 13 ر ماہ مئی 1993ء روز پنجشنبہ دن کے تین بجے مقرر ہوا۔ جس میں دیرینہ روایات کے مطابق ایک خطیب کو مدعو کیا گیا جن کا اسم گرامی عالی جناب ایس۔ مسعود سراج صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ اردو، ماناسا گنگوتری یونیورسٹی آف میسور، موصوف نے بہت جامع انداز میں طلبائے دارالعلوم کو خطاب فرمایا۔ جس میں علم دین کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ عربی تعلیم حاصل کرنے والا احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے اور معاش اس کے لیے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں آپ طلباء سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کی عقل اس فیصلہ کو تسلیم کرسکتی ہے کہ روحانی، جسمانی اور عقلِ سلیم کی مکمل تربیت کے بعد کیا انسان دنیا کی نظروں سے گرسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وسیع وعریض کارخانہ میں معاش سے جب ادنیٰ پرندہ بھی پریشان نہیں ہے اور اپنی پروازمیں کوتاہی آنے نہیں دیتا تو کیا ہم عربی تعلیم یافتہ اس قدر تنگ نظری سے زندگی گزار سکتے ہیں؟ نیز موصوف نے فرمایا کہ میسور یونیورسٹی سے بغیر کسی انگریزی پرچے یا امتحان کے اردو بی،اے؛ ایم،اے؛ کے امتحانات آپ لوگ دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ۲۰ اور ۲۵ سال کی عمر ہو۔ جس سے ہمارے طلباء اپنی زندگی ایک اچھے پوزیشن ومقام پر لے جا سکتے ہیں۔

بعدازاں عالی جناب مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ صاحب قادری ایم اے، ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طلبا سے خطاب فرمایا۔ موصوف نے دارالعلوم کی خدمات کی نشان دہی کرتے ہوئے دعوتِ فکر دی کہ محنت وجستجو سے ہی انسان کامیاب ہوتا ہے اور اپنے مستقبل کو روشن بنا سکتا ہے۔ اس لیے آپ ہمہ تن علم کے حاصل کرنے اور لوگوں پہنچانے کے لیے کوشاں رہیں۔ ناظم موصوف کی دعاؤں کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

دارالتصنیف والاشاعۃ

بحمد اللہ یہ شعبہ جس مقصد کے لیے عمل میں آیا وہ اپنی جگہ کامیاب ہے۔ اب تک اقطاب ویلور کی مختلف تصانیف کے تراجم و شرح "اللطیف" میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان شاء اللہ اس سال "جواہر السلوک" "جواہر الحقائق" کی چوتھی قسط اور "فصل الخطاب" کی آخری قسط ہدیۂ ناظرین ہے۔

اسبابِ صحت

ہر شام بعد نمازِ عصر طلبا کی دماغی فرحت اور جسمانی راحت کے اسباب والی بال، بیڈ منٹن، کبڈی وغیرہ مختلف گیمس کھیلے جاتے ہیں۔

نویدِ مسرت

یونیورسٹی آف مدراس کے اورینٹل ٹائیٹل امتحانات میں امسال بھی ہمارے طلبا ممتاز و نمایاں نمبرات سے کامیابی حاصل کی ہے۔

امتحانات

دارالعلوم میں سال بھر دو امتحانات ہوتے ہیں۔ ایک ششماہی اور دوسرا سالانہ، ششماہی امتحانات مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ کو شروع ہوکر ۲۴ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ کو ختم ہوئے۔ اور سالانہ امتحانات ۲۷ رجب المرجب کو شروع ہوکر شعبان ۳ کو ختم ہوئے۔ امتحان ہال کی نگرانی خود ہمارے اساتذہ کرام باری باری انجام دیتے ہیں۔

عبا پوشی واعطائے اسناد

فضیلت مآب اعلیٰحضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی کی دعاؤں و اجازت سے بزیر صدارت عالی جناب مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری صاحب ناظم دارالعلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور۔ مورخہ ۱۰ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ مطابق 23 جنوری 1994ء روز یکشنبہ، دارالعلوم کا سالانہ اجلاس اچھے پیمانے پر منعقد ہوا۔ جس میں قابل ترین علماء و فضلاء مدعو تھے۔ نیز ناظم دارالعلوم نے اپنے دستِ مبارک سے فارغین کو اسناد عطا فرمایا۔

تقسیم انعامات

اسی شام میں ایک دوسری نشست منعقد ہوئی، جس میں درسیات و مقابلۂ تحریر و تقریر اور گیمس و اسپورٹس میں اول و دوم آنے والے طلبا کو قیمتی انعامات سے نوازا گیا اور عہدے داروں کو ان کی خدمات کے صلے میں مختلف انعامات دئے گئے۔

ہدیۂ تشکّر

ادارۂ "اللطیف" کے ان تمام مضمون نگار حضرات و مدیرانِ مسئول اور جناب کاتب محمد شریف صاحب برکاتی، آمبور اور جناب سید علیم الدین صاحب علیم صبا نویدی، مدراس جنہوں نے اپنی نگرانی میں کتابت و طباعت کا بہ نفسِ نفیس کام انجام دیا نیز اُن تمام اطباء جو اساتذۂ کرام و طلبائے دارالعلوم کی صحت کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے علاج فرمایا۔ ان تمام مخلصین کا۔ تہِ دل سے ممنون و مشکور ہے۔

ہم بارگاہِ ربّ العزّت میں دست بدُعا ہیں کہ وہ ہم کو اور ان سب کو جو دارالعلوم سے قلبی لگاؤ رکھتے ہیں سعادتِ دارین سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین بجاہِ سیّد المرسلین!۰۰

نعت شریف

نازش

یہ زندگی ہے فانی اس در سے گزر جائے
پھر گلشنِ ہستی کی رنگت ہی بدل جائے

اللہ غنی اس کی تقدیر کا کیا کہنا
چوکھٹ پہ محمدؐ کی دیوانہ جو مر جائے

اسباب نہیں بنتے روضہ پہ پہنچنے کے
بتلاؤ یہ دیوانہ جائے تو کدھر جائے

اک ذکر تمہارا ہی روزی ہے مِرے دل کی
بیکار وہ لمحے جو بے یاد گزر جائے

اللہ تعالیٰ کا احسان یہ کیا کم ہے
اُن تک تو نہیں جاؤں آواز مگر جائے

اس سر پہ ہزاروں سر قرباں ہوں اے نازش
سرکارِ مدینہ کی الفت میں جو سر جائے

پیشکش

مولوی سیّد عبدالقادر، وانمباڑی لطیفی

مولانا مولوی حافظ ابو النعمان شاہ بشیر الحق قریشی قادری، استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

ابن مریمؑ
(اسلامیات کی روشنی میں)

نزولِ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کی اصلاح اور تادیب کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ آں جنابؑ سے قبل بھی کئی انبیائے کرام اس قوم میں بھیجے گئے لیکن یہ لوگ اپنی حق دشمنی اور باطل پسندی کے باعث انبیائے کرام پر ظلم و ستم ڈھاتے اور قتل کر دیتے تھے۔

حضرت زکریا علیہ السلام، یرمیاہ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام اور بھی خدا رسیدہ اور صالح ترین افراد ان کے ظلم کا نشانہ بنے۔ حضرت مسیحؑ نے انہیں برائیوں اور ناجائز کاموں سے روکنا شروع کیا تو یہ اپنی قدیم روش کے مطابق آپؑ کے بھی سخت ترین دشمن ہو گئے اور آپؑ کی تذلیل و تکذیب کی اور قتل کے درپے ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو آسمان پر اٹھا لیا اور آپؑ کو صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کئے جانے والے واقعہ کو مشتبہ بنا دیا۔ وحیٔ محمدیؐ کی تصریح ملاحظہ ہو:

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفى شك منه ـ ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا ۝ بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزا حكيما ـ اور اُن لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم نے مسیح ابنِ مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔ در حقیقت انہوں نے نہ مسیح کو قتل کیا اور نہ

صلیب پر چڑھایا بلکہ یہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے ان کے بارے میں اختلاف کیا وہ بھی دراصل شک وشبہ میں گرفتار ہیں۔ اُن کے پاس بھی اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انھوں نے یقین کے ساتھ مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُن کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے زندہ بچ جانے کی قرآنی تصریح کی تائید انجیل برنابا سے بھی ہوتی ہے۔ برنباس لکھتا ہے۔ کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا) مجھے بیس ۲۰ سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا۔ پھر فرمایا:

" اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا۔ کیوں کہ خدا مجھے زمین سے اوپر اٹھالے گا اور اس غدّار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مدّت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی۔ مگر جب محمدؐ خدا کا مقدّس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دُور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اُس مسیح (محمدؐ) کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ جان لیں کہ میں زندہ ہوں اور اس ذلّت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

(باب : 113)

قرآنِ کریم کی تصریح اور انجیل کے مذکورہ بیان اور احادیثِ نبویؐ جو حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی سے متعلق موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اور جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور آپؑ اس وقت باحیات ہیں پھر دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ واقعہ یوں رہا کہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک غدّار حواری نے رومی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار کرایا اور پیلاطُس کے عدالت میں پیشی ہوئی اور سزائے موت کا فیصلہ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حواری کی صورت حضرت عیسیٰؑ کی صورت کے مانند کر دیا اور اس کی زبان گنگ کر دی۔ یہودیوں نے اس شخص کو صلیب پر لٹکا دیا۔

حضرت مسیح ابن مریم کے نزول کے باب میں احادیث اس کثرت سے وارد ہیں کہ وہ تواتر کی حد کو پہنچ چکی ہیں۔ یہاں چند کی نقل کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم والذی نفسی بیده لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الحرب ویفیض المال حتی لا یقبله احد حتی تکون السجدة الواحدة خیراً من الدنیا وما فیها۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں

میری جان ہے۔ ضرور تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے۔ پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے اور مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہو گی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور لوگ خدا کے حضور ایک سجدہ کریں کو دنیا وما فیہا سے بہتر خیال کریں گے۔

لاتقوم الساعۃ حتیٰ ینزل عیسیٰ ابن مریم : (بخاری)

جب تک حضرت عیسیٰؑ نازل نہ ہولیں قیامت قائم نہ ہو گی۔

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس بینی وبینہ نبی (یعنی عیسیٰؑ) وانہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض بین ممصرتین کان راسہ یقطر وان لم یصبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الجزیۃ و یھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام و یھلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنۃ ثم یتوفی فیصلی علیہ المسلمون

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور انُ (یعنی عیسیٰؑ) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور وہ نازل ہونے والے ہیں۔ جب تم انُ کو دیکھو تو پہچان لینا۔ وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں۔ رنگ مائل سرخی و سپیدی ہے۔ زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ انُ کے زلف ایسے ہوں گے گویا سر کے بالوں سے پانی ٹپک رہا ہے حالاں کہ وہ تر نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے۔ صلیب توڑ کر ڈالیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیہ ختم کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ انُ کے دور میں اسلام کے سوا سارے مذاہب اور ملّتوں کو ختم کر دیگا اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے اور وہ چالیس سال تک زندہ رہیں گے۔ ان کا انتقال ہوگا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدّجال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدواللہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب حتّٰی یھلک ولکن یقتلہ اللہ بیدہ فیریھم دمہ فی حربتہ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: اس دوران میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیر کہی جا چکی ہو گی کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے۔ اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (دجّال) ان کو دیکھتے ہی پانی میں نمک کی طرح گھلنے لگے گا۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اس کو اسی حال میں چھوڑ دیں تو خود بخود گھل کر مر جائے گا لیکن اللہ اس کو انُ کے ہاتھوں سے قتل کرائے گا۔ اور وہ اپنے نیزہ میں اس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ...... ینزل الروحاء فیحجّ منھا او یعتمر او یجمعھما۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت عیسیٰ روحاء کے مقام پہ منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے یا دونوں کو جمع کریں گے۔

عن عبداللّٰہ بن عمرو قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یخرج الدجّال فی امتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یوماً او اربعین شھرا او اربعین عاماً) فیبعث اللّٰہ عیسیٰ بن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہ ثم یمکث النّاس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ (مسلم)

عبداللّٰہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امّت میں دجال ظاہر ہوگا اور میں نہیں جانتا کہ وہ چالیس دن یا چالیس ماہ یا چالیس سال رہے گا۔ پھر اللّٰہ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہ بن مسعود ثقفی (صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ اور وہ اس کا تعاقب کریں گے اور اس کو ہلاک کردیں گے۔ پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت و دشمنی نہ ہوگی۔

مذکورہ احادیث کی روشنی میں جو حقائق سامنے آرہے ہیں وہ یہ ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور وہ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپؑ کی سابقہ نبوت برقرار رہے گی۔ لیکن اس کے تحت احکام کی تنفیذ نہ ہوگی کیوں کہ آپؑ کے حق میں اور دیگر انسانوں کے حق میں منسوخ ہوچکی ہے اور آپؑ کی آمدِ ثانی سے ختمِ نبوت پہ کوئی اثر واقع نہ ہوگا۔ کیونکہ آپؑ کی یہ تشریف آوری ایک حاکم وعادل اور خلیفۂ محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی حیثیت سے ہوگی۔ اور آپؑ کے نزول کے بعد عیسائیت ایک مستقل مذہب وملّت کی حیثیت سے باقی نہ رہے گی اور نہ صرف ملّتِ مسیحی بلکہ ساری ملّتوں کے اختلافات ختم ہوجائیں گے اور صرف اسلام وحیِ محمدیؐ کی دعوت وتبلیغ ہوگی اور قرآن کی یہ حقیقت نمایاں اور روشن ہوجائے گی۔ لیظھرہ علی الدین کلہ۔ اور جنگ وجزیہ کا مسئلہ ہی ختم ہوجائے گا۔ مال ودولت کی اس قدر کثرت اور فراوانی ہوگی کہ کوئی شخص قبول کرنے والا نہ ہوگا۔ اور دجّال اور اس کے فتنہ کو پوری طرح ختم کردیں گے اور حضرت عیسیٰؑ کی شادی ہوگی اور آپؑ صاحبِ اولاد ہوں گے اور انتقال فرمائیں گے اور مسلمان آپؑ کی نمازہ جنازہ ادا فرمائیں گے اور بعض روایات کے مطابق روضۂ مصطفویؐ میں مدفون ہوں گے۔

اس مقام پہ علامہ آلوسی اور علامہ تفتازانی کے یہ دو بیانات بھی پڑھ لیجئے تاکہ اس شک وشبہ کا پوری طرح ازالہ ہوجائے جو مسیح موعود کی آمدِ ثانی سے متعلق بعض اذہان میں پرورش پا رہا ہے۔

تفسیر روح المعانی میں مرقوم ہے:

ثم انہ علیہ السلام حین ینزل باقٍ علی نبوتہ السابقۃ لم یعزل عنھا بحال لکنہ

(بقیہ صفحہ 186 پہ ملاحظہ ہو)
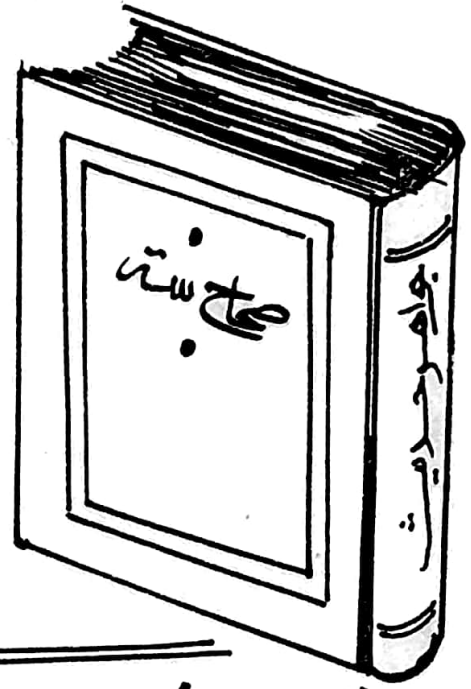
افضل العلماء مولانا مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

مرض احادیث کی روشنی میں

انسان کی زندگی میں مرض اور بیماری کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔ اور ہر شخص غذائیات اور موسمیات کے اثر سے اور آب ہوا کی تبدیلی وخرابی سے اور اپنے اعضائے بدنی کی قوت وعمل میں عدم توازن اور ضعف وانحطاط کی وجہ سے متعدد اور گوناگوں امراض کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے شریعت مطہرہ نے امراض کے علاج اور مریضوں کی خدمت اور ان کی عیادت کی ترغیب وتحریص دلائی۔

ذیل میں مختلف پہلو دار معانی ومطالب کی حامل اور متنوع احکام ومسائل کی شارح احادیث کا ایک جائزہ اور مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ جس کے ذریعہ جو حقائق ونکات اور فوائد سامنے آئیں گے اُن کی اجمالی تفصیل اس طرح سے ہے:

(۱) امراض کا علاج۔ (۲) امراض کی تشخیص۔ (۳) دواؤں کی تلاش
(۴) حرام اشیاء سے علاج کی ممانعت۔ (۵) امراض متعدی ہیں یا نہیں! (۶) علم طب کی اہمیت وضرورت
(۷) مریضوں کی عیادت اس عمل پہ رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ رب کا حصول۔
(۸) مریضوں کے لیے دعا اور ان سے اپنے لیے دعا کروانے کا حکم۔

(۹) غیر مسلم بیماروں کی عیادت و مزاج پرسی کے لیے جانا۔ (۱۰) امراض پر اجر و ثواب۔
(۱۱) امراض کے ذریعہ گناہوں کی پاکی صفائی۔ (۱۲) بیماری کے دنوں میں مریض کے نامۂ اعمال میں ان اعمالِ صالح کے ثواب کے اندراج جن کو وہ زمانۂ صحت میں انجام دیا کرتا تھا۔ (۱۳) مرض کی وجہ سے احکامِ شرعیہ میں سہولت و تخفیف۔ (۱۴) مریضوں کے آرام کا خیال اور ان کی خدمت۔ (۱۵) اسمائے الٰہی اور ماثورہ دعائیں اور مجرب اعمال اور اذکار کے ذریعہ علاج۔ (۱۶) صدقہ و خیرات کے ذریعہ علاج۔ (۱۷) امراض پر صبر و ضبط کا مظاہرہ۔ (۱۸) طاعون وغیرہ جیسے امراض میں وفات پانے پر شہید کا اجر و ثواب۔

۱۔ حضرت اسامہ بن شریک کا بیان ہے کہ کچھ دیہاتی بدوی اشخاص نے نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: الا نتداوی؟ کیا ہم بیماری میں علاج معالجہ نہ کریں؟ آپؐ نے جواب دیا: نعم یا عباد اللہ تداووا فان اللہ لم یضع داء الا وضع لہ شفاء او قال دواءً (ترمذی) ہاں ہاں اے اللہ کے بندو! علاج کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری پیدا کی ہے۔ اس کے لیے دوا اور شفاء رکھی ہے۔

(2) ان اللہ لم ینزل داء الا انزل لہ شفاء علمہ من علمہ وجہلہ من جہلہ۔
(مسند احمد) اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری آتاری ہے اس کی دوا اور شفاء بھی آتاری ہے۔ جاننے والا اسے جانتا ہے۔ اور نہیں جاننے والا نہیں جانتا۔

(3) ما انزل اللہ داءً الا انزل لہ شفاءً۔ (بخاری)
اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری نازل کی ہے اس کے لیے شفا بھی نازل کی ہے۔

(4) لکل داء دواء فاذا اصیب دواء الداء برأ باذن اللہ (مسلم)
ہر مرض اور بیماری کے لیے دوا ہے۔ جب صحیح طریقہ سے علاج ہوتا ہے اور اس مرض کی ٹھیک دوا حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ کے حکم اور مشیت سے صحت حاصل ہوتی ہے۔

مذکورہ حدیث کی تشریح میں شارح مسلم علامہ امام نوویؒ لکھتے ہیں: وفی ھذا الحدیث اشارۃ الی استحباب الدواء وھو مذھب اصحابنا وجمھور السلف وعامۃ الخلف۔ اس حدیث میں یہ اشارہ موجود ہے کہ دوا اور علاج کرنا مستحب ہے۔ یہی ہمارے فقہائے کرام (شافعیہ) اور جمہور اور خلف میں عام لوگوں کا موقف ہے۔

مذکورہ حدیث سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو رہی ہے کہ ہر مرض اور بیماری کا علاج ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم ہو تو ہر دوا اپنا اثر دکھاتی ہے اور مریض کو صحت و شفا عطا کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص مرض کے علاج اور اس کی دوا تک انسان کے علم اور اس تحقیق کی رسائی نہ ہوئی ہو یعنی جب

بہت سارے امراض جو لاعلاج سمجھے گئے تھے موجودہ زمانے میں سائنس اور میڈیکل نے ان کی دوائیں اور علاج دریافت کرلیا ہے۔ جیسے جیسے جدید تحقیقات اور انکشافات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائیگا لکل داء دواء کی تفسیر سامنے آتی رہے گی۔

دوا اور علاج کے ساتھ دُعا کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی جب کبھی بیمار ہوتے تو آپؐ یہ دعا پڑھتے اور اپنے ہاتھوں پہ پھونک کر سارے بدن پہ پھیر لیتے۔

(5) اللّٰھم اذھب الباس ربّ الناس اشف انت الشافی لاشفاء الا شفاءک لایغادر سقما۔ (بخاری مسلم)

اے اللہ! اس تکلیف کو دُور فرما، اے انسانوں کے رب، شفاء عطا فرما۔ تو ہی شفا دینے والا ہے تیرے سوا کسی سے شفا کی توقع نہیں۔ ایسی شفا بخش کہ بیماری کا نام ونشان نہ رہے۔

(6) ایما مسلم دعا بھا (لا الٰہ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظالمین) فی مرضہ اربعین مرۃ فمات فی مرضہ ذٰلک اُعطی اجر شہید وان براٴ وقد غفر لہ جمیع ذنوبہ۔ (مستدرک۔ حاکم)

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بھی مسلمان اپنی بیماری میں چالیسؐ بار یہ دُعا لا الٰہ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظالمین پڑھے اور اپنے اس مرض میں انتقال کر جائے تو اسے شہید کا اجر ملے گا اور اگر صحت مند ہو جائے تو اس طرح صحت یاب ہوگا کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو چکے ہوں گے۔

(7) قرآنِ کریم اور ماثورہ دعاؤں کے ذریعہ شفا وصحت طلب کرنا چاہیئے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے من لم یستشفاء بالقرآن فلا شفاء لہ: جس نے قرآن سے شفاء طلب نہیں کی اس کے لیے صحت اور شفاء نہیں۔

(8) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر الدواء القرآن (ابن ماجہ) بہترین دوا قرآن ہے۔

(9) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیکم بالشفائین العسل والقرآن: (ابن ماجہ) تم پر لازمی ہے کہ دو چیزوں کے ذریعہ شفا حاصل کرو (۱) شہد اور (۲) قرآن۔

(10) ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سینے میں درد اور تکلیف کی شکایت کی تو آپؐ نے انھیں قرآن کی تلاوت کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: دیکھو اللہ نے کہا ہے۔

شفاء لما فی الصدور یعنی قرآن میں سینوں کے امراض کے لیے شفا ہے۔

(11) عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی فاتحۃ الکتاب شفاء من کل داء: (مشکوٰۃ) سورۂ فاتحہ میں ہر مرض کی شفاء ہے۔
سورۂ فاتحہ کی تاثیر اور اس سے شفاء طلبی کے بارے میں شارحِ مسلم امام نوویؒ فرماتے ہیں: بانھا رقیۃ فیستحب ان یقراء بھا علی اللدیغ والمریض وسائر اصحاب الاسقام والعاھات: سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے جس شخص کو سانپ یا بچھو کاٹ لے اس کے اوپر اور جو مریض ہے، اس کے اوپر اور جو بھی آفت زدہ ہے اُس کے اوپر اور طرح طرح کی بیماریوں میں گھرے ہوئے انسانوں پر اس سورہ کا پڑھ کر پھونک دینا (یا دم کرکے پانی پلانا) پسندیدہ اور مستحب کام ہے۔

(12) امام بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے کے لیے بستر پر لیٹتے تو سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیوں پر پھونکتے اور انھیں اپنے چہرہ اور جسم پر جہاں تک وہ ہاتھ پہنچ سکے، پھیرتے تھے۔ جب آپؐ بیمار ہوئے تو مجھ سے فرماتے تھے کہ تم ان سورتوں کو پڑھ کر میرے چہرے اور جسم پر ہاتھ پھیرو۔
شارحِ مسلم، امام نوویؒ فرماتے ہیں: فی ھذا الحدیث استحباب الرقیۃ بالقرآن وبالاذکار انما رقی بالمعوذات لانھن جامعات للاستعاذۃ من کل مکروھات جملۃ وتفصیلاً
قرآن کریم اور دیگر ادعیہ ماثورہ اور اذکار کو پڑھ کر پھونکنا (یا مریض پر یا پانی پر پھونک کر پلانا) مستحب ہے۔ خاص طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معوذتین پڑھ کر پھونکیں۔ کیوں کہ یہ جامع استعاذہ ہیں۔ جن میں اجمالاً اور تفصیلاً سارے مکروہات ناپسندیدہ امور سے پناہ طلب کی گئی ہے۔
عمرۃ بنت عبدالرحمٰن فرماتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا مزاج ناساز تھا۔ ایک یہودی خاتون کچھ پڑھ کر ان پر پھونک رہی تھی کہ اس دوران میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے اور دیکھ کر فرمایا: ارقیھا بکتاب اللہ: اللہ کی کتاب قرآنِ کریم پڑھ کر پھونکو۔

(13) حضرت ابو درداء کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: تُم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا اس کا کوئی بھائی بیمار ہو تو یہ دُعا پڑھے۔ ان شاء اللہ صحت و شفا حاصل ہوگی۔
ربنا اللہ الذی فی السماء تقدس اسمک امرک فی السماء والارض کما رحمتک فی السماء فاجعل رحمتک فی الارض اغفرلنا حوبنا وخطایانا انت رب الطیبین انزل رحمۃ من رحمتک وشفاء من شفائک علی ھذا الوجع۔ (ابو داؤد)

(14) عن عائشہ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اشتکی نفث علی نفسہ بالمعوذات ومسح عنہ بیدہ فلما اشتکی وجعہ الذی توفی نفسہ کنت انفث علیہ بالمعوذات التی کان ینفث وامسح بید النبی صلی اللہ علیہ وسلم (متفق علیہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی بیمار ہوتے تو آپؐ معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کرکے جسم پہ پھیر لیا کرتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے قریب بیماری میں معوذتین میں خود پڑھ کر آپؐ کے ہاتھوں پہ پھونکتی اور آپؐ کے جسم ہاتھوں کو جسم پہ پھیرتی تھی

(15) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت یونس علیہ السلام کی دعا جو انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی، جب بھی کوئی مسلمان اپنی کسی تکلیف میں یہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبول فرمائے گا: لا الہ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظٰلمین۔ (ترمذی)

(16) عن ابی سعید الخدری ان جبرئیل اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمدؐ اشتکیت فقال نعم قال بسم اللہ ارقیک من کل شیئ یوذیک من شر کل نفس او عین حاسد اللہ یشفیک بسم اللہ ارقیک۔ (مسلم)

ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا محمدؐ! کیا آپؐ بیمار ہیں؟ ارشادِ نبیؐ ہوا کہ: ہاں! حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مذکورہ دعا پڑھی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ آپؐ کو شفا عطا فرمائے۔

(17) عن عائشہ قالت کان اذا مرض احد من اہل بیتہ نفث علیہا بالمعوذات (مشکوٰۃ) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اہل بیت نبویؐ میں جب کبھی کوئی بیمار ہوجاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معوذتین پڑھ کر اس پر پھونک دیا کرتے تھے۔

(18) ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسنؓ و حسینؓ کو یہ دعا پڑھ کر پھونکتے تھے: اعیذکما بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ: (مشکوٰۃ)

(19) عن عثمان ابن ابی العاص انہ شکیٰ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعا یجدہ فی جسدہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضع یدک علی الذی یالم من جسدک وقل بسم اللہ ثلثا وقل سبع مرات اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر۔ قال ففعلت فاذھب اللہ ما کان بی۔ (مسلم)

حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے جسم میں درد کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا: اپنا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو اور تین مرتبہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھو اور یہ دعا پڑھو: اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر: حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں میں نے ایسا ہی عمل کیا تو اللہ نے درد کو ختم کر دیا۔

مذکورہ تصریحات سے یہ امر بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات بالخصوص سورۂ فاتحہ اخلاص اور معوذتین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں جسمانی اور روحانی امراض دونوں کے لیے شفاء ہیں اور ان کو پڑھ کر مریض پر دم کرنا یا خود مریض پڑھ کر دم کر لینا یا پانی پر دم کر کے مریض کو پلانا، یا قرآنی آیات کسی برتن پر لکھ کر مریض کو پلانا، یہ تمام امور مستحب اور مفید ہیں۔ اور بے شمار بزرگوں نے ان کی افادیت کا تجربہ بھی کیا ہے۔ علامہ قسطلانی فرماتے ہیں: وقد رخص جماعۃ من السلف فی کتابۃ بعض القرآن وشربہ وجعل ذالک من الشفاء الذی جعل اللہ فیہ: (مواہب اللدنیہ)
علمائے سلف کی ایک جماعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ قرآنِ کریم کا کوئی حصّہ لکھ کر پلایا جائے اسے اس نے اس کو شفاء کا ایک حصّہ سمجھا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھ دی ہے۔

ادویات اور قرآن وسنّت میں وارد دعاؤں کے ساتھ منتر وفسوں اور جھاڑ پھونک اور ایسے اعمال جن کی افادیت اور منفعت کا تجربہ کیا گیا ہو، ان کے ذریعہ بھی علاج ومعالجہ کی شرعی گنجائش موجود ہے اور جن احادیث میں (لا یتطیرون جنت میں وہ لوگ جائیں گے جو فال نہیں دیکھتے) جھاڑ پھونک کی ممانعت آئی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی اس کے اندر کفر وشرک اور غیر اسلامی تصوّرات کی آمیزش پائی جاتی تھی۔

چنانچہ صحابی رسولؐ عوف بن مالک اشجعی کا بیان ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

(20) اعرضوا علیّ رقاکم لاباس بالرقی مالم یکن فیہ شرک (مسلم) تم اپنے منتر اور فسوں اور جھاڑ پھونک کو میرے سامنے پیش کرو۔ اگر اس میں شرک کی آمیزش نہ ہو تو کوئی حرج نہیں

(21) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منتر وفسوں اور جھاڑ پھونک کے عمل سے منع فرمایا تو بعض صحابہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! ہمارے نزدیک ایک عمل ہے جس کو ہم بچھو کا زہر دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اور اس کو آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: میں اس کے اندر کوئی حرج نہیں دیکھ رہا ہوں۔ پھر ارشاد فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے بھائی کو نفع پہنچائے تو اس کو چاہیے کہ ضرور نفع پہنچائے۔

اس باب میں توجہ اور احتیاط کے قابل چیز یہ ہے کہ منتر و فسوں اور جھاڑ پھونک سے متعلق یہ اعتقاد رہے کہ اس میں تاثیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے اور کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جس کے معانی اور مطالب معلوم نہ ہوں مبادا کہ اس کے اندر کسی قسم کا شرک شامل ہو اور سلفِ صالحین کے زمانے میں یہ تمام چیزیں تاجرانہ اور پیشہ ورانہ انداز میں ذائع و شائع نہ تھیں۔ اس سلسلہ میں مجدّدِ جنوب ہند حضرت قطبؒ ویلور کا یہ مکتوب گہری بصیرت عطا کر رہا ہے۔ جو انھوں نے نواب عظیم جاہ بہادر کی اہلیہ نواب منعم النساء بیگم المعروف دلھن بیگم کے نام ارسال فرمایا تھا:

"تعویذ را پس از حمل بیش از ۳ ماہ بلکہ بمجرد آگہی از حمل بر بازوی راست بندند و خالق جل مجدہٗ را بیقین تمام مختار شناسند و بہمہ وجوہ دل را بجانب قاضی الحاجات و مجیب الدعوات دوزند و دعا و دوا را بیش از واسطہ و آلہ ندانند و زیادہ از آرّہ در دست نجّار نہ بینند، وضع صانع حقیقی را ملاحظہ فرمایند انّہ ہو القاضی والمجیب۔"

تعویذ کو حمل کے تین ماہ بعد بلکہ حمل سے آگہی کے ساتھ ہی سیدھے بازو پر باندھ لیں اور کامل یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو مختار سمجھیں اور تمام وجوہ سے دل کو قاضی الحاجات اور مجیب الدعوات کی جانب مائل اور راغب رکھیں اور دعا و دوا کو ایک واسطہ اور ذریعہ خیال کریں اور نجّار کے ہاتھ میں آرہ سے بڑھ کر نہ دیکھیں اور صانع حقیقی کی صنعت و قدرت کو ملاحظہ فرمائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات ہی دعاؤں کو سننے والی اور مرادوں کو بر لانے والی ہے۔

(22) ان اللہ انزل الداء والدواء وجعل لکل داء دواء فتداووا ولا تتداووا بحرام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا نے مرض اور علاج دونوں کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تم بیماریوں کا علاج ضرور کرو لیکن اس چیز کو دوا نہ بناؤ جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ حرام اشیاء کو علاج و معالجہ اور دوا کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ فقیہِ امت حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ان اللہ لم یجعل شفاءکم فیما حرم علیکم خدا نے اس چیز کے اندر شفا اور صحت نہیں رکھی ہے جسے اس نے حرام ٹھہرایا۔ علامہ ابنِ قیم فرماتے ہیں: کسی حرام شئے کو دوا بنانے کے لیے ترغیب دلانا بھی مقصودِ شرع کے خلاف ہے۔ کیونکہ لوگ علاج اور دوا کے خیال سے اس کی طرف مائل ہوتے چلے جائیں گے تو اُن کے لیے لذّت اور شہوت کا دروازہ کھل جائے گا۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب "ردالمحتار" میں مذکور ہے: لا یجوز التداوی بالمحرم: حرام اشیاء سے علاج جائز نہیں۔

اس باب میں بعض فقہا نے اس بنیاد پر جواز کا موقف بھی اختیار کیا ہے کہ بیماری بھی ایک ضرورت

اور اضطرار ہے۔ اگر کوئی لائق وفائق اور قابلِ اعتماد ڈاکٹر کسی حرام چیز کو دوا تجویز کرے تو یہ اضطرار بن جاتا ہے اور جو چیز اضطرار اور ضرورت کے تحت جائز قرار دی جائے، اس کے استعمال کی گنجائش موجود ہے اور اس کے علاوہ تجویز کردہ حرام شئے کے قائم مقام کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس کے استعمال پر مجبور ہو تو حرام شئے کے ذریعہ علاج کروانا وقتیہ طور پر جائز قرار پا سکتا ہے۔ اور جواز کی یہ صورت "رخصت" کی منزل میں ہے جس پر ہمیشہ عمل نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکیمانہ قول (لا تدووا بحرام : حرام اشیاء سے علاج نہ کرو۔) موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکر دے رہا ہے کہ آج کی ادویات مسلمانوں کی ایمانی و روحانی زندگی کے لیے ایک مہلک مرض ہے اور وہ دوا نہیں۔ کیوں کہ آج جن افراد نے دوا سازی کی کمپنیوں پر اپنا قبضہ قائم کر رکھا ہے وہ حرام و حلال کے تصوّر و خیال ہی سے ناآشنا اور نابلد ہیں۔ دوائیں مسلمانوں کی کیسی اہم ضرورت ہے جن کی جانب سے غفلت اور لاپرواہی برتی جارہی ہے: فاعتبروا یا اولی الابصار

احادیث کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض اشخاص نے شراب کو دوا کے خیال سے استعمال کرنے کی اجازت بارگاہِ نبوی ؐ سے طلب کی تو کہا گیا کہ شراب خود ہی ایک بیماری ہے وہ کسی بیماری کا مداوا کیسے ہو سکتی ہے۔

(23) امام ابوداؤد اور امام ترمذی کی روایت کردہ یہ حدیث ملاحظہ کیجیے: انہ لیس بدواء و لکنہ داء : بے شک شراب تو دوا نہیں ہے البتہ وہ خود ہی بیماری ہے۔

بیماروں اور زخمیوں کی خدمت بھی انسانیت اور کارِ ثواب ہے۔ اس باب میں خواتین کا کردار بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مذکور ہے کہ جب حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد میں زخمی ہوئے تو حضرت فاطمہ بتول ؓ نے آپ ؐ کے زخموں کو دھویا۔ پیشانی کا خون تھمتا نہ تھا۔ اس میں چٹائی جلا کر بھری، علی کرم اللہ وجہٗ اس وقت ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے رہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ام سلیم ؓ نے مشکیزہ اٹھائے اور زخمیوں کو پانی لا لا کر پلاتی تھیں۔

اس نظیر کے علاوہ دیگر غزوات اور جنگوں میں خواتین کی زخمیوں کی خدمت اور انھیں مالِ غنیمت سے حصّہ دیے جانے کی مثال سے نرسنگ کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

بیماروں اور مریضوں کی عیادت اور مزاج پُرسی کے لیے جانا ایک دینی اور اخلاقی فریضہ ہے اور خوشنودی رب العالمین اور ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا حق بھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلم مریضوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے اور بیماروں کی عیادت کا خاص خیال اور اہتمام فرماتے تھے۔ ذیل کی حدیثیں ملاحظہ فرمائیں۔

(24) عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطعموا الجائع وعودوا

المریض وفکوا العانی۔ (بخاری)

ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھوکے شخص کو کھانا کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور بے گناہ قیدی کو رہائی دلاؤ۔

موجودہ زمانے میں حکومتوں اور انتظامیہ شعبوں کی جانب سے بے قصور افراد محض شبہ اور امن کے نام پر قید کر لیے جاتے ہیں۔ ان کی رہائی کی سعی و کوشش بھی فکوا العانی کے تحت ثواب عظیم ہے۔

(25) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ تعالیٰ یقول یوم القیامۃ یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یارب کیف اعودک وانت رب العالمین قال اما علمت ان عبدی فلاناً مرض فلم تعدہ اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ۔ (مسلم)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز خدا فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ عرض کرے گا: پروردگار! آپ ساری کائنات کے رب ہیں! بھلا میں کیسے آپ کی عیادت کرتا۔ خدا کہے گا: میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تو اس کی عیادت و مزاج پرسی کے لیے جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ یعنی تو میری رحمت اور میری خوشنودی کا مستحق ٹھہرتا۔

(26) کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم احسن شئی عیادۃ المریض (بخاری)

افضل العیادۃ سرعۃ القیام (بیہقی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیماروں کی عیادت اور اُن سے متعلقہ امور کا اچھی طرح خیال رکھتے تھے اور سب سے اچھی عیادت وہی ہے جس میں مختصر نشست ہو تاکہ مریض کے آرام میں خلل واقع نہ ہو سکے۔

(27) عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم دخل علی الاعرابی یعودہ وکان اذا دخل علی مریض یعودہ قال لاباس طھوران شاء اللّٰہ۔ (بخاری)

ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور آپؐ جس مریض کے پاس بھی جاتے تو یہ دُعا پڑھتے۔ لاباس طھوران شاء اللّٰہ: گھبرانے اور پریشان ہونے کی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو یہ بیماری ختم ہو جائے گی۔

(28) ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ دعا سات مرتبہ پڑھنے سے بیمار ضرور شفایاب ہو جائے گا۔ اِلّا یہ کہ اس کی موت آگئی ہو۔ وہ دعا یہ ہے: اسأل اللّٰہ العظیم

رب العرش العظیم ان یشفیک : میں عظیم خدا سے جو عرش عظیم کا رب ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں شفا بخشے۔ (ابوداؤد)

(۲۹) عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخلتم علی المریض فنفسوا لہ فی اجلہ فان ذلک لا یرد شیئاً ویطیب بنفسہ۔ (ترمذی)

ابوسعید فرماتے ہیں فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی بیمار کے پاس جاؤ تو اس سے بیماری ختم ہونے کی اور عمر دراز ہونے اور دل مسرور ہونے کی باتیں کرو۔ مقدر کی موت کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور عمر کو دراز نہیں کر سکتا، لیکن اس قسم کی باتوں سے بیمار کی طبیعت بہل جاتی ہے اور اُسے مرض ہلکا نظر آنے لگتا ہے۔

(۳۰) حضرت عائشہ بنت سعد فرماتی ہیں کہ میرے والد نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں سخت بیمار پڑا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری مزاج پرسی کے لیے گھر تشریف لائے۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! میں کافی مال دار ہوں اور میری صرف ایک لڑکی ہے۔ کیا میں اپنے مال سے دو تہائی کی وصیت کر جاؤں اور ایک تہائی لڑکی کے لیے چھوڑ جاؤں؟ فرمایا: نہیں! میں نے کہا: آدھے مال کی وصیت کر جاؤں اور آدھا بچی کے لیے چھوڑ جاؤں؟

فرمایا: نہیں! تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر ایک تہائی کی وصیت کر جاؤں؟ ارشاد فرمایا ہاں! ایک تہائی مال کی وصیت کر جاؤ اور ایک تہائی بہت ہے۔

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ اقدس میری پیشانی پر رکھا اور میرے منہ اور پیٹ پر پھیرا۔ اور دعا فرمائی: اے اللہ! سعد کو شفاء عطا فرما اور ان کی ہجرت کو مکمل فرما دے۔ اس واقعہ کے بعد سے آج تک جب کبھی خیال آتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک اور خنکی کو اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔ (الادب المفرد)

(۳۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق المسلم علی المسلم ست، قیل ماھن یا رسول اللہ: قال اذا لقیتہ فسلم علیہ، واذا دعاک فاجبہ واذا استنصحک فانصح لہ واذا عطس فحمد اللہ فشمتہ واذا مرض فعدہ واذا مات فاتبعہ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں: پوچھا گیا: یا رسول اللہ وہ کیا کیا ہیں؟ ارشاد فرمایا:

۱۔ جب تم مسلمان بھائی سے ملو تو اس کو سلام کرو۔

جب وہ تمھیں دعوت دے تو قبول کرو۔
جب وہ تم سے مشورہ طلب کرے تو اس کو صحیح اور نیک مشورہ دو۔
جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمك اللہ کہو۔
جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرو۔
جب وہ انتقال کر جائے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھو اور اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔

(32) عن انس قال کان غلام یهودی یخدم النبی صلی اللہ علیه وسلم فمرض فاتاه النبی صلی اللہ علیه وسلم یعوده فقعد عند راسه فقال له اسلم، فنظر الی ابیه وهو عنده فقال اطع ابا القاسم فاسلم فخرج النبی صلی اللہ علیه وسلم وهو یقول الحمد للہ الذی انقذه من النار۔ (بخاری)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا۔ تو آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ لڑکا اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے پاس ہی موجود تھا کہ باپ کیا کہتا ہے۔ باپ نے لڑکے سے کہا: بیٹا! ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لو۔ چناں چہ لڑکا اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے لڑکے کو جہنم کی آگ سے بچا لیا۔

امراض کی تکلیف، مصیبت، درد و کرب اور بے چینی و اضطراب کو برداشت کرنا اگرچہ کہ انتہائی دشوار مرحلہ ہے لیکن ما اصاب من مصیبته الا باذن اللہ کی حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے آدمی اللہ کے فیصلے سے راضی رہے اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرے تو اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے اور اس کے لیے امراض خیر و رحمت ثابت ہوتے ہیں اور ان کی بدولت وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ مرض کی وجہ سے ان اعمالِ صالحہ کو انجام نہ دے سکے جن کو وہ صحت کے زمانے میں انجام دیا کرتا تھا تو بیماری کے دنوں میں بھی اعمالِ صالحہ کا ثواب اُس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہتا ہے۔ اور مرض کی ہی حالت میں انتقال کر جاتا ہے تو عذابِ قبر کے فتنہ سے مامون و محفوظ اور مرتبۂ شہادت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اور بعض مخصوص بیماریوں پر صبر و ضبط کی وجہ سے جنّت کا مستحق و سزاوار قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ اندھاپن وغیرہ اور اس کی دُعا کو فرشتوں کی دُعا کے مانند قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے مریض کی عیادت کے لیے جائیں تو اس سے بھی اپنے لیے دعا کروانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مذکورہ تمام پہلوؤں کی نشان دہی

ان احادیث سے بخوبی ہو رہی ہے ملاحظہ کیجیے :

(33) یحییٰ بن سعید قال ان رجلا جاءہ الموت فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجلا ھنیأ لہ مات ولم یبتل بمرض فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحک ما یدریك لو ان اللہ ابتلاہ بمرض فکفر عنہ من سیئاتہ۔ (مشکوٰۃ)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں ایک صاحب انتقال کر گئے تو اُن کے متعلق ایک شخص نے کہا۔ بڑے خوش نصیب ہیں کہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے بغیر دنیا سے رخصت ہوگئے یہ سُن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا آپ کو کیا معلوم! اگر وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہوتے تو بیماری ان کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتی۔

(34) عن ابو سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھم ولا حزن ولا اذیٰ ولا غم حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ۔ (بخاری و مسلم)

ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کو مرض، زخم، حزن الم اور معمولی سی تراش و خراش بھی اس کو پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

(35) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مات مریضاً مات شھیدًا اووقی فتنۃ القبر وغذی وریح علیہ برزقہ من الجنّۃ۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مرض کی وجہ سے فوت ہو جائے وہ شہادت کا مرتبہ پاتا ہے یا عذابِ قبر سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے اور اس کو صبح و شام جنّت سے رزق آتا ہے۔

(36) عن جابر قال دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ام السائب فقال مالكِ تزفزفین، قالت الحمّی لا بارك اللہ فیھا فقال لا تسبّی الحمّی فانھا تذھب خطایا بنی اٰدم کما یذھب الکیر خبث الحدید۔ (مسلم)

حضرت جابر کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاتون ام السائب کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے وہ بخار کی شدّت سے کانپ رہی تھیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا حال ہے؟ خاتون نے بخار کے تعلق سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ سُن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخار کو بُرا بھلا نہ کہو۔ یہ مومن کے گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتی ہے جیسے آگ کی بھٹّی لوہے کے زنگ کو صاف کر دیتی ہے۔

(37) عن ابی ھریرۃ قال ذکرت الحمّٰی عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فسبھا رجل فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تسبھا فانھا تنفی الذنوب کما تنفی النار خبث الحدید ۔ (ابن ماجہ)

ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بخار کا ذکر ہونے لگا تو ایک صاحب نے بخار کو گالی دی اس پر آپؐ نے فرمایا بخار کو گالی مت دو ۔ وہ تو آدمی کے گناہوں کو پاک وصاف کر دیتی ہے جس طرح کہ آگ لوہے کی گندگی و خباثت کو دُور کر دیتی ہے ۔

(38) عن انس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا ابتلی المسلم ببلاء فی جسدہ قیل للملک اکتب لہ صالح عملہ الذی کان یعمل ۔ (شرح السنہ)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مسلمان جب جسمانی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو فرشتہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے ان اعمالِ صالحہ کا ثواب لکھ دو جن کو وہ صحت کے زمانے میں انجام دیا کرتا تھا ۔

(39) عن ابو موسیٰ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا مرض العبد او سافر کتب لہ بمثل ما کان یعمل مقیماً وصحیحاً ۔ (بخاری)

حضرت ابو موسیٰ کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ایک مقیم اور صحت مند آدمی جو بھی اچھے اعمال کیا کرتا تھا اگر وہ مرض وسفر کی وجہ سے انجام نہ دے سکا تو سفر اور بیماری کے دنوں میں بھی برابر ان اعمال صالحہ کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں درج کیا جاتا ہے ۔

(40) عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا دخلت علی مریض فمُرہ یدعولک فان دعاءہ کدعاء الملائکۃ ۔ (ابنِ ماجہ)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اس سے اپنے لیے بھی دُعا کی درخواست کرو ۔ کیوں کہ مریض کی دُعا ایسی ہے جیسے فرشتوں کی دُعا یعنی اس کی دعا مستجاب الدعوۃ ہے ۔

(41) عن انس قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول قال سبحانہٗ وتعالیٰ اذا ابتلیت عبدی بحبیبتہ ثم صبر عوّضتہ منھما الجنّۃ یرید عینیہ ۔ (بخاری)

حضرت انسؓ کا کہنا ہے کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سُنا : آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کو اس کی آنکھوں سے بصارت چھین کر آزماتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کو اس کے بدلہ میں جنّت عطا کرتا ہوں ۔

بیماری اور مرض سے شفا وصحت پانے کے لیے ایک مؤثر تدبیر اور مفید طریقہ صدقہ وخیرات بھی ہے ۔

جس کی بدولت آدمی سوء خاتمہ اور بُری موت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری میں صدقہ اور خیرات کا حکم دیا۔ امام طبرانی کی روایت ہے:

(42) داووا مرضاکم بالصدقۃ : اپنے بیماروں کا علاج صدقہ و خیرات کے ذریعہ کرو۔

اور امام ترمذی کی روایت ہے:

(43) ان الصدقۃ لتطفیٔ غضب الرب وتدفع میتۃ السوء. (ترمذی)

صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے اور بُری حالت میں موت آنے نہیں دیتا۔

صدقہ کے ذریعہ سے فقراء و مساکین اور مصیبت زدہ لوگوں کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں اور یہی دعائیں مریض کے لیے صحت و شفاء بلکہ نئی زندگی کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور دعاؤں میں وہ تاثیر اور اثر ہے کہ قضاء و قدر میں بھی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کی گرہ کشائی زبانِ نبوت میں ان الفاظ میں فرمائی ہے:

(44) لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید العمر الا فی بر الوالدین : قضاء و قدر کو کوئی چیز بدل نہیں سکتی لیکن دعا کے ذریعہ تقدیر بھی بدل جا سکتی ہے۔ عمر میں زیادتی نہیں ہو سکتی لیکن ماں باپ کے ساتھ نیکی اور خدمت کے ذریعہ۔

ایک دوسری حدیث میں بھی صلہ رحمی کرنے والے شخص کے لیے رزق کی زیادتی اور اس کی عمر کی درازی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

(45) عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب ان یبسط لہ فی رزقہ وینسأ لہ فی اثرہ فلیصل رحمہ۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت اور برکت دی جائے اور اس کے نشانات قدم میں تاخیر کی جائے تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی (رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور صدقہ و خیرات) کرے۔

ظاہر ہے کہ نشاناتِ قدم میں تاخیر کیے جانے سے عمر کی درازی مراد ہے۔ کیوں کہ جس شخص کی جتنی زیادہ عمر ہو گی اسی قدر زیادہ دن تک اس کے نشاناتِ قدم زمین پر پڑتے رہیں گے اور مرنے کے بعد نشاناتِ قدم بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر قرآنِ کریم کی اس آیتِ طیبہ سے یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے:

اذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون : تقدیر میں ہر شخص کی عمر متعین ہے جس میں ایک لمحہ کی نہ تقدیم ہو سکتی ہے اور نہ تاخیر ہو سکتی ہے۔ اس تعارض کو قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت سے دور کیا

جا سکتا ہے ۔جس میں تقدیر کی تبدیلی کے امکان کا بیان موجود ہے : یمحو اللہ مایشآء ویثبت وعندہ ام الکتاب (الرعد) اللہ تعالیٰ جو چاہے مٹاتا اور ثابت کرتا ہے اور لوح محفوظ اسی کے پاس ہے ۔

ان تصریحات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دعا اور صدقہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو کسی بندے کی خاص عمر میں بھی زیادتی اور اضافہ کر سکتے ہیں ۔اس کا تعلق تقدیر معلق سے ہے جس میں زیادتی یا کمی فرشتوں کے علم کے اعتبار سے ہوتی ہے ۔فرشتے سمجھتے ہیں کہ فلاں نیکی کی وجہ سے بندہ کی عمر میں اضافہ ہو گیا حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے اس کی عمر مشروط تھی کہ اگر بندے نے فلاں نیکی کر لی تو اس کی مقررہ عمر میں اضافہ کر دیا جائے گا ۔اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بھی ہے کہ بندہ وہ نیکی کرے گا یا نہیں؟ لہذا اللہ تعالیٰ کے علم کے لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور فرشتوں کے علم کے لحاظ سے کمی یا زیادتی ہوی ۔

چناں چہ بعض روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں ۔کہ ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس حضرت عزرائیل (ملک الموت) علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوب صورت و نیک سیرت نوجوان وہاں آیا ۔حضرت داود علیہ السلام نے اس کی بڑی تعریف و تحسین کی ۔حضرت ملک الموت نے کہا آپؑ کا ارشاد بجا ہے ۔لیکن اب اسکی عمر پوری ہو چکی ہے ۔اللہ تعالے نے حکم دے دیا ہے کہ سات دن گزرنے کے بعد اس کی روح قبض کر لی جائے ۔حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ خبر سن کر انتہائی رنج و غم ہوا ۔سات دن کے بعد آپؑ نے دیکھا کہ وہی نوجوان آپؑ کے پاس چلا آرہا ہے ۔بہت متعجب ہوئے اور دل میں خیال کیا شاید مجھ کو سننے میں غلطی ہوی ہے ۔ملک الموت نے سات ماہ یا سات سال کہا ہوگا ۔پھر جب ملک الموت سے آپؑ کی ملاقات ہوی تو انھوں نے بتلایا کہ اس جوان کی عمر واقعی ایک ہفتہ تک ہی تھی لیکن اپنی وفات کے دن اس نے فقراء و مساکین پر صدقہ و خیرات کیا ۔فقراء نے اس کے لیے دعا کی ،جس کی برکت سے اللہ تعالے نے اس کی سات دن کی عمر کو سات سال سے بدل دیا ۔ان اللہ یحکم ما یرید وانہ علی ما یشآء قدیر ۔بے شک اللہ تعالے جو ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے اور وہ جو چاہے کر دے ۔ہر شئے پر قدرت والا ہے ۔

صدقہ و خیرات سے مریضوں کے تندرست ہونے کے واقعات بھی کثرت سے موجود ہیں ۔ان میں سے ایک واقعہ یہاں سپرد قلم کیا جاتا ہے ۔

عبداللہ بن مبارک کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ میرے گھٹنے میں ایک زخم ہے ،سات سال سے ہر قسم کا علاج کر رہا ہوں لیکن کسی سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے ۔عبداللہ بن مبارک نے فرمایا : جس جگہ پانی کی قلت ہو وہاں ایک کنواں کھدوا دو ۔اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ تمہارے گھٹنے کا زخم

اچھا ہو جائے گا۔ چناں چہ اس شخص نے حکم کی تعمیل کی اور اس کا زخم اچھا ہو گیا۔

ان واقعات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خلق خدا پر صدقہ و خیرات کے ذریعہ احسان و بھلائی کرنا اور ان کی ضرورتوں و حاجتوں کو پورا کرنا ایک ایسا اقدام ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لیے بلند ہو جاتے ہیں اور یہی دعا امراض سے نجات اور درازیٔ عمر کا سبب بن جاتی ہے۔

علم و تحقیق، تجربہ و مشاہدہ اور میڈیکل کی دنیا کا ایک اہم اور متعدد و مختلف آراء و مواقف کا حامل مسئلہ یہ بھی ہے کہ امراض متعدی ہیں یا نہیں؟ ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف النوع اور کثیر النوع امراض پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک زمین پر زندگی موجود ہے۔ قدیم زمانہ کا ایک وبائی مرض طاعون ہے جس میں لوگ کثرت سے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے تعلق سے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(46) اذا سمعتم بالطاعون فلا تدخلوها واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منها۔ (بخاری)

جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ کسی شہر میں طاعون پھیلا ہوا ہے تو وہاں مت جاؤ اور جہاں تم ہو وہاں اگر طاعون پھیل جائے تو اس شہر کو چھوڑ کر چلے مت جاؤ۔

مذکورہ حدیث سے دو باتیں سامنے آرہی ہیں اور یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہم ہیں ایک بات طاعون زدہ مقام کی روح فرسا، دل شکن اور جان لیوا فضا میں داخل ہو کر اپنی زندگی کو مسائل سے دوچار کر لینا یہ کوئی دانش مندانہ فعل نہیں ہے، قطع نظر اس کے کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جائیں یا نہ ہو جائیں۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں معلوم ہوا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے تو آپؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لے کر واپسی کا فیصلہ فرمایا اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا۔ یہ تو اللہ کی تقدیر سے فرار ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: نعم نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ (بخاری) ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

اس فیصلہ اور گفتگو کے دوران عبد الرحمٰن بن عوف نے مذکورہ حدیث کو بیان کیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کی تائید و تصویب فرمائی۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کرام کو بھی اطمینان ہوا۔ اور

شام میں داخل نہیں ہوئے اور راستہ ہی سے لوٹ گئے۔

دوسری بات طاعون زدہ مقام سے نکل جانے کی ممانعت بھی اپنی جگہ بڑی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔ اگر یہ خروج اور فرار موت کے خوف سے ہو تو یہ غیر ایمانی اقدام اور تقدیر سے فرار ہے اور اگر یہ خروج اور فرار موت کے خوف کے بغیر ہو تو بھی یہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی اقدام ہے کہ دوسرے لوگوں کو اس وبا میں مبتلا چھوڑ کر نکل کھڑے ہو جائیں۔ اور اس صورت حال کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کی دوا دارو اور خدمت و تیمارداری اور ان کی موت واقع ہونے کی صورت میں تجہیز و تکفین جیسے مسائل لاینحل رہ جائیں اور بہت ممکن ہے کہ طاعون سے متاثر اشخاص باہر جانے کی وجہ سے دوسرے علاقہ کے لوگوں کی صحت اور زندگی متاثر ہو سکے۔

اسی لیے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون زدہ مقام میں علاج و معالجہ، صبر و ضبط اور تقدیر الٰہی کے فیصلے سے راضی اور خوش نود رہتے ہوئے وہاں سے فرار نہ اختیار کرے تو ایسے شخص کو شہید کے اجر و ثواب کی خوش خبری سنائی۔ بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

(47) لیس من عبد یقع الطاعون فیمکث فی بلدہ صابرا یعلم انہ لن یصیبہ الا ماکتب اللہ الا کان مثل اجر الشہید۔

جو مسلمان طاعون پھیلنے پر اپنے شہر میں صبر و ضبط کے ساتھ ٹھہرا رہے اور یہ یقین کر لے کہ وہی پیش آئے گا جو اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے تو اسے شہید کے ثواب کے برابر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا۔

اس مسئلہ میں جمہور علماء و فقہاء کی رائے یہ ہے کہ طاعون زدہ مقام سے ضرورت کے تحت باہر نکل سکتے ہیں لیکن موت کے خوف سے فرار نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں یہ بیان کیا ہے۔

اور بعض احادیث سے یہ بھی ثابت ہے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض جذام کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔

(48) واذا کلمتوھم فلیکن بینکم و بینھم قدر رمح۔ (مسند احمد)

جب تم جذامی اشخاص سے بات چیت کرو تمہارے اور ان کے درمیان ایک نیزہ کا فاصلہ برقرار رکھو۔

(49) لا تدیموا النظر الی المجذومین۔ (ابن ماجہ)

جذامی افراد کو مستقل دیکھتے نہ رہو۔

اس حدیث سے یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ مرض متعدی ہے اور اس سے یہ استدلال بھی صحیح ہو گا کہ ہر وہ بیماری جس کے مضر اور مہلک اثرات پھیلنے کا امکان ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے امراض متعدی نہیں ہوتے ۔

(50) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
لا عدویٰ ۔ (بخاری) بیماری کا متعدی ہونا ایک بے معنی بات ہے ۔

مذکورہ احادیث سے مرض کا متعدی ہونا اور غیر متعدی ہونا دونوں ثابت ہو رہا ہے اور میرے خیال میں یہ دونوں باتیں بھی اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست معلوم ہوتی ہیں ۔ اور ان کے درمیان تطبیق اور ہمواری کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ بعض امراض متعدی ہو سکتے ہیں اور بعض امراض متعدی نہیں ہو سکتے اور موجودہ زمانہ کی طبی تحقیقات کی رُو سے بھی یہی موقف صحیح نظر آتا ہے ۔ اور لا عدویٰ (بیماری متعدی نہیں ہے) کی حدیث کو اس بات پر محمول کر لیا جائے کہ شارع علیہ السلام کا مقصد مرض کا بذات خود اثر کرنے کا غیر اسلامی تصوّر اور جھوٹ چھات کا جاہلانہ اعتقاد ختم کرنا ہے ۔

اس باب میں بہترین موقف یہی ہو سکتا ہے کہ طبی نقطۂ نظر سے جن امراض کا متعدی ہونا ثابت ہو رہا ہے تو ان سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا چاہیے اور حدیث میں بھی اس کی تاکید اور ہدایت موجود ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مومن کو یہ عقیدہ مضبوط اور مستحکم رکھنا چاہیے کہ کوئی مرض بھی اللہ کے ارادے اور مشیت کے بغیر ایک دوسرے کو لگ نہیں سکتا ۔ لا عدویٰ (کوئی بیماری بھی اللہ کے حکم کے بغیر دوسرے کو نہیں لگ سکتی) واللہ اعلم بالصواب ۔

مریض کو اپنی بیماری اور زخم وغیرہ کی وجہ سے فرائض و واجبات پر عمل کرنے میں دشواری اور تکلیف کا پیش آنا بھی ایک ناگزیر صورت حال ہے جس کی وجہ سے مریض کے لیے شرعی احکام میں سہولت و رعایت، تخفیف و اجازت اور رخصت کی صورتیں موجود ہیں ۔ چناں چہ مریض پانی کے استعمال سے عاجز ہو، یا اس کے استعمال سے مرض میں زیادتی یا زخم چنگا نہ ہونے یا سردی سے ہلاکت کا اندیشہ اور خوف کھائے تو وضو اور غسل کے بجائے تیمم کا حکم دیا گیا ۔ اور نماز کھڑے ہو کر ادا کرنے میں زحمت و تکلیف ہو تو بیٹھ کر نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور بیٹھ کر ادا کرنے میں دشواری ہو تو لیٹ کر نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور روزے رکھنے سے عاجز ہو تو روزوں کی قضا اور کفارہ کا حکم دیا گیا ۔ اور فریضۂ حج بیت اللہ کو عدم بصارت اور مرض کی وجہ سے ساقط کر دیا گیا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے احکام و مسائل ہیں جن کو فقہائے کرام نے قرآن اور احادیث سے استنباط اور استخراج کیا ہے ۔ مرض کے تعلق سے حاصل ہونے والی سہولتوں اور رخصتوں کا باب وسیع ہے اور یہاں ان کا احاطہ مشکل ہے ۔ اس کے لیے فقہ کی کتابوں کی جانب رجوع کیا جائے ۔ جن میں تفصیل سے سارے احکام بیان کیے گئے ہیں ۔

یہ مقالہ تحریر کرنے کے دوران شدت کے ساتھ یہ خیال سطح ذہن پہ اُبھر رہا تھا کہ اسلام نے امراض کی تشخیص اور ان کے علاج اور دوا کی تفتیش وغیرہ سے متعلق علوم و فنون کو دینی علوم و فنون کا ہم پلّہ اور مساوی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور حدیث ہے:

(51) العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان۔

علم دو ہیں: ایک دین کا علم اور دوسرا بدن کا علم۔

ظاہر ہے کہ دین کا علم مسلمانوں کو روحانی و مذہبی زندگی کے لیے جزِ لاینفک ہے تو بدن کا علم مسلمانوں کی جسمانی صحت و زندگی کے لیے انتہائی ضروری اور لازمی ہے گویا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اس راز کو ماضی میں مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے علم شریعت کے ساتھ ساتھ علم طب کی جانب بھی نہ صرف کامل توجہ مبذول کی بلکہ اس علم و فن کو آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا اور چشم فلک نے بھی یہ حسین و جمیل نظارہ بھی دیکھا کہ مسلمان ساری دُنیا میں علم طب کے امام اور قائد بنے رہے اور ساری دنیا کے بڑے بڑے لوگ علاج کے لیے مسلم اطبا کی جانب رجوع کرتے رہے۔ جیسا کہ آج علاج کے لیے امریکہ اور یورپ جارہے ہیں۔ اور طب میں مسلمانوں کی تحقیقات اور تصنیفات ہر جگہ فن طب کا مرجع اور ماخذ بنے رہیں۔ چناں چہ گیارھویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والا یورپ کا سب سے پہلا میڈیکل کالج (اٹلی) کا نصاب بڑی حد تک ان طبّی کتابوں پر مشتمل تھا جو عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ الزہراوی کی مشہور کتاب "التعریف لمن اعجز عن التالیف" کا سرجری سے متعلق حصہ آکسفورڈ اور دیگر طبّی اداروں میں نصابِ تعلیم کا جز بنا رہا۔ اور تاریخ نے اپنے دامن میں ان لمحات کو بھی جگہ دے دی جن میں مسلمانوں نے علم ادیان اور علم ابدان کے درمیان خوش گوار توازن برقرار نہ رکھا۔

موجودہ زمانہ میں تو جدید طب، میڈیکل اور سرجری وغیرہ کے میدان میں مسلمانوں کی پستی اور بچھڑے پن کو دیکھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظروں سے علم الابدان کی ضرورت اور اہمیت اور افادیت بھی مستور اور اوجھل ہوگئی ہے اور اس کے برعکس یورپ و امریکہ کی قومیں اس میدان میں اس قدر سبقت لے گئی ہیں ان کی حیرت انگیز ترقی کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں کو قیادت اور امامت کا منصب حاصل ہونا ایک امر ممتنع نہ سہی ناممکن ضرور دکھائی دیتا ہے۔

اور علمِ ابدان سے غفلت اور بے رُخی کا ایک عظیم نقصان و خسران یہ بھی سامنے آگیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا زرّیں موقع بھی نکل گیا۔ غیر مسلم مریضوں کا علاج اور ان کی خدمت

اوران کی عبادت ومزاج وغیرہ ایسے اعمال وافعال ہیں جن سے تبلیغ اسلام کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں کیوں کہ یہ نفسیاتی گرہیں جن سے مریض ذہنی اور قلبی طور پر ڈاکٹر سے متاثر اور مانوس ہوجاتے ہیں اوران کے دلوں میں یہ بات رچ اور بس جاتی ہے کہ اسی ڈاکٹر کے ذریعہ خالق نے ہمیں صحت اور زندگی بخشی ۔ اس طرح مریض اور ڈاکٹر کے درمیان عقیدت ومحبت سے بھر پور تعلق پیدا ہوجاتا ہے اور اس انجذاب باطنی اور ارتباط قلبی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر اپنے مریض کو حکمت وموعظت کے ساتھ اسلام کی جانب دعوت دے تو یہ قوی امکان ہے کہ وہ اسلام کی آغوش میں چلا آئے اور بیماری کے زمانہ میں آدمی خدا کی جانب بھی بہت زیادہ متوجہ رہتا ہے اور اس کے اندر اپنے مسیحا (ڈاکٹر) کی بابت قبول کرنے کا جذبہ بھی بالعموم زیادہ رہتا ہے ۔ داعی اور مدعو کے درمیان ایک خوش گوار ربط وتعلق قائم کرنے کے لیے ہسپتال سے زیادہ موثر شئے اور ایک بہترین ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے ۔ اسی لیے زبانِ نبوتؐ نے علم ابدان کو غیر معمولی عظمت ورفعت اور وقعت بخشی تاکہ اللہ کی مخلوق اس زینہ سے علم ادیان کی نعمتوں اور برکتوں سے مستفیض ہوجائے ۔

وما علینا الا البلاغ

صلوٰۃ وسلام بہ حضور خیر الانامؐ

اے شہنشاہِ مدینہؐ الصلوٰۃ والسلام
زینتِ عرش معلیٰ الصلوٰۃ والسلام
دست بدست سب فرشتے پڑھتے ہیں انؐ پر درود
کیوں نہ ہو پھر ورد اپنا الصلوٰۃ والسلام
بت شکن آیا یہ کہہ کر سر کے بل بت گر گئے
جھوم کر کہتا تھا کعبہ الصلوٰۃ والسلام

مومنو پڑھتے نہیں کیوں اپنے آقا پر درود!
ہے فرشتوں کا وظیفہ الصلوٰۃ والسلام
سر جھکا کر باادب عشق رسولؐ اللہ میں
کہہ رہا تھا ہر ستارہ الصلوٰۃ والسلام
میں ہوں سنی جیلی قادری مرنے کے بعد
میرا لاشہ بھی کہے گا الصلوٰۃ والسلام

پیشکش : سید امجد قادری "تاڑپتری"
زمرۂ ثالثہ ۔ دار العلوم لطیفیہ ۔ حضرت مکان ۔ ویلور
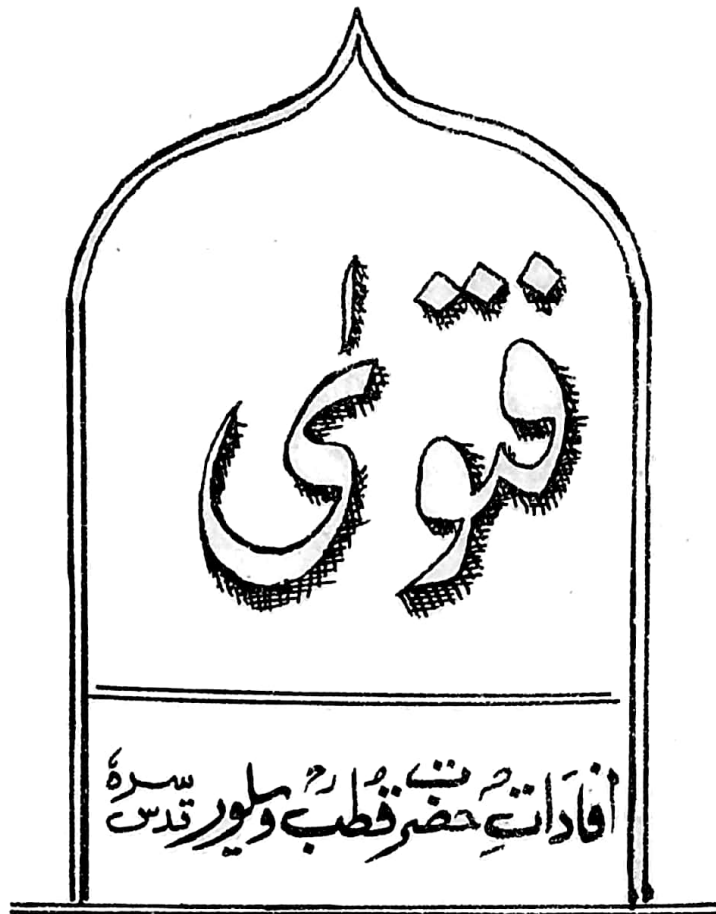
مجددِ جنوبی ہندوستان سلطان المرشدین حضرت العلام سید شاہ عبد اللطیف قادری المعروف حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ نے روحِ انسانی اور بعض فقہی مسائل اور احکام پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ یہ گراں قدر افادات و تبرکات فارسی اور دکھنی زبان میں ہیں۔ احقر نے صرف فارسی متن کا ترجمہ کیا ہے اور مضامین کا لحاظ کرتے ہوئے درج ذیل عناوین تجویز کیا ہے اور دکھنی حصہ کو من وعن باقی رکھا ہے۔

- کل شئی ھالك الا وجهه کی رُو سے روحِ انسانی فانی ہے یا نہیں؟
- حدیث کے مطابق حنفی شخص کا کندھے تک ہاتھ اٹھانے کا حکم۔
- تشہد میں انگلی اٹھانے کا حکم۔
- ایام مخصوص میں صدقہ کا حکم۔

العبد ضعیف ابو النعمان بشیر الحق غفرلہٗ

۱ــ کل شئ ہالک الاوجہہ کی رُو سے روحِ انسانی فانی ہے یا نہیں؟

استفسار رفتہ بود کہ در عقائد فنای آیتے روحِ انسانی می نویسند و در کیمیائے سعادت روح را ابدی گویند۔ حقیقتِ این تضاد چیست؟

محبت اطوار! در حدیثِ شریف است کہ اشیای سبعہ را کہ عرش و کرسی و لوح و قلم و جنّت و دوزخ و ارواح بود فنا نیست۔ و بعضی صور را ضم می کنند و اشیاء ثمانیہ را غیر فانی گویند۔ بعضی علماء در حدیثِ مذکور تاویل می کنند و بفنای آنی اشیاء قایل اند، تا مخالف آیتہ: کل شئی ہالک الاوجہہ نباشد و بعض علماء مانند امام حجۃ الاسلام و شیخ محی الدین عربی و صدر الدین قونوی قدس اسرارہم تاویل نمی کنند و اشیاءِ مذکورہ را ابدی گویند بدلیل: ونفخ فی الصّور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الاما شاء اللہ۔ مثنٰی می خوانند و صعق بمعنی بے ہوشی و فنا ہر دو آمدہ است۔ سید محمد لاہیجی قدس سرہٗ در شرح گلشنِ راز از ین اختلاف نشانی دادہ اند۔

"آپ نے دریافت کیا تھا کہ عقائد کی کتابوں میں انسان کی روح کو فانی لکھا ہے اور امام حجۃ الاسلام غزالی نے "کیمیائے سعادت" میں روح کو ابدی اور غیر فانی کہا ہے اس تضاد اور اختلاف کی کیا وجہ ہے؟"

"محبت اطوار!"

"حدیثِ نبویؐ میں سات چیزوں کو (یعنی عرش[1]، کرسی[2]، لوح[3]، قلم[4]، جنت[5]، دوزخ[6] اور ارواح[7]) کو ابدی اور غیر فانی کہا گیا ہے اور بعض حضرات علماء صُور کو بھی ابدی کہتے ہیں۔ اس طرح ابدی اور غیر فانی اشیاء کل آٹھ ہوئیں۔

لیکن کل شئی ہالک الاوجہہ کی آیتِ کریمہ کے پیشِ نظر بعض علماء مذکورہ حدیث میں تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیتِ کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ جلّہ جلالہٗ کی ذات کے سوا ہر شئے کے لیے فنا و ہلاکت ہے اس لیے ضروری اور لازمی ہے کہ مذکورہ اشیاء کے لیے بھی فنا کو تسلیم کیا جائے اگرچہ کہ وہ فنا صرف ایک لمحہ کے لیے ہو، تاکہ آیت اور حدیث میں کوئی اختلاف اور تضاد نہ رہے۔

اور بعض علمائے کرام مثلاً امام غزالی، شیخ محی الدین ابنِ عربی اور شیخ صدر الدین قونوی قدس اللہ

اسرارہم مذکورہ حدیث میں کوئی تاویل نہیں کرتے اور ظاہر حدیث کے مطابق سات چیزوں یعنی (عرش، کرسی، لوح، قلم، جنت، دوزخ، ارواح) کو ابدی کہتے ہیں۔ اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الا ما شاء اللہ: [صُور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے، جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں۔ مگر جسے اللہ چاہے]

اس سے معلوم ہوتا ہے صُور پھونکنے کے وقت تمام چیزیں بے ہوش یا فنا ہو جائیں گی۔ مگر جس کو اللہ چاہے، وہ فنا یا بے ہوش نہیں ہوں گے۔

لہٰذا وہ سات چیزیں جن کا ذکر حدیث میں ہے وہ اسی الا ما شاء اللہ کے استثناء میں داخل ہیں اور پہلی آیت: کل شیئ ھالک الا وجھہ، دوسری آیت ونفخ فی الصور کی وجہ سے عام مخصوص منہ البعض ہوگی تو نہ آیت آیت میں تعارض ہوگا اور نہ آیت اور حدیث میں تعارض ہوگا۔ سید محمد لاہجی قدس سرہٗ نے "شرحِ گلشنِ راز" میں اس اختلاف کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ••

۲۔ حدیث کے مطابق حنفی شخص کا کندھے تک ہاتھ اٹھانے کا حکم

پوچھے تھے کہ حنفی بموجب حدیث ابو حمید ساعدی کے ہاتھ کھندوں تک اٹھاتا ہے۔ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ حنفی مجتہد ہے تو حدیث پر عمل کر سکتا ہے۔ مقلد ہے تو اس پر تقلید اپنے اماموں کی واجب ہے۔ کذا فی کتب الاصول۔ اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی مکتوب دو لبست و ہشتاد و ششم میں جلدِ اول کے فرماتے ہیں:

"مقلد را نمی رسد کہ خلاف رائے مجتہد از کتاب وسنّت اخذ احکام کند و برآں عامل باشد"۔ انتہی۔

(مقلد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے امام کی رائے اور قول کے خلاف قرآن وحدیث سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے۔) اور مولوی اسماعیل دہلوی فصلِ اول میں مقدمۂ ایضاح کے مسئلہ استنباط احکام میں لکھتے ہیں "شرطِ ثانی آن کہ قایس از مجتہدین باشد نہ از مقلدین"۔ انتہی۔ (دوسری شرط یہ کہ قیاس کرنے والا مجتہدین میں سے ہوگا۔ مقلدین میں سے نہیں۔)

اس صورت میں حنفی مقلد کو بجز تقلیدِ مجتہدانِ حنفیہؒ کے کچھ چارہ نہیں۔ شیخ الہند شاہ عبدالحق محدّث دہلوی حدیثِ ابو حمید ساعدی کی شرح میں جو (رأیتہ اذا کبر جعل یدیہ حذاء منکبیہ) آیا ہے۔ یہ لکھتے ہیں:

دیدم آں حضرت ﷺ راچوں تکبیر احرام می گفت، می گردانید ہر دو دستِ خود را مقابل ہر دو دوشِ خود۔ وایں مذہب شافعی است۔ ونزد ما مقابل نرمۂ ہر دو گوش دارند۔ وایں نیز در احادیث آمدہ۔ و در بعضے روایا تا بالا ہائے گوش نیز آمدہ وامام ابوحنیفہ متوسط را اختیار کردہ وامام شافعی در تطبیق ایں روایات گفتند کہ کف ہائے دست مقابلِ دوش بود۔ و تر انگشتان برابر گوش وسر انگشتان دیگر تا بالا ہائے گوش و تواند کہ در اوقات مختلفہ ہمہ وقوع آمدہ باشد۔ واللہ اعلم۔ انتہیٰ۔

میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب تکبیر تحریمہ کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں کندھوں کے مقابل اٹھاتے تھے۔ یہ شافعی مذہب ہے۔

اور ہمارے نزدیک دونوں کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھانا ہے۔ یہ طریقہ بھی احادیث میں آیا ہوا ہے اور بعض روایات میں کانوں کے اوپر تک بھی آیا ہوا ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے متوسط کو اختیار کیا اور امام شافعیؒ ان روایات کی تطبیق میں فرماتے ہیں کہ ہاتھ کی ہتھیلیاں کندھے کے مقابل ہیں۔ اور انگوٹھا کان کے برابر اور دوسری انگلیوں کا مقدم اور اوپری حصہ کانوں کے اوپر اور ہو سکتا ہے کہ یہ ساری صورتیں مختلف اوقات میں وقوع پذیر ہوئی ہوں۔ واللہ اعلم۔

۳۔ تشہد میں انگلی اٹھانے کا حکم

پوچھے تھے کہ تشہد میں انگشت اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ انگشت اٹھانے کے مقدمہ میں اٹھاوئیس[۲۸] حدیثِ صحیح آئے ہیں۔ مگر صحیح بخاری میں اس کا کچھ مذکور نہیں۔ امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبین اور مالکیہؒ اور شافعیہؒ اور حنبلیہ سب کے سب اٹھانے پر گئے ہیں۔ اور علمائے ماوراء النہرین نہیں اٹھانے پر گئے۔

غرض یہ مسئلہ میں اختلاف ہے اور فتویٰ بھی مختلف۔ تفصیل اس مسئلہ کی میں "فصل الخطاب" میں بڑی تفصیل سے لکھا ہوں۔ یہ کتاب عنقریب چھپنے والی ہے۔ پس آدمی انگلی اٹھانے، نہیں اٹھانے میں مختار ہے جھگڑا کس لیے؟

حق جل مجدہٗ مسلمانوں کو توفیق دیوے تا مذہبِ حقہ پر سنت وجماعت کے قائم رہیں۔ اور افراط وتفریط سے اور دنیائے دنیۂ فانیہ کے فریب سے بچیں: زیادہ۔ حق یا شما باد۔ مرقوم: دوازدہم محرم روز یکشنبہ ۱۲۸۶ھ ہجری

۴ ۔ ایام مخصوص میں صدقہ کا حکم

از مسئلہ اطعام ایام مقررے مانند سوم و دہم و چہلم و سالانہ استفسار رفتہ بود ؟

مخدوما !

صدقہ برائے اموات جائز و نافع بود لبشرطیکہ مقید بزمان و مکان نباشد ۔ و در حدیث شریف وارد است الصدقۃ تطفی الخطیئات کما الماء النار پیدا است کہ در حدیث شریف صدقہ مقید بزمان و مکان نیست و مطلق وارد گردیدہ و حمل مطلق بر مطلق از قواعد مقررۂ ارباب اصول است ۔

وایضاً ثابت نگردیدہ کہ در قرن اول و دوم صدقہ در ایام مقیدہ مخصوصہ دادہ باشند از یں جا ہویدا شد کہ صدقہ عبادتے است کہ بعلت تخصیص و تقیید غیر مشروع زمانی باشد یا مکانی یا بوجھی دیگر بدعت می گردد کما تقرر فی الاصول ۔

آرے ! ایں قدر ہست کہ صدقہ بنام اموات تا روز ہفتم مستحب بود و ایں تقیید زمانی مشروع باشد کما فی شرح المشکوٰۃ الدھلوی فی باب زیارت القبور ۔ و بعضے علماء سالانہ را نیز مستحب دانستہ اند بسند حدیث بانی قبور الشہداء علی رأس کل حول چناں چہ صاحب مائل المسائل چیزے از تفصیل آں نگاشتہ اند ۔

آپ نے مقررہ اور مخصوص ایام مثلاً سوم ، دہم ، چہلم اور کھانا کھلانے کے مسئلہ سے متعلق استفسار کیا تھا ۔

مخدوم من

اموات کے لیے صدقہ کرنا جائز ہے اور نافع ہوتا ہے ۔ بشرطیکہ زمان اور مکان کی قید سے مقید نہ ہو اور حدیث شریف میں آیا ہوا صدقہ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے ۔ جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حدیث شریف میں صدقہ کا حکم زمان و مکان کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں ہے ۔ بلکہ مطلق وارد ہے اور مطلق کو مطلق پر محمول کرنا ہے ارباب اصول کے مقررہ قواعد میں سے ایک ہے ۔ نیز اس بات کا ثبوت بھی فراہم نہ ہو سکا کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں مخصوص اور مقررہ ایام کے اندر صدقہ دئے ہوں ۔ اس سے یہ حقیقت

واضح ہوجاتی ہے کہ صدقہ ایک عبادت ہے جو زمان ومکان یا کسی دوسری وجہ کے غیر مشروع[1] تخصیص اور قید کی وجہ سے بدعت ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ اصول میں مقرر ہے۔

ہاں! اس قدر ضرور ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد سات دن تک صدقہ دینا مستحب ہے اور یہ قیدِ زمانی اور تخصیص شریعتِ مطہرہ کے حکم کے مطابق اور موافق ہوگی۔ جیسا کہ مشکوٰۃ کی شرح میں بابِ زیارۃ القبور میں مرقوم ہے۔

اور بعض علمائے کرام نے یاتی قبور الشہداء علی راس کل حول (شہداء کی روح قبور کی جانب ہر سال کے شروع میں آتی ہے) کہ حدیث سے سالانہ (فاتحہ) کو بھی مستحب قرار دیا ہے۔ مائۃ المسائل کے مصنف نے اس کی تفصیل کسی قدر بیان کی ہے۔ ●●

[مکتوبات کا بقیہ ص۱۱۶ کا]

سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں آپ کو باقی رکھے۔ اور آپ کے امور ومعاملات میں خیر وبرکت عطا فرمائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے علامۃ اعراضہ تعالیٰ عن العبد اشتغالہ بمالا یعنیہ: کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ بندے (یعنی) اور بے کار میں مشغول رہے گا۔

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است ۔ گر شکر خوردن بود جان کندن است

اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ اور ما سوا سے ہمیں اعراض فرمائے اور اپنی بارگاہ میں اقبال سے سرفراز فرمائے۔

واللہ علی کل شیئ قدیر۔ اللہ کی ذات ہر شئے پر قدرت رکھنے والی ہے۔ ●●

---

[1] غیر مشروع = وہ امر جو موافق شرع شریف نہ ہو۔ مترجم

جواہر السلوک

مجددِ جنوب حضرت العلامہ شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری المعروف بہ قطبِ ویلور

اس مضمون میں تصوف کے بہت نازک مسائل پر بحث کی گئی ہے جس کا تعلق وجود سے ہے اور یہ مسئلہ اہم ترین ہے اس زمانے میں سائنس بھی صوفیاء کے اقوال کی تائید کرتی نظر آتی ہے یہ نہایت پیچیدہ مسائل ہیں علمائے ظاہر ان مسائل ہی کی وجہ سے صوفیاء کے منکر ہو گئے۔ اگر ان مسائل کی تشریح و توضیح کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ کیوں کہ ان سے بہت سے دوسرے مسائل بھی مربوط ہیں۔ حضرت قطبِ ویلور نے دوسرے صوفیا کے بیانات کا صرف خلاصہ پیش کیا ہے

ترجمہ: مولانا مولوی افضل العلماء ابوالمکارم سید شاہ مصطفےٰ الحسینی بخاری قادری لطیفی، سابق استاذِ دار العلوم لطیفیہ، ویلور
(کڈپہ، اے پی)

فائدہ:۱۵

صوفیاء علیہم الرضوان کے درمیان توحیدِ وجودی کے تصوّر کی کیفیت پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ حق جلّ مجدہ اپنے علم قدیم سے تمام حقائقِ کلیہ و جزئیہ کو جانتا ہے۔ کسی بھی شئے کا علم اس شئے کے وجودِ علمی کو مستلزم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تمام حقائق وجودِ علمی ازلی میں موجود ہیں۔ چوں کہ اشیاء کے وجودِ علمی میں جس کو باطن وجود سے موسوم کرتے ہیں تقدم و تاخر زمانی نہیں ہے۔ برخلاف اشیاء کے وجودِ خارجی کے جس میں تقدم و تاخر زمانی واضح اور بدیہی ہے یہ ضروری ہے کہ وجودِ علمی وجودِ خارجی سے مغائر اور اس پر مقدم ہو۔ جیسے اصل کا تقدم فرع پر اور ذی ظل کا تقدم سایہ پر۔ اگر وجودِ علمی وجودِ خارجی کا غیر نہ ہو اور ذوات اعیانِ علمیہ علم باری تعالیٰ سے خارج ہو جائیں تو معاذ اللہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا جہل لازم آئے گا۔ اسی مقام سے متعلق صاحبِ فصوص الحکم فصِّ ادریسیؑ میں فرماتے ہیں:

"اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بو تک نہیں سونگھی ہے"۔ یعنی اعیانِ ثابتہ جو صورِ علمیہ ہیں اپنے عدم اصلی پر ہیں وجودِ خارجی کی بو ان تک نہیں پہنچی ہے۔ جیسا کہ یہ بات ہماری معلومات اور اقوال سے واضح ہے۔

اس کلام کے معنی یہ ہیں کہ اعیانِ ثابتہ اضافۂ وجود کے وقت اپنے بطون یعنی وجودِ علمی میں کسی طرح سے ظاہر نہیں ہوں گے کیونکہ اُن کا چھپا رہنا اور پوشیدہ رہنا ذاتی ہے۔ جو وصف کسی چیز کا ذاتی ہوتا ہے وہ اس چیز سے ہرگز جدا نہیں ہوتا۔ غرض جو کچھ بھی ان اعیان سے ظاہر ہوتے ہیں وہ ان اعیان کے احکام اور آثار ہیں۔ جو وجودِ حق سے وجودِ حق میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ذواتِ اعیان خود ظاہر نہیں ہوتے۔

یہ جاننا چاہیے کہ اعیان جو حقائقِ موجودات ہیں ان کے دو اعتبار ہیں۔ پہلا یہ کہ وجودِ حق ان اعیان کا آئینہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اعیانِ حق وجودِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس کے اسماء و صفات کے آئینے ہیں۔

اگر تم وجودِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو آئینہ اعتبار کریں تو اس میں اعیان کے احکام و آثار ظاہر ہیں، نہ کہ بالذات اعیان۔ کیوں کہ وجود کی بو نہیں سونگھے ہیں نہ وجود من حیث ہو۔ جیسا کہ آئینہ کی شان ہوتی ہے اگر تم اعیان کو آئینہ اعتبار کریں تو ان میں وجود کے اسماء و صفات اور شیون و تجلیات ان امور کے موافق وجودِ متعین ظاہر ہیں۔ وجودِ من حیث ہو اور اعیان خود ظاہر نہیں ہیں۔ جیسا کہ تم نے آئینہ کی شان سے سمجھا۔ لہٰذا وجودِ حقیقی اور اعیانِ ثابتہ ہر دو ازل میں اور ابد میں مرتبہ بطون میں ہیں۔ پس باعتبارِ اول احکام و آثارِ اعیانِ ظاہر ہیں اور باعتبارِ ثانی جو ظاہر ہے وہ وجودِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ

کے اسماء و صفات اور شیون و تجلیات، یا ان امور کے موافق وجود متعین ہیں ۔ ؎

ترجمہ

ممکن ز تنگنائے عدم ناکشیدہ رخت	ممکن عدم کی تنگنائی سے ظاہر نہیں ہوا
واجب بجلوہ گاہِ عیان نانہادہ گام	واجب نے جلوہ گاہ عیاں میں قدم نہیں رکھا
در حیرتم کہ این ہمہ نقش غریب چیست	میں حیران ہوں کہ یہ تمام عجیب نقش کیا ہیں
برلوحِ صورت آمدہ مشہود خاص و عام	جو لوح پر صورت نمودار ہو کر ہر خاص عام کو نظر آ رہے ہیں ۔
ہر یک نہفتہ لیک ز مرآتِ آن دِگر	ہر ایک چھپا ہوا ہے لیکن اس دوسرے کے آئینے میں
بردا شتہ ز جلوۂ احکام خویش گام	اپنے احکام کے جلوہ سے ظاہر ہوا ہے
بادہ نہان و جام نہان آمدہ پدید	شراب پوشیدہ جام بھی پوشیدہ ہے لیکن جام میں
در جام عکس بادہ و در بادہ عکس جام	شراب کا عکس اور شراب میں جام کا عکس دکھائی دے رہا ہے

اس طرح نقد النصوص اور شرحِ رباعیاتِ جامی میں مرقوم ہے ۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ جس پر شہودِ خلق غالب ہے وہ خلق کو ظاہر اور حق کو باطن دیکھتا ہے ۔ اس کی نظر میں حق خلق کے لیے آئینہ کے مانند ہے اور خلق اس آئینہ میں ظاہر ہونے والی صورت کی طرح ہے ۔ بلاشبہ حق آئینہ میں پوشیدہ ہے ۔ جیسا کہ آئینہ کی شان ہے ۔ اور خلق ظاہر ہے جیسا کہ آئینہ میں صورتِ مرتسمہ کی شان ہے ۔ ایسے شخص کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ذوا ذوالعقل کہتے ہیں ۔

؎ شراب سے مراد وجودِ مطلق ہے ۔
جام سے مراد اعیانِ علمیہ ہیں ۔ شراب اور جام سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جب شراب کو جام میں ڈالتے ہیں تو شراب جام کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے یا جام شراب کے رنگ میں نمایاں ہوتا ہے ۔ ؎

ہمہ جام ہست نیست گوئی مئے	تمام سراسر جام ہے شراب نہیں ہے
یا مدام است نیست گوئی جام	یا پھر سراسر شراب ہے جام نہیں ہے

پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ احوال، احکام اور نسبت ظہور تمام اعیان کی طرف منسوب ہیں اس اشارہ صاحبِ فرق قبل الجمع کی حالت کی طرف ہے ۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ تمام کے تمام وجود کی طرف منسوب ہیں ۔ اس میں صاحبِ جمع کی حالت کی طرف اشارہ ہے ۔

جس شخص پر شہودِ حق کا غلبہ ہوگا وہ حق تعالیٰ و تقدس کو ظاہر دیکھے گا اور خلق کو باطن یعنی چھپا ہوا پس خلق میں ظہورِ حق کی وجہ سے اس کی نظر میں خلق حق کے لیے آئینہ کے مانند ہوگی جیسے صورت کا ظہور آئینہ میں اور خلق کا چھپ جانا حق میں آئینہ کا چھپ جانا صورت میں ایسے شخص کو ذوالعین کہتے ہیں۔

جو شخص خلق کو حق میں دیکھے اور حق کو خلق میں دیکھے ایک کے دیکھنے سے دوسرے کے شہود سے محجوب نہ ہو بلکہ وجود واحد کو بعینہٖ ایک اعتبار سے خلق دیکھے اور ایک اعتبار سے حق، وحدت کا شہود کثرت کے نمود کے لیے مزاحم نہ بنے اور کثرت کا نمود وحدت کے شہود کے لیے مانع نہ ہو اور کثرت کا نمود وحدت کے شہود کے لیے مانع نہ ہو ایسے شخص کو ذوالعقل و ذوالعین کہتے ہیں۔[ء]

اعیان ہمہ آئینہ و حق جلوہ گر است	(ترجمہ) تمام آئینہ ہیں ان میں حق جلوہ گر ہے
یا نورِ حق آئینہ و اعیان صورت است	یا نورِ حق آئینہ ہے اور اعیان صورت ہے
در چشم محقق کہ حدید البصر است	تیز نگاہ والے محقق کی نظر میں
ہر ایک زدو این آئینہ آن دگر است	دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے آئینہ ہے

ء

ذوالعینی اگر نورِ حق مشہود است	اگر تو نورِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے تو ذوالعینی ہے
ذوالعقلی اگر شہودِ حق مفقود است	اگر تو شہودِ حق کو نہیں پاتا ہے تو ذوالعقلی ہے
ذوالعینی و ذوالعقلی شہود حق و خلق	اگر تجھے شہود حق کے ساتھ شہود خلق اور شہود خلق کے
با یک دیگر اگر ترا موجود است	ساتھ شہود حق حاصل ہے تو تو ذوالعینی و ذوالعقلی ہے۔

اسی طرح شرح رباعیات جامی میں مرقوم :

معلوم ہونا چاہیے کہ سالکانِ راہِ خدا کے سامنے چند شکوک و شبہات رونما ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ حلول و اتحاد اور زندقہ یعنی بے دینی کے بھنور میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان شبہات کو ختم کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ عبد متجلی لہ یعنی حق متجلی کے ظہور کو آئینہ میں دکھائی دینے والی صورت کی طرح متصور کیا جائے یعنی جس طرح کہ صورت اور شکل آئینہ میں حلول نہیں کرتی اور نہ اس کے ساتھ متحد ہوتی ہے بلکہ صورت اور آئینہ کے درمیان میں ایک مخصوص نسبت ہوتی ہے جو آئینہ میں صورت کے ظہور کا سبب بنتی ہے اسی طرح حق متجلی عبد متجلی لہ کے درمیان ایک مجہول الکیفیت مخصوص نسبت ہے جو حلول اور اتحاد کے توہم کے بغیر بندہ پر حق کے انکشاف کا سبب ہوتی ہے۔

(لہ حاشیہ اگلے صفحہ ۵۰ پر دیکھئے)

غرض آئینہ اور صورت کے درمیان کسی صورت نہ اتحاد ممکن ہے اور نہ حلول۔ اتحاد دو چیزوں کے ایک ہو جانے کو کہتے ہیں اور حلول ایک چیز کا دوسری چیز میں مل جانے کا نام ہے۔ جس طرح آئینہ اور صورت کے درمیان ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا ہے اس طرح حق متجلی اور عبدِ متجلی لہٗ کے درمیان ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا ہے۔

گو ید آں کس دریں مقام فضول (ترجمہ) حلول اور تجلی کو سمجھا نہیں
کہ تجلّی نداند او ز حلول وہ کرتا ہے بکواس اور کچھ نہیں!

دوسرا یہ کہ حلول واقع کے مطابق اور اتحاد توہم کے مطابق سوائے دو ذات یعنی دو موجود ہیں (جو ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ چاہیں وہ دونوں جوہر ہوں یا عرض ہوں یا ایک جوہر ہو اور دوسرا عرض ہو) پیدا نہیں ہو سکتا۔ چشم شہود میں سارے وجود میں سوائے ایک موجود کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ذاتِ نفس، ذات ہیں صفت اطلاق پر ہو اور صورت میں تمام موجوداتِ مقیدہ میں ظاہر ہوئی ہو وہ باعتبار ظہور، عین مقیدات ہوگی اور مقیدات مرتبہ بطون میں اس کا عین ہوں گے۔ جس وقت اس کو مقیدات کے ساتھ قیاس کریں گے عینِ مقیدات ہوگی۔ لہٰذا حلول ممکن ہوگا نہ اتحاد ممکن ہوگا۔ لیکن مقیدات کے درمیان نفس الامر میں حلول اور حسبِ توہم اتحاد ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ مطلقاً دو چیزوں کے درمیان اتحاد محال ہے۔ اس بات کو علوم عقلیہ میں بیان کر آئے ہیں:

فَالْعَيْنُ وَاحِدٌ وَالْحُكْمُ مُخْتَلِفٌ (ترجمہ) حقیقت ایک ہے اور حکم مختلف ہیں
وَذَاكَ سِرٌّ لِأَهْلِ الْعِلْمِ يَنْكَشِفُ یہ ایسا بھید جو صرف اہلِ علم پر کھلتا ہے

یعنی ذاتِ حق جو وجودِ مطلق ہے ایک ہے۔ مگر اعیان ثابتہ احکام جو اس میں نمایاں ہوئے ہیں وہ مختلف ہیں کیوں کہ اعیان، احکام و آثار کے مطابق جدا گانہ ہیں۔ پس تعدد اور تکثر جو نظر آتا ہے احکام کے اختلاف کی وجہ سے ہے نہ کہ تعدّد ذوات کی وجہ سے اور یہ معنی کہ عین ایک ہے اور تعدّد متوہم ہے۔ جو مختلف احکام سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ ذوات متعدد ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو صرف وہبی علم والوں پر منکشف ہوتا ہے۔ کسبی علم والوں پر نہیں ہوتا۔ صاحبِ کشف کہ جس پر حقیقت امر جیسا کہ ہے منکشف ہوئی ہے۔ وہ کثرت کو ذات میں نہیں بلکہ احکام میں دیکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ذات ایک ہے۔ تعدّد و تکثرِ احکام سے متغیّر اور متکثر نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تغیرِ احکامِ ذات

(حاشیہ صفحہ 49 کا:-)

[1] عبدِ متجلی لہٗ وہ بندہ جس پر حق کی تجلی ہوئی ہے [2] حق متجلی: تجلی کرنے والی ذاتِ حق۔

میں اثر انداز نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کو متغیر کرتا ہے۔ کیوں کہ ذات کا ایسا کمال ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے تغیر اور تاثیر کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اور وہ وجوبِ وجود اور قدم وحدت کا کمال ہے پس وحدتِ ذات احکام مختلفہ سے نہ متغیر ہوتی ہے نہ متکثر ہوتی ہے۔ بلکہ متکثر نظر آتی ہے۔ جیسا کہ نورُ جو درحقیقت لال، ہرے، پیلے رنگوں سے رنگ آلود تو نہیں ہوتا ہے مگر رنگ آلود ضرور نظر آتا ہے۔ ؎

لَا لَوْنَ لِلنُّوْرِ لٰكِنْ فِي الزُّجَاجِ بَدَا	(ترجمہ) نور کے لیے تو کوئی نہیں ہوتا ہے مگر اس کی شعاعیں
شُعَاعُهٗ فَتَرٰى فِيْهِ الْاَلْوَانُ	چھنی سے نمودار ہوتی ہیں جس میں تم مختلف رنگ دیکھتے ہو۔

یعنی نورُ کو جو عین واحد ہے۔ اس مثال میں کوئی رنگ نہیں ہے لیکن چھنی کے لیے رنگ ضرور ہے۔ جب چھنی پر نورُ کا پرتو پڑتا ہے اور اس کا رنگ ظاہر ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نورُ رنگین ہو گیا۔ ہے۔ یقیناً نورُ تو درحقیقت رنگ کو قبول کرنے والا نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو اگر تم سمجھ نہیں پا رہے ہو تو میری آنکھ میں آؤ اور دیکھو یہ حقیقت تمہیں نظر آئے گی۔ ؎

آفتابی در ہزاران آبگینہ تافتہ	(ترجمہ) ایک ہی سورج ہزاروں آبگینوں میں چمکتا ہے
پس بہ رنگِ ہر یکی تالِ عیان انداختہ	ہر ایک کے رنگ کے مطابق وہ روشنی بکھیرتا ہے
جملہ یک نورُ است امّا رنگہا مختلف	وہ سب تو ایک ہی نورُ ہے لیکن رنگ مختلف ہیں۔
اختلافی درمیانِ این و آن انداختہ	جس کی وجہ سے اِس میں اور اُس میں اختلاف پڑا ہوا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ہستی حق اور آفتاب وجود مطلق کا پرتو اعیانِ ثابتہ کے آبگینوں پر چمکا۔ ان کے رنگوں کے مطابق رنگ برنگی ہو کر متعدد نظر آیا۔ اس کا یہ تعدّد حسبِ نمائش ہے۔ پھر بھی وہ درحقیقت اپنی صَرافت[1] وحدت پر ہے۔ یہ اختلاف تو صرف اعیان کے احکام کے تغیّر سے وہم انگیز ہے۔ ؎

اعیان ہمہ شیشہائے گوناگون بود	(ترجمہ) تمام اعیان گوناگون شیشوں کی طرح تھے
کافتاد بر آن پرتوِ خورشید وجود	ان پر خورشید وجود کا پرتو پڑا تو
ہر شیشہ کہ بود سرخ یا زرد کبود	ہر ایک شیشہ جو لال، پیلا اور نیلا تھا
خورشید در آن ہم بہمان رنگ نمود	ان میں سورج بھی اسی رنگ سے نمودار ہوا

اسی طرح مولانا جامی علیہ الرحمۃ کی "اشعۃ اللمعات شرحِ لمعات" میں مرقوم ہے۔

امام ربانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ مکتوبات کی تیسری جلد کے ۸۹ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] صرافت: خالص؛ خالصیت

وحدت الوجود والوں کے "ہمہ اوست" [1] کے معنی کے اطلاقات سے فقیر جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام جزئیات [عہ] متفرق حادث ایک ذات تعالیٰ و تقدس کا ظہور ہیں۔ اس رنگ میں کہ جس میں صورت زید ہے مثلاً وہ مختلف آئینوں میں اپنا نمود ظاہر کیا ہے۔ یہاں تو صرف ایک ذات زید کا ظہور ہوا ہے اس میں کوئی جزئیت اور اتحاد اور کون سا حلول و تلوّن ہے۔ زید کی ذات ان تمام صورتوں کے باوجود اپنی خالص اصلی حالت پر ہے۔ ان صورتوں نے اس میں نہ کچھ بڑھایا ہے اور نہ کچھ گھٹایا ہے۔ جہاں زید کی ذات ہے وہاں ان صورتوں کا نام و نشان تک نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے اس کے جزئیت، اتحاد، حلول اور سریان کی نسبت کر سکیں۔ یہی وہ مقام جہاں الآن کما کان [2] کا راز ڈھونڈنا چاہیے۔ کیوں کہ جس مرتبہ میں وہ ذات والا ہے (جیسا کہ عالم کے ظہور سے پہلے وہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ظہور کے بعد بھی کسی طرح کی گنجائش نہ ہوگی۔) اب بھی وہ اسی طرح جیسا کہ وہ تھی۔

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب "تحفۂ اثناء عشریہ" میں اتحاد کے شبہ کے رد میں فرماتے ہیں۔ مطلقاً اتحاد باطل ہے اس کا بطلان واضح بدیہیات میں سے ہے۔ اس اتحاد سے صوفیا کا مقصد اتحادِ حقیقی نہیں بلکہ دو معنی میں سے کوئی ایک معنی مراد ہے۔

پہلا معنیٰ یہ ہے کہ نورِ حق کے ظہور و تجلّی کے وقت بندے کی خودی کا سست و کم زور پڑجانا اور مٹ جانا۔ جس طرح نورِ آفتاب کے ظہور کے وقت چراغ کی روشنی کی حالت ہوتی ہے۔ چناں چہ نور کی تجلّی کے وقت بندے پر ایسی حالت کا پیدا ہونا قرآن اور اقوال عترت سے اچھی طرح ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا

یعنی پس جب ان کے رب نے تجلّی ڈالی پہاڑ پر تو اس نے پاش پاش کر ڈالا اس کو اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

نیز ارشادِ ربّانی ہے

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا سُبْحَانَ

یعنی پس جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو ندا دی گئی کہ برکت دیا گیا ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو

---

[1] ہمہ اوست : تمام وہی ہے۔
[2] الآن کما کان : اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔ [عہ] وہ فنا ہونے والے متفرق جزئیات مراد کائنات۔

اللہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔
اس کے آس پاس ہے اور پاک ہے اللہ جو سارے جہان کا رب ہے ۔

اور اقوالِ عترت طاہرہ سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ارشاد (بروایت کلینی (جو پہلے گذر چکی ہے ۔) آپ ابو البصیر سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ان المؤمنین یرونہ فی الدنیا قبل یوم القیامۃ اَلَسْتَ تراہ فی وقتک ھذا

یعنی بے شک مومنین اس کو یعنی اللہ کو قیامت سے پہلے دیکھیں گے کیا تو نہیں دیکھتا ہے اس کو اپنے اس وقت سے پہلے ۔ ھذا سے بھی یہ بات اچھی طرح ظاہر ہے

اس معنی کو شیخ ابنِ فارض مصری علیہ الرحمۃ نے اپنے "قصیدۂ تائیہ" میں واضح فرمایا ہے آپ کہتے ہیں :- ؎

وَجَاءَ حَدِیْثٌ فِی اِتِّحَادِیْ ثَابِتٌ
رِوَایَتُہٗ فِی النَّقْلِ غَیْرُ ضَعِیْفَۃٍ یُشِیْرُ
بِحُبِّ الْعَبْدِ بَعْدَ تَقَرُّبٍ اِلَیْہِ بِنَفْلٍ
اَوْ اَدَاءِ فَرِیْضَۃٍ وَمَوْضِعُ تَشْبِیْہٍ
الْاِشَارَۃِ وَاضِحٌ بِکُنْتُ لَہٗ سَمْعًا
کَنُوْرِ الظَّہِیْرَۃِ

اور حدیث آئی میرے اتحاد میں ثابت ہے ۔ جس کی نقل ضعیف اور کم زور نہیں ہے جو قربِ نوافل یا قربِ فرائض کے بعد بندہ کے ساتھ محبت کرنے کی طرف مشیر ہے ۔ اور تشبیہ کا یہ مقام کہ میں اس کا کان ہو جاتا ہوں ۔ دوپہر کی دھوپ کی طرح صاف اور واضح ہے ۔

اور وہ صحیح حدیثِ قدسی جس کی طرف پہلے شعر میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے :

لَایَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ
حَتّٰی اَحْبَبْتُہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ
کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ
بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ
وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا

یعنی بسا اوقات میرا بندہ میری طرف نزدیکی ڈھونڈتا ہے ۔ نوافل کی ادائیگی سے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں ۔ جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے ۔ اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ۔ اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ بندہ خود کو حق کا آئینہ جانے اور اپنے کو اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر

سمجھے اس طرح کہ بعض ظاہر کے احکام مظہر کی طرف اور بعض مظہر کے احکام ظاہر کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ وصف جو پاکیٔ ذاتِ ظاہر کے لیے نامناسب ہو چاہیے کہ وہ مظہر سے ترقی نہ کرے اور جو وصف کہ مرتبہ ظاہر کا عنوان ہو وہ مظہر میں نزول نہ کرے۔ یہ حقیقت اور معنی بھی قرآنِ مجید اور اقوالِ عترت سے اچھی طرح ظاہر و باہر ہے۔ چناں چہ ارشادِ باریٔ تعالیٰ ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ — جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نیز ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہ — بے شک وہ لوگ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں بے شک وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز حضرت امیر رضی اللہ عنہٗ کا خطبۃ الافتخار اور خطبۃ البیان کتبِ امامیہ میں مشہور و معروف ہے۔

حاصلِ کلام!

صوفیاء کرام ہوں یا علمائے کرام دونوں جماعتیں اہلِ سُنّت وجماعت سے ہیں حلول و اتحاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ نیز حلول و اتحاد کے قائلین کی تکفیر کرتے ہیں۔ ••

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا

جواہر الحقائق

تصنیفِ لطیف

ماہر علوم دین و طریقت واقفِ رموز معرفت و حقیقت سلطان المشائخین مرشد الانام منبع الکشف و الہام، حافظ قرآن مجید مجذوب حضرت علامہ شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری نقوی المعروف بہ قطبِ ویلور۔ قدس سرہٗ ۔ (المتوفی اسنہ ہجری ۱۲۸۹)

نور الدقائق

ترجمہ

جواہر الحقائق

ترجمہ و تشریح:

ڈاکٹر حکیم مولوی سید افسر باشاہ قاسمی صبغۃ اللّٰہی شفاء ڈسپنسری گرم تالاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ

حمد تیری اے خدائے لم یزل ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
نام تیرا میرے دل کی ہے دوا ذکر تیرا روح کی میرے شفا

جب زباں پر محمدﷺ کا نام آگیا دوستو! زندگی کا پیام آگیا
آپؐ کی مدح انساں کیا کر سکے! عرش سے جب درود و سلام آگیا

ہر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیئے جو ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے اور ہزاروں بار درود و سلام اس دُرِّ یارِ گہر بار خلاصۂ کائنات فخرِ موجوداتؐ، محسنِ اعظمؐ، فخرِ آدمؐ، سرورِ عالمؐ نورِ مجسمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم پر جن کے طفیل و بدولت اسلام کا بول بالا ہوا اور کفر و شرک ضلالت و فسق کا منہ کالا ہوا۔

الحمد للہ! کتاب "جواہر الحقائق" کے اس زیرِ نظر ترجمہ کی چوتھی قسط کو پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ حضراتِ اہلِ علم واہلِ قلم نے اسے بنظرِ استحسان دیکھا اور سراہا ہے۔ اس سے جہاں ہمیں خوشی محسوس ہو رہی ہے وہیں اگلی قسط کے پیش کرنے کی ہمت بھی بندھی ہے۔

اس ترجمہ سے متعلق عرض ہے کہ اس کے اندر اتنی رعایت اور کوشش تو ضرور کی ہے کہ ترجمہ لفظی ہو اور بامحاورہ ہو۔ لیکن پھر بھی جہاں بات کے سمجھنے میں دشواری محسوس ہو اور بات کھل کر پوری طرح واضح نہ ہو وہاں قوسین کے اندر خفیف سا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ اور یہ مترجم کی طرف سے مزید وضاحت اور تشریح سمجھیں۔

ترجمہ کے اندر جہاں مترجم کی خامی اور غلطی محسوس ہو' وہاں عفو و درگزر سے کام نہ لیں۔ بلکہ یہ بڑی احسان مندی ہوگی کہ مترجم کو اس سے آگاہ کر دیں۔ تاکہ پھر کسی وقت اس کا تدارک و تلافی ہو سکے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

صاحبِ کتاب "جواھر الحقائق" قدس سرہٗ نے اپنی کتاب میں اکثر جگہ حواشی کا اضافہ فرمایا ہے اور ہم نے بھی جہاں ضرورت سمجھی اس حاشیہ کا حاصلِ ترجمہ یا خلاصہ پیش کر کے اختتام پر "منہ" لکھ کر یہ بتا دیا ہے کہ یہ بڑھوتری اور اضافت بھی

درحقیقت حضرت مصنفؒ ہی کی طرف سے ہے۔ اور جہاں اپنی طرف سے حاشیہ ہوگا وہاں آخر میں "مترجم" لکھ دیا گیا ہے۔

اس ترجمہ کا نام "نوادرالدقائق" ترجمہ "جواھرالحقائق" رکھا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اصل کی برکت سے نقل کو بھی شرفِ قبول سے نوازے اور فقیر مترجم عفی اللہ عنہ کو خلوص و للّٰہیت اور عافیت کے ساتھ ساتھ علم مزید اور عمل کی توفیق نصیب کرے۔ آمین! بجاہِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین o

کتابِ "جواھرالحقائق" کے ترجمہ کی یہ الحمدللہ چوتھی قسط ہے جو درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے۔ گو اصل کتاب میں تو عنوانات ہیں نہیں۔ تاہم ہم نے آسانی کی خاطر اس کے اندر مطلب کے لحاظ سے عنوان قائم کردئے ہیں جسے قارئین حضرات نے بھی دلچسپی اور نگاہِ تحسین سے دیکھا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک

کتبہٗ حکیم سید افسر باشاہ قاسمی صبغۃ اللّٰہی

عناوین

۱۔ بزرگوں کی صحبت اور اُن سے محبّت

جو شخص (صُوفیاء) کی اس جماعت سے محبّت رکھے گا، وہ ان کے خاص مُقربین اور مُصاحبین میں شُمار ہوگا۔ اس گُروہ سے محبت رکھنے کی (خود حدیث سے) یہ خوش خبری کہ "انسان کا انجام کار اسی کے ساتھ ہوتا ہے، جس سے اسے محبت تھی۔ (اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّہ) کافی ہے۔

بزرگوں کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور اُن سے محبت رکھنے والوں کے متعلق یہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خود) بس ہے "ھُمْ قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ وَلَا یَخِیْبُ اَنِیْسُھُمْ" یہ وہ جماعت ہے جس کی صحبت میں بیٹھنے والا اور اس سے محبت کرنے والا نہ تو محروم ہوگا اور نہ مایوس۔ (واقعی) ان کی صحبت (اکسیر کی طرح) بڑی تاثیر رکھتی ہے۔

باز، پرندہ انسان کی صحبت کے اثر سے شکار کرنا سیکھتا ہے اور طوطی (انسانی تعلیم کی وجہ سے) بولنے لگتی ہے۔ گھوڑا انسان کی کوشش و محنت سے جانوروں کی عادات سے گزر کر انسانی عادت کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ وہ جانور کہ ابھی جُفتی (جماع) نہ کیا ہو یہ نر و مادہ جانوروں کی صحبت میں چند دن رہا تو یہ بھی جُفتی کرنے لگتا ہے۔ اور وہ مُردار جو نمک کے ڈھیر میں گر گیا تو کچھ دن بعد وہ بھی نمک بن جاتا ہے اور اس مُردار چیز کا (شرعی) حکم بھی وہی ہے جو نمک کا ہوتا ہے۔ (یعنے وہ بھی پاک اور قابلِ استعمال ہوتا ہے۔)

جب ایک معمولی انسان کی صحبت سے حیوان متاثر ہوتا ہے اور حیوان سے دوسرے حیوانات اثر قبول کر لیتے ہیں اور نمک کی صحبت کی وجہ سے مُردار کی خاصیت بھی بدل جاتی ہے۔ (تو اے نادان انسان! سوچ!) ان بزرگوں کی صحبت تجھے کیا نہیں کرے گی؟ تو مُردہ ہے تو زندہ کردے گی، دیو اور شیطان ہے تو فرشتہ بنا دے گی، تانبا اور لوہا ہے تو خالص سُونا بنا دے گی۔ تو اگر دوزخ کے سب سے نچلے حصّے میں ساتویں طبقے میں پہنچ چکا ہے تو تجھے وہاں سے نکال کر جنّت کے سب سے اونچے مقام اور مرتبہ پہ پہنچا دے گی۔

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ (جس دل میں سچّی تڑپ ہو اور وہ) صحیح طالب ہو تو اسے شیخِ کامل کی ایک روزہ صحبت ہی وہ مقام اور مرتبہ پہ پہنچا دے گی جو چالیس پچاس سال کی ریاضتوں اور مجاہدوں سے بھی نہ ہو سکے گا۔ (اب خود ہی سوچو) کہ جب صوفیوں کی صحبت میں یہ تاثیر ہے تو بزرگانِ خیر القرون صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی صحبت، خاص کر خیر البشرؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت کا کیا عالم ہوگا؟ ع

"قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" — میرے باغ سے میرے اس بہار کا اندازہ لگاؤ۔

اس میدان میں عقل بے بس ہے اور اندازہ سے باہر ہے۔ ؎

اے عقل کی طرف جانے والے اور عقل سے حل کرنے والے دیکھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم (حقائق کے) درمیان کس طرح جلوہ افروز ہیں۔ یہ دنیا میں (حقائق) سورج کی طرح روشن ہیں اور تُو ستاروں کو ٹٹول رہا ہے۔

۲ صوفیاء کی زبان سے بحالتِ سکر کلماتِ کفر نکلنا

واضح ہو کہ بعض صوفیاء کی زبان سے غلبۂ حال اور سکر کے عالم میں کچھ ایسے ناز و نیاز کے الفاظ نکل جاتے ہیں جو ظاہر بینوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔ جیسے "میں ہی خدا ہوں" (أنا الحق) اور "میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے اس لیے میری عبادت کیا کرو" (لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اَنَاْ فَاعْبُدُوْنِی) اور "پاکی ہے میری، کتنا بلند ہے میرا مرتبہ اور میری شان" (سُبحانی ما اعظم شانی) اور "میرے اس لباس اور جبہ میں اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے"۔ (مطلب یہ کہ میرے اس جبے میں خدا ہے۔) (وَلَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ سِوَی اللهِ) اور "میں وہی ہوں اور وہ میری ذات ہے" (اَنَا هُوَ وَهُوَ اَنَا) وغیرہ اس جیسے الفاظ کا زبان سے نکالنا۔

اور اسی طرح بعض ایسی حرکات اور کام کرنا جو شریعت کے ظاہری احکام کے خلاف ہوں جیسے داڑھی کو چونے سے سفید بنا لینا، کپڑے پھاڑ لینا، بیسوں کو پانی میں بہا دینا اور اپنے نفس کو خطرات میں ڈال دینا وغیرہ یہ اور اس جیسی حرکات کو مشائخ کی شطحیات اور ہفوات کہتے ہیں۔ (یعنے شوخی، مخالفِ شرع کام، بیہودہ گوئی، اور لغزشِ مشائخ نام دیتے ہیں۔) و نیز انھیں مشکوک اور موہوم (خیالی) بھی نام دیتے ہیں۔

(ان مشائخ سے) اس قسم کے الفاظ اور ان کی یہ حرکات جو واقع ہو رہی ہیں (یہ دراصل) اُن کے سکر اور غلبۂ حال کا ظرف خوب پُر ہو کر جب لبالب بھر جاتا ہے تو (مجبوراً کبھی چھلک بھی جاتا ہے۔ آخر یہ ہم) ان کے ضبط و اختیار کے فقدان (اور کمی کا نتیجہ) ہے۔ اور (گویا یہ ان کے ضبط و تحمل اور قوتِ برداشت اور اختیار سے باہر ہے)۔

(غرض یہاں ابھی جو کیفیتیں اور حالات پیش کی گئی ہیں یہ صوفیوں کے ایک گروہ کے بعض حالات اور وجدانی کیفیات کا تذکرہ تھا جس میں شریعت اور احکامِ شریعت سے انہیں دور کا بھی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا اور وہ اپنے غلبۂ حال میں جو جی میں آیا کہتے چلے گئے تھے۔) اب اس گروہ کی ایک دوسری قسم بھی ہے (اور انہوں نے اس باب میں) کچھ خاص خاص آداب و اصطلاحات اور مستحسنات وغیرہ وضع کی ہیں، جیسے خانقاہیں بنوانا، خرقہ (گدڑی) پہنانا، ذکر کی کیفیات و حالات میں خاص قسم کی بیٹھک بتلانا اور خلوت نشینیاں کروانا، اور مجلسِ سماع منعقد کروانا وغیرہ اس جیسی دوسری کیفیتیں بھی اس میں شامل ہیں

۳ مشائخ کا حقِّ اجتہاد

ان حضرات کو اس مقام پر حقِّ اجتہاد و استنباط حاصل ہے جس طرح کہ فقہی علماء کو حاصل ہے۔ مگر علماء کی اس قسم میں جو خالص علمی باب سے متعلق ہے یہاں اجتہاد کی صحت (اور عدمِ صحت) پر اور اس کی شرائط پر کلام ہوگا اور سنت و بدعت کی تحقیق پر بحث چھڑے گی اور وہاں (چوں کہ یہ بات نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف حالی کیفیتیں ہوتی ہیں، جن کا تعلق خالص احوال سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس بحث میں) اس کا دخل نہ ہوگا۔

اس معاملہ میں شیخ و فقیہ دونوں برابر ہیں۔ پھر یہ دونوں بھی قرآن وحدیث سے صحتِ دلیل میں کوشاں و جویاں ہیں مگر پہلی قسم تو غلبۂ احوال سے منسلک ہے :

۴۔ لغزشِ مشائخ کے تین فرقے

جن بزرگوں سے غلبۂ حال میں خلافِ شرع نازونیاز کی حرکات ہوتی ہیں یہ تین قسم کے ہوتے ہیں :

۵۔ پہلا فرقہ

پہلا فرقہ نرا فقیہ اور خاص ظاہر بین (خشک مزاج) عالم ہے جو اہلِ تصوف کو نگاہِ رد و انکار سے دیکھے گا اور انھیں نہیں مانے گا۔ اس لیے اس فرقہ کا نام متقشّفۂ فقہاء (خشک مزاج زاہد فقیہ) ہے۔ پھر اس فرقہ کے اندر بھی دو گروہ ہیں :۔

(۱) ایک گروہ تو واقعہ کے مطابق انکار کرے گا اور ظاہر و باطن میں ان پر بے سُود طعنے دے گا اور پھبتیاں کسے گا اور الزامات عاید کرے گا۔ جہالت و نادانی اور دیوانگی سے منسوب کرے گا۔ ایسی حرکت کا منشاء عدمِ مُناسبت اور سُلوک سے بے تعلقی ہے، جو طبعی جمُود و خمُوش اور باطنی خرابی کی وجہ ہے۔ (یہ وہ گروہ ہے) جس میں برکات سے محرومی اور سوءِ خاتمہ کا خوف ہے۔ حجۃ الاسلام (حضرت) امام (غزالی) قدس سرہٗ (اپنی کتاب) "احیاء العُلوم" کے دوسرے باب میں "کتاب العلم" سے بعض اکابر عارفینؒ سے یہ نقل فرماتے ہیں کہ " جس شخص کو اس علم (تصوف و عرفان) سے کوئی حصّہ نہیں ملا تو مجھے خوف ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر نہ ہوگا" اور اس حصّہ کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ (اس پر عمل نہ سہی کم از کم دل سے تو) اس کی تصدیق کرے اور اس کی اہلیت کو مانے"۔ اور جسے اس علم سے کوئی نسبت و تعلق اور حصّہ نہ ہو تو مجھے اس کے بُرے انجام کا خوف ہے"۔ اور دل سے اس کی تصدیق کرنا اور اس کے اہل کو تسلیم کرنا یہی اس کا سب سے کم تر حصہ ہے"۔ (یعنے جس نے اس کی تصدیق کی اور اہل کو تسلیم کیا' اس نے گویا اس علم کا کچھ حصہ پالیا۔ اگرچہ کم ہی کیوں نہ ہو۔)

(۲) اور دوسرا گروہ تو ظاہر میں عوام کو ڈرانے کی خاطر رد و انکار کے جو اسباب تھے انھیں روکے گا اور اس معاملہ میں وہ پہلے گروہ کا شریک و سہیم بھی ہوگا اور بظاہر مُنکر تو ہوگا لیکن باطن میں انکار نہیں کرے گا۔ (اس لحاظ سے وہ) دل کی زبان سے مُوافقت و مُطابقت نہیں کرے گا۔ (بلکہ مُنافقت برتے گا) یہ دونوں گروہ اپنی دُوری اور فاصلے کے اعتبار سے مشائخ کے نزدیک افراط و تفریط (حد سے زیادہ بڑھ جانے اور حد سے زیادہ گھٹ جانے) کی راہ پر چلنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ دوسرا فرقہ

اور یہ دوسرا فرقہ مشائخ کے اقوال و افعال پر کمالِ عقیدتمندی اور اطاعت و فرمانبرداری تو اختیار کرے گا مگر شریعت کی پاس داری اور لحاظ نہیں رکھے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں جاہل صوفیوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے بھی ۲ دو گروہ ہیں :۔

(۱) ایک گروہ تو ان کی سب باتوں اور کاموں کو گو کہ وہ شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، برحق جانے گا بلکہ شریعت تو اُن کے پاس گویا اُن کی اپنی خود ساختہ چیز ہے۔

(۲) اور دوسرا گروہ خود کو (اس کے خلاف ظاہر کرے گا) اور خلافِ شرع کسی کام کے ان سے ممکن الوقوع ہونے اور صادر ہونے کو بھی بظاہر تسلیم نہیں کرے گا (بلکہ اس میں) تکلّف (و تصنّع) سے کام لے گا اور حالاتِ حاضرہ (اور ضرورتِ ظاہرہ) کے پیشِ نظر اور بعض مصالح (حِکَم) کے مدِّنظر فقہ اور شریعت پر کمالِ اطاعت و فرماں برداری کا محض زبانی اظہار تو کرے گا، لیکن ان کا زاویۂ نگاہ یہ دلالت کرے گا کہ اُن کے پاس عُلماء کے اقوال اور فقہی روایات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور یہ دونوں گروہ کا شمار مشائخ کے نزدیک غُلو کرنے والوں میں سے ہوتا ہے۔ (یعنے یہ لوگ حد سے زیادہ بڑھ جانے اور تجاوز کرنے والوں میں سے ہیں۔)

(غرض ان دونوں فرقوں میں سے) پہلا فرقہ (خشک مزاج زاہد فقیہ) اپنے رُوکھے پن، کُند ذہنی اور حماقت میں آگے نکل گیا ہے اور دوسرا فرقہ جہالت اور گُمراہی میں بڑھ گیا ہے۔ اس میں پہلا فرقہ علم و عرفان سے خالی ہے اور دوسرا ایمان سے تہی دست ہے (یعنے بے ایمان سے ہاتھ دھو یا ہوا اور خالی ہے۔) اور پہلا فرقہ مقامِ معرفت (اور عرفان و حقیقت) سے بے بہرہ ہے اور دوسرا فرقہ دائرۂ اسلام سے (خارج اور) نکلا ہوا ہے۔ جبکہ یہ پہلا فرقہ ظاہر شریعت پہ اور اس کے ظاہری احکام پہ عمل پیرا ہے اور یہ دوسرا (شرعی احکام کی بجا آوری میں) معذور ہے۔ غرض یہ دونوں فرقے تفریط و افراط میں پڑے ہوئے ہیں۔

۷- تیسرا فرقہ

(اب رہا) تیسرا فرقہ، یہ صراطِ مستقیم پہ یعنے درمیانی اور سلامتی کی راہ پہ گامزن ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے اَسْلِمْ تَسْلَمْ اسلام لاؤ اور سلامتی پاؤ۔ اور سلامتی کے یہ معنی ہیں کہ ارادہ اور مقصد بھی ٹھیک ہو، نیّت سچّی ہو، نسبت بھی ٹھیک اور دُرست ہو اور یہ صحیحُ الحال بھی ہو (اور صحیح الفکر بھی) مگر جب غلبۂ حال اور وُجدانی کیفیت کی وجہ سے (اگر اپنے آپے سے باہر ہو گیا ہو) اس کا مضبوط قدم ڈگمگانے لگ گیا ہو، اور اس سلامتی اور درمیانی راہ سے قدم پھسل گیا ہو اور ضبط و تحمل، اختیار و کنٹرول کا باگ ڈور ہاتھ سے اس طرح نکل گیا ہو کہ احکام کی شکل و صورت اور اس کی شرعی قباحت بھی معتبر نگاہوں سے اوجھل ہو اور نگاہ صرف ظاہر پہ ہو اور روحِ عمل (جو در حقیقت) حضورِ (قلب) اور خلوصِ (دل) ہے (یہ البتہ برائے نام) اور مختصر ہو گی۔

چناں چہ (دیکھو) قہر و غضب کی صورتیں اور راحت و خوشی کی حالتیں مقام و مرتبہ کے موافق ایک عقل مند دانا آدمی کو (بیگانہ بنا دیتی ہیں اور اس کے دل و دماغ پہ) ایک ہیجان بپا کر دیتی ہیں اور وہ (ان حالتوں میں) بے اختیار ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے اس غصّہ کی حالت میں اس کا اختیاری حصہ جو مبداء فعل ہے

باقی ہے (یعنے جو غصہ شروع کرنے کا مقام ہے وہ اس کا اختیاری حصہ ہے۔ اور وہ اس حالت میں بھی باقی ہے) لیکن (یہاں بات ظاہر عمل اور روحِ عمل پر نہیں چل رہی ہے، بلکہ) بات تو صرف قدم کے ڈگمگا جانے اور پھسلنے پر اور اس کے ثابت قدم رہنے پر نیز اس کے غالب یا مغلوب ہونے پر چل رہی ہے۔ لہذا ایسی صورتوں میں جب کہ غلبۂ حال اور وُجدانی کیفیات میں کوئی کام (خلافِ شرع) واقع ہو جائے تو اُسے تقویٰ و طہارت کی دلیل سے جانچیں گے۔ نیز اس کے اتباعِ سُنّت اور اس پر سختی سے مُداومت اور کمالِ علم وعمل اور صاحبِ حال کی دین داری اور دیانت بھی معلوم کریں گے کہ کہیں معصیت (وگناہ) کی راہ پر گام زن تو نہیں ہے؟ اور شریعت کی خلاف ورزی کا ارادہ تو نہیں؟؟ اور طبعی میلان اور نفسانی خواہشات اور نری جہالت کی وجہ نفس پرستی کا یہ داعیہ (اس کے دل میں) پیدا تو نہیں ہوگیا۔؟؟ (اگر نہیں اور یقیناً نہیں) بلکہ یہ نیک نیّتی اور پاک ارادے کے ساتھ منسلک ہے تو پھر اس کے غصّے کی حالت میں اور اسباب و ذرائع کے نہ ہونے کی صورت میں اور اعتبار کے کھو جانے پر (اس سے جو کچھ بھی لغزش سرزد ہوگی وہ محض) غلبۂ شوق و محبت پر محمول ہوگی۔ اور یہ سب کچھ بھی صحیح احوال اور نیک ارادے سمجھے جائیں گے۔

(اور یہ حقیقت ہے کہ) حالی اور وُجدانی کیفیت والا دیوانے کا حکم رکھتا ہے (اور دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔) اور وہ مرفُوعُ القلم ہوتا ہے۔ (یعنی مکلّفاتِ شرعیہ جیسے نماز روزہ وغیرہ احکامات سے وہ آزاد ہوجاتا ہے۔)

۸۔ شیخ مغلوب الحال کی اقتداء ٹھیک نہیں ہے

مگر (یاد رکھو کہ) یہ قول وفعل جو غلبۂ حال (کا نتیجہ ہوتے ہیں) اور وجدانی کیفیت میں انسان اس میں آپے سے باہر ہوجاتا ہے یہ نہ تو صحیح (اور درست) ہیں اور نہ شرعی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ ہیں (لہذا ان لوگوں کی) اتباع اور اقتداء کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔

یہاں لفظِ "تسلیم" کا خلاصہ یہ نکلا کہ (کسی شیخ پر) انکار و اعتراض (کی صورت میں) جلدی نہ کرے۔ (اور اسی طرح) اس کی تقلید و مُتابعت کو بھی جائز نہ سمجھے۔ خود ان مشائخین کو اور اُن کے مریدین کو اس قسم کے (وجدانی) اُمور (ومعاملات) میں اقتداء و اتباع کرنے سے دُور رکھا گیا ہے۔ (اصل میں) اتباع اور اقتداء تو شریعت کے احکام اور طریقت کے قواعد میں ہونی چاہیئے، جس کی بُنیاد علم پر ہوتی ہے۔ نہ کہ جُزئیات پر جو ذوقی اور وُجدانی ہوتے ہیں۔ اور جس کی اساس و بُنیاد حالی ہوتی ہے۔ ایسا ہی (کتاب) "مَرَجُ البَحرین" میں موجود ہے۔

۹۔ حضرت علیؓ سے صحو اور تمام عالم کی سیر

(یہاں یہ بات بھی جان لو) "مقدمۂ شرح فصوص" کی آٹھویں فصل میں (حضرت) قیصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ہم نے یہ جو کہا تھا کہ عالم کا وجود انسانی شکل وصورت کی حقیقت پر مُنحصر ہے۔ (سو اس دعوٰی کی دلیل میں حضرت) امیر للمومنین، ولی اللہ فی الارضین، قطب الموحدین

علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا قول (پیشِ خدمت ہے کہ انھوں نے ایک دن عین خُطبہ کی حالت میں) جب کہ وہ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے (تو اس وقت اُن پہ ایک حالی اور وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور اسی حال میں ان کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے کہ" میں بِسم اللہ کی باء کا نقطہ ہوں اور میں اللہ کا پہلو (بازو اور ہاتھ) ہوں (یعنی اللہ کے اتنے قریب ہوں کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جس طرح انسان کا بازو اور ہاتھ اس سے جُدا اور الگ نہیں ہیں، اسی طرح میں بھی ذاتِ حق سے کوئی الگ چیز نہیں ہوں۔) اور ایسا ہاتھ ہوں جس کے ذریعہ تم کثرت سے اس کی عبادت اور معرفت حاصل کرتے ہو۔ میں ہی "قلم" ہوں اور میں ہی "لوحِ محفوظ" بھی ہوں، اور میرے ہی اندر عرشِ الٰہی بھی ہے اور کرسی بھی۔ اور میں خود ہی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کی مکین گاہ بھی ہوں۔ (گویا میرے ہی اندر یہ سب کچھ سمائے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ بھی میری ہی ذات ہے جو ساری کائنات کی آماجگاہ ہے اور بقولِ شاعر: ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے ۔۔۔ میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے)

یہاں تک کہ دورانِ خطبہ جب اُن سے یہ (سُکر کی) کیفیت ہٹ گئی اور وہ صحو (ہوش) میں آگئے اور اُن سے مقامِ وحدت کی تجلی کے پردے اُٹھ گئے اور وہ (اُلوہیت سے) بشریت کی طرف لوٹ گئے اور اس عالم میں آگئے اور اللہ نے ان پر اپنی تجلی ظاہر فرمائی (اور وہ مقامِ وحدت سے) کثرت کے حکم میں آگئے تو (اب وہ خود ہی اپنی اس حالت و کیفیت اور ان باتوں پر جو سُکر کی حالت میں بے اختیار اُن کی زبان سے نکل گئے ہیں پشیمان و پریشان ہو کر بہلک سے) معذرت چاہنا شروع کر دیا اور اپنی بندگی اور عبودیت اور ضُعف و مجبوری کا اقرار کر لیا۔ (اور یہ سب کچھ بھی محض) اسمائے الٰہیہ کے احکام (و ضوابط) کے تحت پیش آیا تھا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ کی سیر تمام موجودات میں ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایک کامل (و مکمل) انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بھی تمام موجوداتِ (جہاں) میں سیر کرے۔" انتہیٰ:

صاحبِ "نفحات" نے بعض اکابر (شیوخ) سے یہ بات نقل کی ہے کہ (ایک بزرگ نے سُکر کی حالت میں) کسی شخص کو رخصت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ" تم جہاں کہیں بھی ہو۔ میں تمہارے ہی ساتھ ہوں۔"

۱۰۔ واقعۂ حضرت مولانا رومؒ

نیز حضرت مولانا جلال الدینؒ رومیؒ سے یہ نقل فرماتے ہیں (انہوں نے فرمایا کہ)" میں تہتّر[۳] فرقوں میں سے ایک ہوں یہ بات صاحبِ صدر مولانا سراج الدینؒ قونوی کو ناگوار گزری، کیوں کہ وہ مولانا رومؒ سے خوش نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک صاحب کو شہ دیا اور اشارہ کیا تو بس اس عقل[لے] مند نے زبان درازی شروع کر دی اور جب فحش کلامی اور گالی گلوچ سے کام لیا تو مولانا رومؒ نے اپنی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہاں! اب جو کچھ تو نے کہا ہے میں اس میں سے بھی ایک[کے] ہوں۔"

(لے کے: حاشیہ اگلے صفحے پر)

۱۱ واقعۂ حضرت شبلیؒ

(حضرت) ملا جلال الدین رومیؒ نے (اپنی کتاب "اخلاق جلالی" میں (حضرت) شبلیؒ کے حالات (و واقعات) سے یہ نقل کیا ہے کہ (آپ کے زمانہ میں کسی نے) "اگر کسی لکڑی سے جانور کو مارا تو اس کا اثر حضرت شبلیؒ کے بدن پر ظاہر ہوجاتا تھا۔"

اور اسی کتاب اخلاق جلالی) میں لکھا ہے کہ جب تنگ و تاریک مقام کے قیدیوں پہ نگاہ ڈالو تو ان کی نظر اپنی حقیقت اور نکتہ بینی پر نہیں پہنچے گی اور وہ حقیقتِ حال کے جمال سے ناواقف ہوں گے۔ (اسی لیے وہ) حقائق کو مروجہ کتابوں میں لکھی ہوئی کہانیوں اور قصوں کے مقام و مرتبہ پہ محمول کریں گے (اور ان حقائق کو سمجھنے نہیں پائیں گے بلکہ انھیں محض قصہ کہانیوں کی طرح سمجھیں گے۔) اور وہم و گمان کی دعاؤں کی پابندی میں لگ کر کتابی کلمات کے ظاہری الفاظ سے آگے بڑھنے کو کسی طرح جائز نہیں سمجھ کر پوشیدہ کردیں گے۔ مگر دُور بین (اور حقائق شناس) طالب پہ جب کہ تقلیدی راہوں اور اس کی بصیرت کی آنکھوں پر پردہ نہ پڑا ہو (اور اس نے اندھی تقلید نہ کی ہو) تو دشمنی کے بڑھانے کا غبار اور گم راہوں کے مکر و فریب اور دھوکا دینا تو اس کی چالاک آنکھ سے یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے (اور یہ بات بھی کوئی) ڈھکی چھپی ہے نہیں کہ وہم (و گمان) طبعی امور میں

۱۲۔ وہم و گمان

زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (کسی چیز کی) ترشی اور کھٹاس کے احساس اور تصوّر و خیال سے ہی (دانتوں میں سن بھری (اور بے حسی) پیدا ہو جاتی ہے۔ (اور اسی طرح سے) کسی اونچی دیوار کے سرے پر چڑھ کر (وہم و گمان کا سودا اگر سر پہ سوار کرلیا تو بالآخر وہ وہاں سے) گر پڑتا ہے۔ جب کہ اسی قدر مسافت زمین پر طے کرے تو یہاں گرنے کا وہم پیدا نہیں ہوتا ہے (اس لیے وہ گرتا بھی نہیں ہے)۔

پھر ان احوال و کیفیات کے یاد کرنے (اور تصوّر میں لانے) کے بعد بھی (ان مذکورۂ بالا) مثالوں کو جو یہاں عالم نظر آرہی ہیں عقل انھیں قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا سبب ہے جس کے زوال و انحطاط کی جانب توجّہ دیں یہ تحریر کار عقل مندوں کی فہم و فراست بھی کتابوں میں لکھی جاچکی ہے اور اس پہ مُہر لگ گئی ہے ورنہ عـہ

اس زبان سے بھی آگے ایک دوسری زبان ہے۔ عشق کے غم میں ؓ رازداریاں ہیں اس کا بھی ایک دوسرا بیان ہے۔

(عشق کی یہ ہاں شہادت گاہ میں جو انوار الٰہی کی تجلّیات سے چمک دمک رہی ہے زبان رکھتا ہوں، مگر بولنا بہتر نہیں سمجھتا ہوں۔" انتہیٰ۔

(گزشتہ صـ کا حاشیہ)

عـلـہ "عقل مند" یہاں طنز کے طور پر کہا گیا ہے جیسے کوئی بے وقوفی کی بات کرے یا بیجا حرکت کرے تو اس وقت کہا کرتے ہیں کہ "بڑی عقل مندی کی" "بہت اچھا کام کیا"۔ اس سے شاباشی دلانا، مبارکبادی دینا منظور نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ الٹے اس کی اس بے جا و ناروا حرکت پہ شرمندہ کرانا اور عار دلانا ہوتا ہے۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ

عـہ صاحبِ "من لگن" کہتے ہیں : عـہ

جو غیر کو آپ کر پہچانے ٭ او کیوں کرے دشمنی دلوانے ۱۲ منہ

۱۳۔ غلبۂ حال

غرض یہ جملہ باتیں جو (یہاں ابھی) مذکورہ حوالوں سے تحریر میں آئی ہیں
یہ سب کچھ غلبۂ حال کے نتیجے سے نکلی ہوئی ہیں۔ مثنوی شریف ؎

اس بزرگ فقیر (حضرت بایزید بسطامیؒ قدس سرہٗ) نے ایک دن اپنے مریدین سے فرمایا کہ میں خدا ہوں (اور ایسا) سُکر کے عالم میں اُن کی زبان سے نکل گیا تھا۔ اس بزرگ مستانہ نے علانیہ طور پر یہ کہہ دیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے میرے پس تم میری عبادت کیا کرو۔ جب اُن سے صبح کے وقت یہ حالتِ سُکر دُور ہوی (اور وہ حالتِ صَحْو میں آگئے) تو کہا گیا کہ (حضرت) آپ کی زبانِ مبارک سے (یہ غیر مناسب الفاظ اور کفریہ کلمات) نکل گئے تھے۔ اور پھر اس کی تردید بھی (آپ نے) نہیں فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ اس مرتبہ اگر اس قسم کی باتیں میری زبان سے نکلیں تو تم تلوار سے میری گردن قلم (جُدا) کردو (میں خدا کیسے ہوسکتا ہوں؛ جب کہ) خدا کی ذات جسم سے پاک ہے اور میں جسم کے ساتھ ہوں۔ جب اس قسم کے الفاظ کسی زبان سے نکلتے ہیں تو ایسے شخص کو قتل کردینا چاہیئے۔

(غرض) مدہوشی کا عالم دُور ہوا۔ بے ہوشی کی کیفیت ہٹ گئی اور آپ کی یہ تاکید بھی دل نشین بن گئی۔ عشق کا غلبہ ہو تو عقل ٹھکانے نہیں رہتی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو شمع ماند پڑجاتی ہے۔ آپ کی عقل اس کتوال یا محافظ کے مانند ہے جو کسی بادشاہ کا خاص مُصاحب و دربان ہوتا ہے۔ اور ایک وہ کتوال یا سپاہی بھی ہے جو صرف خزانے کا محافظ ہوتا ہے۔ (اور اُسے بادشاہ تک رسائی نہیں ہو پاتی۔) عقل تو گویا تو اور سایہ ہوتی ہے اور حق آفتاب کی طرح ہے۔ پھر اس سایہ کو آفتاب کے سامنے کیسی تاب؟ اور کیسی طاقت؟؟

جب پری مرد انسان پر سوار ہوجاتی ہے تو اس کے اندر مردانیت زائل اور نسوانیت کے اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں (حتّٰی کہ آواز بھی نسوانی ہوتی ہے) پری جو بولتی ہے وہی اس کی زبان سے نکلتا ہے یعنے یہ اپنی زبان سے نہیں بلکہ پری کی زبان سے بولتا ہے اور جب پری کے اندر اتنی طاقت اور یہ سکت ہے تو (پھر خود ہی سوچو اور غور کرو کہ) اس پری کے خالق و پروردگار کے پاس کتنی قدرت اور طاقت ہوگی۔

اب یہ انسان جاکر پری بن گیا ہے جیسے بے الہام ترکی عربی گھوڑا بن گیا ہو اور جب ایک لغت کے اندر دو مطلب آسکتے ہیں اور جب پری میں یہ ذات اور صفتیں جمع ہوسکتی ہیں تو پھر پری یا وآدمی کے خالق و پروردگار میں پری سے (ان مُتضاد صفتوں میں) آخر کمی کیسے آسکتی ہے؟ (یہ تو بدرجۂ اتم اس کے اندر موجود ہوں گی۔)

(اے انسان) شیر کو پکڑ (اور دیکھ) اس کے عُضوِ تناسل کا خون بھی (درحقیقت) ایک چھوٹا شیر سمجھا جاتا ہے مگر تو یہ کہے گا کہ اس کے عضو تناسل نے کچھ نہیں کیا بلکہ اس کے شراب (خواہش نفس) نے کیا ہے۔ اگر بات اور بڑھادی جائے (اور ترقی کرکے کہی جائے) تو تُو یہ کہے گا کہ شراب ہی نے مجھے یہ باتیں سکھلائی ہیں۔ (دیکھ) شراب کے اندر ہی یہ شر و فساد اور غل غپاڑہ ہوتا ہے (مگر) حق تعالیٰ کے نور کے اندر نہ تو اس قسم کی عقل ہوتی ہے اور نہ اس طرح کے غل غپاڑے

کا زور و شور رہی ۔
یہ وہ اونچی باتیں ہیں جو تجھے کل سے ہٹا کر خالی کرکے پستی کی (جزء) کی طرف مائل کردیں گی۔ (جو بظاہر پستی ہوں گی مگر باطن میں اونچی اور عالی ہوں گی۔) یہ قرآن شریف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ہے۔ جو حق کہے اسے کافر نہیں کہا گیا ہے۔ صاحب "گلشن زار" فرماتے ہیں کہ ؎

روا باشد اَنَا الحق از درختے
چرا نبود روا از نیک بختے

جب کسی درخت سے انا الحق کی آواز کا نکلنا روا اور درست ہے تو بتا کسی نیک بخت کی زبان سے یہ کلمہ نکلنا آخر کیوں درست نہیں؟

۱۴۔ اللہ کا نائب اور خلیفہ

خوب سمجھ لو! حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ: "اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ ونیز یہ بھی فرماتے ہیں "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو (ان کو پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسماء کا۔ احادیث میں اور صحابہ رضؓ کرام کے اقوال و آثار میں نیز (اللہ کی کتاب) توریت کے باب اول کے دفتر اول میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت و شکل میں بنایا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ) اور اسی طرح سے احادیث میں اور انبیاءِ سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے صحیفوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو اپنے نفس کو پہچان لیا وہ اپنے رب کو پہچان لیا۔ (مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ)

اور اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ میرا بندہ جب میرے ساتھ قربت و نزدیکی حاصل کرتا ہے تاکہ میں اس کو اپنا دوست بنالوں اور جب میں اس کو اپنا دوست بنالیتا ہوں تو پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں (جس سے وہ سنتا ہے۔) اس کی آنکھ بن جاتا ہوں (جس سے وہ دیکھتا ہے) اور اس کی زبان بن جاتا ہوں (جس سے وہ باتیں کرتا ہے۔)

اور احادیث کے علاوہ (یہ مضمون انجیل میں بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) میں بیمار ہوگیا تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی؟ "مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي" (اب یہ شخص حیران ہوگا یا اللہ آپ کب بیمار ہوئے تھے! جو عیادت کے لیے آسکوں اور بیمار پرسی کرسکوں۔ اس پر اللہ میاں فرمائیں گے) میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تو نے اس کی بیمار پرسی اور عیادت کی ہوتی تو (اس کا مطلب یہ ہوتا کہ) تو نے (سچ مچ) میری ہی بیمار پرسی کی ہے اور اس قسم کی بے شمار مثالیں احادیث میں آئی ہوئی ہیں۔

۱۵۔ مقاماتِ غلبۂ حال

یہ سب غلبۂ حال کے مقامات سے متعلق ہیں۔ ان کی صحت (اور جواز کا) حل قرآنی آیات اور مذکورہ احادیث کے معانی کے کشف (والہام) پر موقوف ہے۔ بہت سے عقلمند ان باتوں کے سننے کی تاب و طاقت نہیں رکھتے ہیں اور خلافتِ آدمؑ اور تعلیمِ اسماء (ناموں کی تعلیم و تربیت) اور ان کے معانی و مطالب کی تفہیم سے عاجز اور قاصر ہیں۔

اور نیز شکل و صورت کے معنیٰ و مطلب بیان کرنے اور اس کی تشبیہہ دینے (کی مشکل میں) پڑ گئے ہیں اور غور کر رہے ہیں کہ صورت سے (کیا مراد ہے؟) سوائے ظاہری صورت کے اور کوئی شکل تو نہیں ہے اور بعض دانش مند حلول اور اتحاد کی چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور بعض (نافہموں) اور بے عقلوں کی حالت ان باتوں کی فہم و فراست سے مانع اور ان باتوں کے اعلان سے روکتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: "لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان سے گفتگو کرو۔" (کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِهِم) "اور چھوڑ دو اُن باتوں کو جن کا تم انکار کرتے ہو۔" "کیا تم یہ خیال کرتے ہو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا دیں"۔؟ (حالاں کہ) شریعت اس قسم کی باتوں کے اظہار کی کبھی اجازت نہیں دی ہے۔ پھر ان باتوں کا کشف (والہام) بھی صحیح سلوک اور جذبۂ الٰہی پر موقوف ہے جیسا کہ (کتاب) "کیمیائے سعادت" میں موجود ہے:

کتاب "ایقاظ الغافلین" میں (علامہ محمد باقر آگاہؒ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے (حضرت) شیخ اکبر رضی اللہ عنہ سے (یہ قول) نقل فرمایا ہے کہ "نَحنُ رِجَالٌ یَحرُمُ النَّظَرُ فِی کُتُبِنَا" یعنی ہم وہ مرد ہیں کہ ہماری کتابوں پر نظر کرنا بھی حرام ہے۔ (یعنی ہماری کتابوں کا مطالعہ مُبتدی کے لیے حرام ہے) یہ وہی مقام ہے جس پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں: ؎

اس کے بعد ایک ایسا حرف ہے جو اُلجھا ہوا اور لپٹا ہوا بھی ہے اور وہ نگاہوں سے دُور بھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ بیٹھا رہ اور خود کو دربار سے وابستگی اور انہماک ہونے مت دے۔ شاہی رازدادیوں کو تو کسی سے مت کہنا اور شکر کو مکھّی کے آگے مت چھڑکنا (اور بقولِ شاعر: ؎

(مگس کو باغ میں جانے نہ دینا		کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا)

اور خدائی جلال کے اسرار و رموز کے سننے کو تیرے کان مُتحمل نہ ہوسکیں گے اور وہ ایک نیا رنگ اختیار کر لیں گے۔ کیوں کہ سوسن جب عام زبانوں پر آتی ہے تو اسکی خاصیت بدل کر وہ لال بن جاتی ہے۔ ●●

جاری

فصل الخطاب

بین الخطاء والصواب

تصنیف

مجددِ جنوب حضرت العلامہ شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہ

ترجمہ و تلخیص:

مولوی حافظ ابو النعمان شاہ بشیر الحق قریشی قادری ادھونی استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

فائدہ ۳۸

وحدۃ الوجود

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ وحدۃ الوجود حق اور واقع کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اس کے ثبوت میں دلائلِ عقلیہ اور نقلیہ موجود ہیں۔ جیسا کہ یہ مسئلہ شیخ علی مہائمی گجراتی کی کتاب "أدلۃ التوحید" میں شرح وبسط کے ساتھ موجود ہے۔ انتہی

صوفیاء نے عالم کو حق تعالیٰ کا جو عین کہا ہے، اس قول سے جمیع وجوہ کے ساتھ عینیت مراد نہیں ہے بلکہ عالم ایک وجہ سے حق تعالیٰ کا عین ہے تو ایک وجہ سے حق تعالیٰ کا غیر ہے۔ جیسا کہ زید جو نوعِ انسان کا ایک فرد ہے حقیقت کے اعتبار سے نوع کا عین ہے اور تعیّن کے اعتبار سے غیر ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی "الطاف القدس" میں فرماتے ہیں:

"ظہور، ظاہر اور مَظہر کے درمیان ایک نسبت ہے اور اس نسبت کا حکم دوسری تمام نسبتوں کے حکم کا غیر ہے۔ اس لیے کہ وہ ظاہر جمیع اعتبار سے مَظہر کا عین نہیں ہے اور جمیع کے اعتبار سے مَظہر کا غیر بھی نہیں ہے۔ مانندِ نوعِ انسان بہ نسبت افرادِ انسان۔

اگر نوع (حیوان ناطق) جمیع وجوہ کے ساتھ اس فرد (مثلاً زید) کا عین ہوتا تو یہ فرد (مثلاً زید) دوسرے فرد (مثلاً عمر) پر محمول ہونا چاہیے۔ جیسا کہ نوع (یعنی حیوانِ ناطق زید وعمر پر) محمول ہوتا اور اگر جمیع وجوہ کے ساتھ اس فرد کا غیر ہوتا تو (مثلاً زید انسان ہے) ھذا انسان صحیح نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ ھذا حجر (زید حجر ہے) صحیح نہیں ہے۔

نوعِ انسان و نوعِ فرس، حیوان کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور حیوان و شجر نامی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور نامی و جماد جسم کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور جسم و مجرد جوہر کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور جوہر و عرض، وجودِ عام کی طرف نسبت کرتے ہوئے یہی کیفیت رکھتے ہیں۔ (یعنی من کل الوجوہ عین بھی نہیں غیر بھی نہیں) لہٰذا یہ امر بدیہی ہے کہ ان مقامات میں ایک دوسرے پر محمول ہونے کا مصداق اور ایک دوسرے کے مغایر ہونے کا مصداق دونوں پائے جاتے ہیں۔ اور اس صورت میں دونوں قبیل کے احکام کی گنجائش ہوتی ہے۔ ناقص عقلیں کبھی ان (مصداقِ حمل وتغایر) کو جمیع وجوہ کے ساتھ عین شئے کی قبیل سے قرار

دیتی ہیں جیسے ملاحدہ۔

اور جب عینیت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو اس عقیدہ کی تنقیض کر دیتی ہیں اور کبھی ان کو جمیع وجوہ سے غیر شئی کی قبیل سے قرار دیتی ہیں۔ جیسے اکثر متکلمین اور جب غیریت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو متحیر ہو جاتی ہیں۔

عقول سلیمہ جانتی ہیں کہ عالم اور حق تعالیٰ کے درمیان عینیت اور غیریت کی نسبت کے علاوہ ایک اور ہی نسبت ہے۔ خصوصیاتِ عالم میں سے جو بھی خصوصیت ظاہر و باہر ہے ساحتِ وجودِ عام اس کے غبار سے پاک ہے۔ جیسا کہ جلد کی سیاہی، قد کی کوتاہی، زبان کی لکنت۔ نوعِ انسان کو ملوث نہیں کرتی۔ ہر چند کہ کالا، کوتاہ قد اور صاحبِ لکنت انسان ہی ہے اور جو بھی چیز مطلق ہونے کی حیثیت سے اطلاق کے مرتبہ سے ظاہر ہوئی ہو اس کو خصوصیت کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے چنانچہ نوع ہونے، کلی ہونے اور مطلق ہونے کو اس فرد کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے۔ (یعنی ایک فرد لنگڑا ہو تو کہہ نہیں سکتے کہ نوع لنگڑی ہے، کلی لنگر ہے۔ مثلاً زید لنگڑا ہو تو کہہ نہیں سکتے کہ حیوان ناطق لنگڑا ہے) ہر چند کہ مطلق مقید میں ہے (جیسے حیوان ناطق زید میں ہے)

جب ان انواع مختلفہ میں قسم قسم کے خواص ہاتھ لگ جاتے ہیں تو (الاشیاء تعرف باضدادھا۔ اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔) کے حکم کے مطابق عقل ان امور متغائرہ کی سند سے مختلف انواع کے ثبوت کا یقین کر لیتی ہے۔ اور ہر ایک کو دوسرے سے فرق کر کے پہچان لیتی ہے۔ برخلاف وجود عام کے کہ اس کا کوئی غیر محسوس اور معقول نہیں ہے کہ عقل اس کے اندر تصرف کر کے اس میں اور اس کے غیر میں فرق کر سکے۔ اس کے باوجود یعنی وجود عام کا کوغیر نہ ہونے کے باوجود وجود عام پہ لطافت پر لطافت اور بساطت پہ بساطت چڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا حیرت کے سوا کوئی چیز عقل کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اسی لیے فلاسفر نے جوہر اور عرض کے درمیان حقیقت مشترکہ کا اثبات نہیں کیا اور وجودِ عام کو جنس اعلیٰ شمار نہیں کیا۔ شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی "مکتوبِ مدنی" میں فرماتے ہیں:۔

"صوفیاء نے عالم کو حق تعالیٰ کا عین قرار دیا تو اس سے ان حضرات نے وجود اشیاء خاصہ کی نفی کا ارادہ نہیں کیا جو مختلف مراتب کی جانب وجود کے تنزل سے حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے معنئ تنزل اور ظہور کے افادے کا ارادہ کیا ہے۔ جیسے ایک معقولی کہتا ہے کہ زید اور عمر ایک ہیں تو اس سے مراد نوع میں مماثلت ہے نہ کہ ان دونوں کے درمیان ہر وجہ سے اتحاد ہے اور کہتا ہے کہ

انسان اور فرس ایک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اور فرس یہ دونوں حیوانیت میں مشترک ہیں اور کہتا ہے کہ بہادر اور شیر ایک ہیں تو اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شجاعت میں دونوں ایک ہیں۔

اسی طرح صوفیاء عالم کو حق تعالیٰ کا عین کہتے ہیں تو اس سے وجودِ منبسط میں تعین کلی اور حق تعالیٰ کے ساتھ وجودِ منبسط کا قیام مراد لیتے ہیں۔ بالکلیہ تمایز کی نفی مراد نہیں لیتے۔

کسی صوفی نے کہا ہے۔ ہر مرتبہ از وجودِ حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

وجود کا ہر مرتبہ ایک حکم رکھتا ہے۔ اگر فرقِ مراتب کا لحاظ نہ کرو تو تم زندیق ہو۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی اور تحفہ مرسلہ کے مصنف اور دیگر صوفیائے کرام نے غیریت کو اعتباری قرار دیا ہے۔ اس سے ان حضرات کی مراد اعتبارِ واقعی اور حقیقی ہے۔ معتبر کا اعتبار مراد نہیں ہے جیسا کہ شاہ صاحب مکتوبِ مذکور میں رقمطراز ہیں:

یہ نہیں کہا جائے گا کہ صوفیاء اس بات کو لازم قرار دیتے ہیں کہ حقائق امکانیہ اعتبارات ہیں اور وجود کے ساتھ اضافات لاحقہ ہیں۔ اس لیے کہ ہم کہیں گے کہ صوفیاء کہتے ہیں۔ بے شک آگ، پانی کا غیر ہے اور پانی، ہوا کا غیر ہے اور انسان گھوڑے کا غیر ہے۔ اگرچہ کہ وجود ان سب (آگ، پانی، ہوا انسان، گھوڑا) کو شامل ہے۔ لامحالہ انہوں نے اعتبارات اور اضافات سے ایک ایسا معنی مراد لیا ہے جو اس تغائر کا مزاحم نہ ہوگا جو اختلافِ احکام کا منشاء ہے۔

اور یہ معنی و مفہوم وہی ہے جس کی تعبیر کثرت، حقیقی اور وحدت، اعتباری سے کی گئی ہے۔ جب کہ ہم اس کی حقیقت کی کثرت مراد نہیں لیتے بلکہ احکام کی تمیز اور آثار کا اختلاف اور حقائق کا تغیر مراد لیتے ہیں۔ جو کہ وجوداتِ خاصہ ہیں اور اصل وجود میں ان کا اختلاف مراد نہیں اور ہرگز ہرگز وجود واحد منبسط کی جانب سے اپنے موجودہ ڈھانچوں کے ساتھ ان کا عدمِ رجوع بھی مراد نہیں لیتے ہیں۔

نیز شاہ صاحب مکتوبِ مذکور میں فرماتے ہیں:۔

اور ویسے ہی میرے نزدیک مولانا عبدالرحمٰن جامی کا کلام مسلم ہے۔ کیوں کہ ان کا مقصود حقائق اور ان کے متعلقات کے اصل ہونے کی نفی ہے اور بے شک حقائق اور ان کے متعلقات، وجود حق تعالےٰ کے لیے اعتبارات اور اضافات ہیں۔ اس معنی و مفہوم میں کہ ان کے اندر وجودِ حق ظاہر اور متعین ہے۔ فرقِ اعتباری کے معنی و مفہوم میں نہیں۔ انتہی۔

نیز شاہ صاحب مکتوبِ مذکور میں فرماتے ہیں:۔

"میں کہتا ہوں کہ وحدۃ الوجود کے قائل صوفیاء کا یہ قول عقل وکشف کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اس لیے کہ جب تم کہتے ہو کہ معرکۂ قتال میں جسم ہی متحقق ہے۔ پس وہی قاتل ہے اور وہی مقتول ہے اور وہی قتل کا آلہ ہے اور وہی سوار ہے اور وہی سواری ہے اور وہی زین ہے اور وہی تلوار ہے اور وہی نیزہ ہے اور وہی کمان ہے اور وہی تیر ہے۔ اور وہی تیر چلانے والا ہے اور وہی نشانہ ہے۔ اور وہی شکست دینے والا اور وہی شکست خوردہ ہے اور وہی حملہ کرنے والا ہے اور وہی حملہ کیا گیا ہوا ہے۔

سوائے اس کے کہ جسم ان اسماء میں سے کسی بھی اسم کا مستحق نہیں بنا ہے اگر بنا ہے تو ایک کیفیتِ خاصہ اور معنیٔ خاص کے ذریعہ مستحق بنا ہے۔ اگر ہم ان کیفیات کے جسم سے متصل ہونے کو قطعِ نظر کرکے ان پر غور وفکر کریں تو وہ معدوم ہوں گی اور ان کیفیات سے اُن کے آثار کا صدور بھی نہ ہوگا اور اگر جسم کے ساتھ ان کا انضمام ہو جائے تو وہ کیفیات موجود ہوں گے اور ان سے ان کے آثار کا صدور بھی ہوگا اور جسم ان کیفیات کا محل ہے۔ اور ان کیفیات کا حامل بھی ہے (جسم) اپنے وجودِ خارجی سے قبل عقل وتقدیر میں ان معانی کے لیے قابل اور مستعد بھی ہے۔ اور یہ کثیر صورتیں معدوم محض ہیں اگر جسم سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی جانب ملاحظہ کیا جائے تو ان صورتوں کے لیے کوئی تحقق اور وجود نہیں ہے۔ اور یہ تمام موہوم ہیں۔ اور اگر ان کو جسم کے انضمام کے ساتھ ملاحظہ کیا جائے تو یہ تمام صورتیں موجود ہیں۔ اور جب جسم تلوار کی صفت وکیفیت سے متصف ہو جائے اور کبھی نیزہ کی صفت سے تو جسم اسباب کا یعنی بڑھئی، لوہار، لکڑی، لوہا، آگ، بھٹی، ہتھوڑی، تیشہ اور آرہ وغیرہ کا مقتضی ہوگا۔ یہاں تک کہ معدوم موہوم (تلوار اور نیزہ) اور موجود (جسم) کے درمیان ایک نسبت پیدا ہو گئی۔ جس کی اینیت معلوم اور کیفیت مجہول ہوگی اسی نسبت کی وجہ سے۔ یہ معدوم (تلوار ونیزہ) وجودِ خارجی سے متصف ہوگا اور اس وقت تلوار اور نیزہ کے وجود کا معنی وجود (جسم) کے ساتھ معدوم (تلوار ونیزہ) کا ارتباط ہے۔ اس طرح کہ اس کے لیے وجود سے اسم کا اشتقاق صحیح ہوتا ہے اور عمومی طور پر جسم صورِ کثیرہ کے لیے متحمل ہو جاتا ہے۔ پس جب جسم تلوار کی صفت سے متصف ہو گیا تو تلوار کے احکام قطع و برید وغیرہ سے آراستہ بھی ہو جائے گا۔ اور ایک تعینِ خاص کے ساتھ متعین ہو جائے گا۔ اور اپنی بعض متحمل صورتوں میں ظاہر ہوگا۔

پس اس وقت کہا جائے گا کہ جسم ایک مظہرِ خاص میں ظاہر ہوا ہے اور وہ تلوار ہے۔ اس

وقت سارا کلام صحیح ہوگیا جس سے کسی عاقل کو انکار ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے یہ تو صرف لفظی مناقشات ہیں جو وضع اور عرف کی جانب لوٹتے ہیں اور ہمارے نزدیک ان مناقشات میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

جب تم جسم کے بارے میں اس قدر سمجھ چکے ہو تو پس وجود بذریعہ حمل مواطاۃ اس اطلاق کے لیے اولیٰ ہے پھر موجود جس کا معنی ہے ہر وہ شیٔ جو وجود سے متصف ہے بلا شک وشبہ وہ صفتِ انتزاعیہ ہے۔

لہٰذا ہمیں اس صفتِ انتزاعیہ سے بحث کرنا چاہیے کہ کیا اس صفتِ انتزاعیہ کے لیے خارج میں انتزاع کا کوئی سبب ہے یا یہ صفت انتزاعیہ۔

انیاب الغول (بھوت کے دانت) کے مرتبے میں ہے (یعنی اس کا کوئی سبب نہیں ہے۔) اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عقل خارج میں انتزاع کے سبب اور منشا کا حکم کرتی ہے اور (انیاب الغول کے احتمالِ ثانی کو منع کرتی ہے۔ اور جب یہ جسم کا حکم ہو تو یہی بطریق اولیٰ وجود حقیقی کا حکم ہوگا جو خارج میں منشاءِ انتزاع ہے۔ انتہی۔

اس موضوع پر مکتوب نگار کی اور بھی بحث موجود ہے۔ یہ مقام اس کے نقل کا متحمل نہیں۔

اسی سے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ وجود مانحن فیہ میں ہستی کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ اور وجودِ حقیقی ایک ایسی حقیقت ہے جو ان تین صفات سے متصف ہے۔

اول یہ کہ حق تعالیٰ کی ہستی ازلاً اور ابداً اس کی اپنی ذات ہی ہے۔

دوم یہ کہ موجودات کا قیام حدوث وبقاء کے اعتبار سے اسی کی ذات سے ہے۔

سوم یہ کہ اس کا غیر وقوع اور امکان کے اعتبار سے خارج میں منتفی نہیں ہوگا۔

اور یہ انتفاء تحقیق اور حصول کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ بعض حکماء اور متکلمین کا موقف ہے۔ اس لیے کہ تحقیق اور حصول معانی مصدریہ میں سے ہیں اور معانی مصدریہ خارج میں موجود نہیں ہیں بلکہ وہ موجوداتِ ذہنیہ میں سے ہیں۔ لہٰذا اس معنی میں لفظِ وجود کا اطلاق حق تعالیٰ کی ذات پر جائز نہیں جیسا کہ مولانا مولوی رفیع الدین نقشبندی قندھاری نے "سلوکِ قادریہ" میں تحریر کیا ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ ظاہر کا ظہور مظاہر میں تین قسم پر ہے۔

اول مجرد کا ظہور مجرد میں جیسے حق تعالیٰ کی ذاتِ واحد کا ظہور کثیر اسمائے الٰہیہ میں۔

دوم مجرد کا ظہور شیٔ مادّی میں جیسے جان واحد کا ظہور جسم کے کثیر اجزاء میں۔

سوم شئی مادّی کا ظہور شئی مادّی میں جیسے مختلف رنگوں اور شکلوں والے کثیر آئینوں میں شخصِ واحد کا ظہور۔

ان تینوں ظہور میں ظاہر تغیّر و تبدل اور تقسیم و تجزی اور اس کے حلول و اتحاد کی گنجائش نہیں ہے۔

امام ربّانی مکتوبات کی جلدِ سوم کے ۸۹ ویں مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"یہ فقیر ان کے اطلاقات سے ہمہ اوست کا معنی جو سمجھتا ہے وہ یہ ہے کہ حادث کی یہ تمام متفرق جزئیات ایک ذاتِ تعالیٰ کا ظہور ہیں۔ اس رنگ میں کہ مثلاً زید کی صورت جو متعدد آئینوں میں ظاہر ہوی ہے زید کی ایک ذات کا ظہور ہے۔ یہاں کون سی جزئیت اور اتحاد ہے۔ اور کون سا حلول اور تلّون۔ زید کی ذات ان تمام صورتوں کے باوجود اپنی اصلی حالت کی خالصیت پر برقرار ہے اور آئینوں کی یہ صورتیں نہ کچھ بڑھی ہیں نہ کچھ گھٹی ہیں۔

اس جگہ میں جہاں زید کی ذات ہے ان صورتوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ تاکہ حلول و سریان جزئیت و اتحاد کی نسبتوں میں سے کسی نسبت کو اس کی طرف منسوب کر سکیں۔

الاٰن کما کان کے راز کو اسی جگہ سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جس مرتبہ میں ہے وہاں عالَم کو قبلِ ظہور جیسے گنجائش نہیں تھی بعد از ظہور بھی وہاں گنجائش نہ ہوگی۔

پس اللہ تعالیٰ لامحالہ الاٰن کما کان ہی ہوں گے۔

نعت صلی اللہ علیہ وسلم

از شیخ سعدی رح

(فارسی مع ترجمہ)

مرسلہ: محمد صابر احمد بلگام
زمرۂ خامسہ دار العلوم لطیفیہ ویلور

جاں فدائے تو یا رسول اللہ	دل گدائے تو یا رسول اللہ
آپ پر میری جان فدا ہو یا رسول اللہ	دل آپ کا طالب ہے یا رسول اللہ
فارغ از مبتلائے کونین است	مبتلائے تو یا رسول اللہ
دنیا کی محبت سے فارغ ہے	آپ کی چاہت رکھنے والا یا رسول اللہ
گر بیابم بجائے سرمہ کشم	خاک پائے تو یا رسول اللہ
میں اگر آپ کے قدموں کی خاک پالوں	سرمہ بنالوں گا یا رسول اللہ!
از ہمہ خلق گشت بیگانہ	آشنائے تو یا رسول اللہ
تمام مخلوق سے بیگانہ ہوں!	آپ کو پہچاننے والا یا رسول اللہ

فائدہ: ۳۹

وجود، وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود کے معنی میں اختلاف کے بیان میں

واضح ہو کہ وجود کی ماہیت میں اختلاف ہے۔" رشحات" کے مصنف ملّا عبدالغفور کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حکماء اور صوفیاء کو اس وجود کے بارے میں اختلاف ہے جو موجودات کے آثار کا مبداء ثابت ہوا ہے۔ وہ کون سا وجود ہے؟

شیخ رکن الدین علاؤ الدولہ سمنانی اور صوفیاء کی ایک قلیل جماعت اور حکماء و متکلمین کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ وجود حق تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت کا نام ہے جو موجودات پر افاضہ کی گئی ہے۔ اور فیض وجودی وجود عام اور نفس الرحمٰن وغیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ اور شیخ محی الدین ابنِ عربی اور آپ کے متبعین اور متقدمین و متاخرین میں اصحابِ تقویٰ و اربابِ تحقیق صوفیاء کی اکثریت اور حکماء و متکلمین کی اقلیت کی یہ رائے ہے کہ وہ وجود جو مبداء آثار بنا ہوا ہے، حق تعالیٰ کا وجود ہی ہے جو اپنی حقیقت کا عین ہے، غیر نہیں۔

پس سارے ممکنات، وجودِ واجب سے موجود ہیں یعنی ذاتِ حق کو اشیاء کے ساتھ ایک قسم کی معیت کا تعلق واقع ہے کہ یہ معیت مجہول الکیفیت ہے۔ انبیاء، اولیاء اور حکماء میں جو اربابِ تحقیق ہیں ان میں سے ایک فرد بھی اس معیت اور اس کی حقیقت کے راز کے درپے نہیں ہوا ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ہے کہ جو کچھ افراد اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق معیت کے راز پر مطلع اور واقف ہوئے ہیں اور جو بھی تمثیل ذاتِ حق کی معیت کے ساتھ مشابہ ہے اس کے ساتھ کسی قدر مناسبت رکھتی ہے۔ نہ کہ معیتِ الٰہیہ فی الواقع ایسی ہی ہوگی جیسے معروض کے ساتھ عارض کی نسبت جیسے کوزہ کی معیت مٹی کے ساتھ اور مٹی کی معیت کوزہ کے ساتھ) اور بعض کے نزدیک وجود امر انتزاعی ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی فرماتے ہیں:-

کہا گیا ہے کہ وجود امر انتزاعی ہے جس سے ماہیات متصف ہوتے ہیں اور بنانے والے نے

ماہیت کو ماہیت اور وجود کو وجود نہیں بنایا بلکہ ماہیت کو موجود بنایا ہے۔
میں کہتا ہوں یہ قول بذاتِ خود درست تو ہے لیکن وجود کی معرفت کو اسی میں حصر کرنے کے اعتبار سے اور وجود حقیقی کی بحث میں ذکر کرنے کے اعتبار سے غلط ہے۔ بلا شک و شبہ ہم ایک امرِ انتزاعی کا ادراک کرتے ہیں اور اس کو وجود کے نام سے موسوم ہوئی اور ماہیات سے موصوف کرتے ہیں اور وجود کی صفت سے متصف کرنا جعل جاعل (حق تعالیٰ) کے آثار میں سے ایک اثر اور جاعل کے لیے مسبّب ہے۔
اور کہا گیا ہے کہ جاعل نے ماہیت کو بنا دیا اور اپنی ذات سے ماہیت کو صادر کر دیا اور اس کے صدور کے بعد دیکھنے والوں نے ظہور فاعلیت اور قابلیت وغیرہ میں سے بعض احوال کو دیکھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں ایک صورت مرتسم ہو گئی جو وجود کے نام سے موسوم ہوئی۔
میں کہتا ہوں کہ یہ قول بھی بذاتِ خود درست ہے لیکن اسی میں وجود معرفت کو حصر کرنے کے اعتبار سے غلط ہے۔ پس ہم خارج میں قطعی طور پر باہم متفرق اور ایک دوسرے سے ممتاز امور کا ادراک کرتے ہیں اور انھیں اسمائے مختلفہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بلا شک و شبہ امور متمائزہ جعل جاعل ہی سے ہیں۔
وجود کے اسی اختلاف میں مولانا شاہ ولی اللہ مکتوب مدنی میں فیصلہ فرماتے ہیں۔ حق و صواب یہ ہے کہ بے شک یہاں وجودات خاصہ ہیں جن کا نام ہم نے ماہیات رکھ دیا جو دوسرے دو وجودوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک وجود وجدانی ہے جو موجودات کی شکلوں اور صورتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ وجودِ وجدانی، وجوداتِ خاصہ پر متقدم ہے اور وجودات خاصہ، وجود کے بعض عموم کے لیے تنزلات اور تعینات ہیں۔ اور وجود و ماہیات کے درمیان اینیت کے معلوم اور کیفیت کے مجہول کے ارتباط سے وجوداتِ خاصہ حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہی ماہیات وجود منبسط کے شئوں اور حالات اور اس کے صور علمیہ ہیں۔
اور ان میں سے دوسرا وجود منتزع ہے جو اجمالاً وجوداتِ خاصہ کے ملاحظہ سے منتزع ہے۔ ان دونوں وجود کے قائل افراد میں سے ہر ایک نے حق و صواب کو تو پا لیا لیکن ایسی چیز پر اکتفاء کر کے جو بیمار کو شفاء نہ دے اور سوزشِ دروں کو نہ بجھا دے غلطی کر بیٹھے۔
صوفیاء کا کہنا ہے کہ جو شئی خارج میں ہوگی اور اس کے اوپر آثار خارجیہ مرتب ہوں گے تو وہ اس بات سے خالی نہ ہوگی کہ خارج میں اپنے حصول میں اور اس کے اوپر آثارِ خارجیہ کے درست ہونے میں یا تو کسی ضم ضمیمہ کے انضمام کی جانب محتاج ہوگی یا محتاج نہ ہوگی اگر محتاج نہ ہوگی تو وہ شئی ممکن ہے اور اگر

محتاج نہ ہوگی تو واجب ہے۔

اور ہم نے اپنے ذوقِ و وجدان سے ادراک کیا ہے کہ بے شک یہ ضمیمہ وہی وجود ہے جو موجودات کی شکلوں اور صورتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ ایک ایسی شئی ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور اپنے غیر کے قیام کا باعث ہے۔ اور لوگوں کے نزدیک آثارِ معلومہ میں سے کسی نوع کے ساتھ مختص اور فی نفسہ متعین نہیں ہے۔ لیکن وجود منبسط کے لیے علماً و عیناً کئی تنزلات ہیں۔

پس ان ہی تنزلات کی وجہ سے آثارِ خاصۂ معلومہ سے متعین اور مختص ہو گیا ہے۔ اور اس کے تنزل کے مراتب میں سے پہلا مرتبہ بالذات اپنے نفس کے لیے اس کی تجلّی ہے۔ ایسی شانِ کلی کے ساتھ کہ کوئی بھی شان کوئی بھی حالت قطعاً اس سے خارج نہ ہو۔

پھر وجود کا تنزل اس شانِ کلی کی تفاصیل کی جانب علمی ہے عینی نہیں۔ پھر وجود کا تنزل مذکور تفصیل میں عینی ہے جیسے علمی تھا۔ انتہی!

یہ ہے وہ اختلاف جو وجود کے معنی میں صوفیاء نے کیا ہے۔ لیکن وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے معنی میں اختلاف یہ ہے جس کو مولانا شاہ ولی اللہ نے مکتوبِ مدنی میں تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جان لیجیے! بے شک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دو لفظ ہیں جن کا اطلاق دو مقام میں ہوتا ہے۔ کبھی یہ لفظ سیر الی اللہ کے مباحث میں استعمال ہوتے ہیں۔ پس کہا جائے گا کہ اس سالک کا مقام وحدۃ الوجود ہے اور اس سالک کا مقام وحدۃ الشہود ہے۔

وحدۃ الوجود کا معنی سیر الی اللہ کے مباحث میں ایسی حقیقتِ جامعہ کی معرفت میں ڈوب جانا ہے۔ جس میں عالم کا تعین اس حیثیت سے ہوا ہے کہ جس سے ایسی تفرقی اور تمیز کے احکام ساقط ہو جائیں گے۔ جن پر خیر و شر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جن کی عقل و شریعت دونوں خبر دیتے ہیں اور ان کی مکمل تشریح کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس میں بعض سالکین حلول کا شکار ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ انھیں اس مقام سے خلاصی عطا فرماتا ہے۔

اور وحدۃ الشہود کا معنی جمع اور تفرقی کے احکام میں جمع کرنا ہے۔ پس جان لینا چاہیے کہ بیشک اشیاء ایک اعتبار سے واحد ہیں اور دوسرے اعتبار سے کثیر اور مبائن و متفرق ہیں اور یہ مقام مقامِ اول (وحدۃ الوجود) سے ارفع اور اکمل ہے۔ اور اس اصطلاح کو میں نے شیخ آدم بنوری قدس سرہٗ کے بعض متبعین سے حاصل کیا ہے۔

اور کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے الفاظ بعینہ اشیاء کے حقائق کی معرفت میں استعمال

کئے جاتے ہیں۔ پس صوفیاء نے قدیم کے ساتھ حادث کے ارتباط کی وجہ میں غور و فکر کیا تو وجودیہ حضرات کے نزدیک یہ بات ثابت ہوی کہ بے شک عالم ایک ہی حقیقت میں جمع شدہ چند اعراض کا نام ہے جیسے کہ (اگر آپ موم سے) سے انسان کی صورت گھوڑے کی صورت، گدھے کی صورت بنائیں تو موم پر وہ صورتیں انزآتی ہیں اور موم کی طبیعت تمام حالتوں میں باقی رہتی ہے لیکن موم کو تماثیل کے نام سے یعنی انسان، گھوڑے اور گدھے کے نام سے موسوم نہیں کیا جائے گا۔ اگر کیا جائے تو اس کے اوپر مرتسم ہونے والی صورتوں کی وجہ سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ صورتیں حقیقت میں یہی تماثیل ہیں لیکن ان کے لیے وجود نہیں ہے۔ مگر ایک ضمیمہ کے انضمام کے ساتھ ان کا وجود قائم ہے اور وہ ضمیمہ موم ہے۔

اور شہودیہ حضرات کے نزدیک یہ بات ثابت ہوی کہ بے شک اشیاء عالم، اسماء اور صفات کے عکس ہیں۔ جو نیستی کے ایسے آئینوں میں منطبع ہوئے ہیں جو ان اسماء کے مقابل ہیں۔ جیسا کہ قدرت کی مقابلہ میں عدم ہے جو عجز ہے۔ پس جب قدرت کی شعاع، عجز کے آئینہ میں منعکس ہوتی ہے تو وہ قدرت ممکنہ بن جاتی ہے۔ تمام صفات کو اسی پر قیاس کرلیا جائے اور وجود بھی اسی اسلوب اور نہج پر ہے۔

مذہبِ اول وحدۃ الوجود سے موسوم ہے اور مذہبِ ثانی وحدۃ الشہود سے موسوم ہے۔

اصل الاصول کے مصنف حضرت شاہ عبدالقادر فخری میلاپوری ۲۳ ویں اصل میں سیر و سلوکِ معنوی اور مرتبۂ توحید حالی کے مباحث میں فرماتے ہیں۔

حضرات صوفیاء کو مرتبۂ توحیدِ حالی دو قسم سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک قسم یہ ہے کہ احدیت ذاتی کی سطوت میں یہ ساری کثرتیں مقہور اور مخفی ہوجاتی ہیں اور حقیقت واحدہ نظر آتی ہے۔ مثلاً اگر سونے کے تمام زیورات کو پگھلا دیں تو خالص سونا بغیر صورت کے نظر آئے گا اور اگر لوہے کے تمام اسلحہ اور زرہیں پگھلا دی جائیں تو محض لوہا نظر آئے گا اور تمام سمندری موجیں، حباب، برف اور اولہ کی صورتیں برطرف ہوگئیں تو صرف سادہ سمندر نظر آئے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واحدہ کو ان کثرتوں میں مشاہدہ کرے بغیر اس کے یہ کثرتیں سالک کی نظر سے مرتفع ہوں مثلاً کلی کا مشاہدہ افراد کے ضمن میں اور سونے کا مشاہدہ زیورمیں اور لوہے کا مشاہدہ اسلحہ میں اور سمندر کا مشاہدہ امواج اور بلبلوں میں اور مٹی کا مشاہدہ برتنوں میں۔

وجودی حضرات کو ان کے اپنے سلوک میں اولاً اور دوسری قسم پیش آتی ہے۔ اس کے بعد وہ پہلی قسم کے شہودیہ فائز ہوتے ہیں۔

۔پس یہ حضرات جانتے ہیں کہ وہ صورت جو ہم کو قسم اول میں مشہود ہوئی یعنی کثرت میں (زیورات) وحدت (سونے) کا نظارہ ہی حقیقت ہے۔ کیوں کہ اس حقیقتِ واحدہ کو کثرتوں کے ساتھ معیتِ ذاتی حاصل ہے۔ اور دوسری قسم میں جو بات نظر آئی اور وہ صورت جو آخر میں شہود ہوئی یہ دیکھنے میں فقط اخفاء اور پردہ ہے۔ مثلاً نورِ آفتاب کی سطوت میں ستاروں کا پوشیدہ ہونا۔

شہودی حضرات کو بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور وہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ جو صورت ہم کو اولاً مشہود ہوی عشق و محبت کے غلبہ کی وجہ سے تھی۔ ؎

در و دیوار میں آئینہ شد از کثرتِ شوق

ہر کجا می نگرم روئے ترا می بینم

کثرتِ شوق کے باعث در و دیوار میرا آئینہ بن گئے ہیں۔ جہاں کہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے ہی کو دیکھتا ہوں۔

ورنہ حقیقتِ واحدہ کو کثرتوں کے ساتھ کسی طرح کی ملاسبت اور مخالطت نہیں ہے۔ (کیوں کہ حقیقتِ واحدہ عالم کے ساتھ نسبت تباین رکھتی ہے) اور وہ صورت جو آخر میں مشہود ہوی حقیقتِ نفس الامری ہے اور اس مرتبہ سے ترقی واقع ہوی۔

اور اسی طرح وجودی حضرات جب فنائے تام کی منزل پہ پہنچتے ہیں تو اُن کو قسمِ اول کا شہود میسر آتا ہے۔ جب منزلِ بقا (یعنی فرقِ ثانی جس کو فرق بعد الجمع کہتے ہیں) سے سرفراز ہوتے ہیں۔ قسمِ ثانی کے شہود سے نیچے اتر آتے ہیں۔ پس کہتے ہیں کہ وہ تجلّی ذاتی الٰہی، سیر الی اللہ اور فنا فی اللہ رہی ہے۔ اور یہ تجلّی صفاتی اور اسمائی، سیر فی اللہ اور بقا باللہ ہے۔

اور شہودی صوفیاء کو بھی یہی حالت پیش آتی ہے تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ذات بحت کا شہود حقیقی اور نفس الامری تھا اور یہ کثرت میں وحدت کا شہود صرف ہماری نظر میں ہے۔ واقعی اور حقیقی نہیں ہے جیسے کوئی شخص سورج کے دائرہ پہ نظر کرے، پھر دوسری اشیاء پر نظر ڈالے۔

اور شیخ ولی اللہ محدّث جو سلسلۂ احمدیہ کے خلفاء میں قابلِ اعتماد خلیفہ ہیں "ہمعات" میں راہِ جذب کے بیان کے بعد فرماتے ہیں:

اور جب وحدت کی یہ قسم سالک پر منکشف ہوگئی (یعنی فنائے تام کی منزل پہ پہنچ جائے) تو اس نے راہِ جذب طے کر لیا۔ خواہ توحیدِ وجودی کا معتقد ہو یا معتقد نہ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص (شہودی) پہلے توحیدِ صفاتی کو پالیتا ہے اور ایک زمانے کے

بعد اس منزل سے گزر کر توحیدِ ذاتی کے مقام پر پہنچتا ہے اور اس معاملہ کی توجیہہ اس طرح کرتا ہے کہ میں پہلے مغلوب ہو چکا تھا اور واجب کی عمومیت کو ممکن کی طرف نسبت کرتے ہوئے متحد سمجھا ہوا تھا۔ جیسا کہ کوئی شخص عالمِ خواب میں درندے کو مثلاً شیر، بھیڑیئے، ریچھ وغیرہ کو دیکھتا ہے۔ حالاں کہ وہاں کوئی درندہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کی قوتِ غضبیہ ہے جو درندوں کی شکل وصورت میں ظاہر ہوی ہے اور جب اس مقام سے ترقی کر گیا اور تنزیہ کے درجے میں پہنچا تو اس کو تشبیہ کے بھنور سے رہائی سمجھا اور دوسرے (وجودی) کو یہی صورت پیش آئی تو اس نے اس معاملہ کی توجیہہ اس طرح کی کہ یہ ظہور اور سریان امر محقق ہے اور وہ دوسری پوشیدگی صرف نظر میں پوشیدگی ہے۔

پھر شیخ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں :-

یہی طریق امر متفق علیہ ہے۔ اور اولیائے کاملین میں سے ایک ولی بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس راہ سے سلوک طے نہ کیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے درمیان اس کی تعبیر میں اختلاف ہو۔ سے

عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمیل یشیر

تیرا حسن تو ایک ہی ہے۔ ہماری تعبیرات مختلف ہیں لیکن ہر تعبیر اسی صاحبِ حسن وجمال کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

لیکن قوی المعرفت اور ذکی الذہن شخص ہی ان اولیائے کرام کے کلام کا خلاصہ سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا تعبیرات کے فرق واختلاف کو ان ہی حضرات کے خلاصۂ کلام کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔" شاہ صاحبؒ کی بحث مکمل ہوی۔

نیز مولانا فخر الدین میلاپوری مذکورہ اصل میں فرماتے ہیں :-

وحدتِ شہود کا معنی یہ ہے کہ ان وجوداتِ خاصہ کے درمیان کوئی جہت جامعہ نہیں ہے۔ بلکہ تمام وجودات حقائق مختلفہ ہیں اور تمام آثار فاعلِ حقیقی سے فیض پانے والے ہیں جو اس کی ذات کا مقتضاء ہے اور وہ فاعلِ حقیقی جمیع وجوہ سے ان وجوداتِ خاصہ کا غیر ہے۔ (پس وجودعام اور عالم کے درمیان نسبتِ تبائن ہوی۔)

لیکن اکابر اولیاء اللہ کو توحیدِ حالی کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ حضراتِ کرام آثار میں ان آثار کے فاعل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس یہ چیز عشق ومحبّت کے غلبہ واستیلاء اور غلو کی وجہ سے ہے۔ مثلاً کوئی شخص سورج کے دائرے پر نظر کرے یہاں تک کہ اس کی حسِ مشترک میں قرصِ شمس کی صورت مرتسم ومنقش اور مضبوط واستوار ہو جائے۔

پس وہ شخص اس کے بعد جس چیز کو بھی دیکھے گا تو اس کا پہلا مشہود قرص شمس ہوگا۔ پس وہ کہہ اٹھے گا۔ میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر اس کے قبل سورج کو دیکھا ہے۔

پھر جب بعض صوفیاء کی نظر اپنی ذات پر پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں سبحانی ما اعظم شانی۔ (میری ذات پاک ہے اور میری شان بڑی عظیم ہے۔) لیس فی جبتی سوی الشمس (میری قمیص میں سورج کے سوا کوئی نہیں ہے۔) اور بعض نے انا الشمس (میں سورج ہوں۔) کہہ دیا۔

عقل کی ضرورت اور بداہت سے معلوم ہے کہ شمس ہرگز اشیاء کا عین نہیں ہوا ہے۔ بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ وحدت الشہود کا یہی معنی لوگوں کی زبان پر مشہور ہے۔ لیکن میں ان اکابرین کے تعلق سے یہ گمان نہیں کرتا کہ انہوں نے اس طرح کہا ہوگا۔ بلکہ میرا گمان یہ ہے کہ کسی ایسے شخص نے کہا ہوگا جو ان کے مذہب کو قلم بند کرنے کے درپے تھا۔

اللہ تعالیٰ ہی ان کی مراد اور معنی کو بہتر جانتا ہے اس لیے کہ توحید حالی کو اگر وحدۃ الشہود کہا جائے اس پر اعتراض وارد ہوگا کہ بلا شبہ توحید حالی کا حاصل ہونا صرف خواص صوفیاء ہی کے لیے ہے اور یہ انتہائی کمال ہے جس پر تمام صوفیاء کا اتفاق ہے۔ پس اگر بات ایسی ہی ہو تو یہ بات لازم آئے گی کہ ان بزرگوں کے ریاضات و مجاہدات شہودِ غیر حقیقی کا ثمرہ دیں گے جو حسّی غلطیوں کی قبیل سے ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

ترجمہ: جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھا دیں گے۔

فحشاھم عن ذلک ترجمہ:۔ وہ بزرگ اس سے پاک ہیں۔

نیز مولانا فخری میلاپوری کے کلام کا خلاصہ یہ ہے جو انھوں نے اصل مذکور میں کیا ہے۔

وجودات خاصہ کے درمیان ایک جہت جامعہ ہے جس کو آپ چاہیں تو وجود منبسط بھی کہہ سکتے ہیں یا وجود عام بھی کہہ سکتے ہیں۔ وجوداتِ خاصہ کے ساتھ وجود منبسط کی نسبت اور اس کا ربط و تعلق اگرچہ بحکم و للّٰہ المثل الاعلیٰ محسوسات کی مثال سے اعلیٰ و ارفع ہے لیکن یہ مثال سمجھنے کے لیے (وجودات خاصہ کے ساتھ وجود منبسط کی نسبت اور اس کا ربط و تعلق) افراد میں صورت نوعیہ کے ظہور کے مانند ہے۔ یا موج و حباب کے ساتھ پانی کی نسبت کی طرح ہے۔ یا زیورات کے ساتھ سونے کی نسبت کے مثل ہے۔ یا برتنوں کے ساتھ مٹی کی نسبت کے مانند ہے۔ کیوں کہ مامن کثرۃ الا وقد ضبطھا الوحدۃ (کوئی کثرت ایسی نہیں جس کے ساتھ وحدت کا ربط و ضبط نہ ہو۔)

اور کل متعین مسبوق بالاتعین (ہر متعین مسبوق ہوتا ہے اور غیر متعین سابق) کے حکم کے مطابق تعین چاہیے۔ ضروری ہے کہ یہ وجوداتِ خاصہ، وجود منبسط کے اشراقات اور ظلال ہوں۔ یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجود منبسط کے تنزلات اور ظہورات ہوں یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجود منبسط کے تعینات اور تقییدات ہوں۔ اس کے لیے ساری تعبیرات کا خلاصہ یہ ہے کہ وجودِ منبسط اصل ہے اور وجوداتِ خاصہ جو حقائقِ اشیاء ہیں اس کی فروع ہیں۔ لہٰذا یہ خصوصیات قوالبِ موہومہ کی منزل میں ہوں گے۔ اور وجود منبسط کے سوا کوئی بھی ثابت اور متحقق نہیں ہے۔

کیوں کہ موجود کو جب ہم ماہیت سے الگ کرلیں اور وجود کو ماہیت سے کھینچ لیں تو اس وقت میں جمیع الوجوہ کوئی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پہ ہم مٹی سے ایک گھڑا بنالیں اور تصوّر میں گھڑے کی صورت کو مٹی سے جُدا کرلیں تو اس صورت کو کوئی تحقق اور ثبات نہیں رہتا اور وہ صورت ایک وہم سے زیادہ نہ ہوگی اور کوزے سے صورت کے انتزاع کے وقت جب ہم غور سے دیکھیں تو ہر اثر اور صورت مٹی ہی سے ہوگی۔ لیکن مٹی کثیر صورتوں کی متحمل ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو چار گوشہ یا کرّہ یا اور کسی دوسری شکل میں ڈھال سکتے ہیں۔ اور یہ تمام اشکال مٹی کے لیے قالب کی منزل میں ہیں۔ اور ہر ایک شکل اپنی ذات کی حد میں امر موہوم ہوتی ہے کہ مٹی کے ساتھ اس کو ایک نسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی نسبت کی وجہ سے مٹی کا نام سبو ہوجاتا ہے اور سبو کی خصوصیات اور احکام مٹی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پس صوفیاء جو کہتے ہیں کہ عالم وہم اور خیال ہے اور اعیان ثابتہ یعنی ممکنات کی حقیقتیں وجود کی بو باس بھی نہیں رکھتیں جیسی عبارتوں سے مراد یہ ہے کہ یہ عالم کی صورتیں ایسے وجود کے ساتھ موجود نہیں ہیں جو وجود منبسط کے علاوہ ہو۔ اور وجود منبسط ان تمام صورتوں کو شامل ہو۔ اور وجود حقیقی کی اضافت عالم کی صورتوں کی جانب محض وہم اور خیال ہو۔ اس معنی و مفہوم میں نہیں کہ حقائق اشیاء کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔

آگ، ہوا، پانی، مٹی، گھوڑا اور انسان کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور مکلّف کے لیے طاعت و معصیت، جزا و سزا اور جنّت و دوزخ نہ ہوگی۔ معاذ اللہ من ذلک

لیکن ان عبارتوں کی مراد، معانی کی دقت و باریکی کی وجہ اور عبارات کی ضیق و تنگی کے باعث کماحقہٗ واضح نہیں ہوتی اور مقصود کے خلاف ہونے کا وہم پیدا کرتی ہے۔

شیخ قدس سرہٗ کا یہ ارشاد حق محسوس اور خلق معقول ہے۔ اسی مقام کی خبر دے رہا ہے حاصلِ کلام! وجود حقیقی ایک فائض البرکات ذات ہوگی اور لاموجود الا اللہ متحقق اور ثابت ہوگا۔

مثنوی ۵

۱	عدم ہائیم ہستی ہائے ما	تو وجودِ مطلقی فانی نما
۲	نیست را نمود ہست آں محتشم	ہست را نمود و بر شکلِ عدم
۳	بحر را پوشید و کف کرد آشکار	باد را پوشید و نمودت غبار
۴	خاک را بینی بیالائے علیل!	باد را نی جز بتعریف و دلیل
۵	کف ہمی بینی روانہ ہر طرف	کف بجز دریا ندارد منصرف
۶	کف بحس بینی و دریا از دلیل	فکر پنہاں آشکارا قال و قیل
۷	نفی را اثبات می پنداشتیم	دیدۂ معدوم بینی داشتیم
۸	جرم سرگشتہ از ضلال	چوں حقیقت شد نہان پیدا خیال
۹	اے عدم را چون نشاندا اندر نظر	چوں نہان کرد آں حقیقت از بصر
۱۰	آفریں اے اوستادِ سحر باف	کہ نمودی معرضاں را دُرد صاف

ترجمہ :— ۱) ہم (درحقیقت) معدوم ہیں (مگر) موجود ہیں بظاہر تو (درحقیقت) سراپا وجود ہے (مگر) فانی جیسا (نظاہر)

۲ اس مہتمم بالشان ذات (اللہ تعالیٰ) نے معدوم کو وجودِ (ظاہری) بخشا اور موجود کو بہ شکلِ عدم بنایا یعنی نگاہوں سے اوجھل کر دیا ۔ ۳ ۔ سمندر کو چھپا دیا اور جھاگ کو ظاہر کیا ۔ (یاد رہے کہ سمندر صرف پانی کا نام نہیں ہے جو نظر آتا ہے) ہوا کو پوشیدہ کیا اور گرد و غبار کو تیرے (دیکھنے کے) لیے آشکار کیا ۔

۴ ۔ (اے بیمار آنکھ والے (اس گرد و غبار میں) تم صرف مٹی ہی کا اوپر سے نظارہ کر سکتے ہو نہ کہ ہوا کا ۔ ہوا کا وجود دلیل و تعریف کے بغیر ثابت ہے ۔ ۵ ۔ جھاگ کو (سطحِ آب پر) ہر سمت بہتے ہوئے تم دیکھ سکتے ہو ۔ جھاگ کے لیے سمندر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں ہے ۔

۶ ۔ جھاگ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے اور دریا دلیل کے ذریعہ جانا جاتا ہے ۔ فکر اور سوچ چھپی رہتی ہے مگر بحث و گفتگو سے ظاہر ہو جاتی ہے ۔

۷ ۔ ہم نفی کو اثبات سمجھ بیٹھے ہیں یعنی معدوم کو موجود سمجھ گئے ہیں ہم (حقیقت کو) نہ دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہیں ۔ (۸) بے شک ہم سراسر گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں ۔ جب حقیقت (آنکھوں سے اوجھل) ہو جاتی ہے تو وہم و گمان پیدا ہوتے ہیں ۔ (۹) اے شخص تو جب عدم کو نظر میں رکھا یعنی اپنے معدوم ہونے کا احساس تجھے نہیں رہا (اور) جب وہ حقیقت (مطلق) تیری نگاہ سے پوشیدہ ہو گی یعنی تو خدا کے وجود کو فراموش کر بیٹھا (تو تیرا وہی حال ہو گا جس کا ذکر اوپر آیا ہے ۔) (۱۰) مبارک ہو اے استادِ فن کہ تو نے منہ موڑنے والوں کے لیے تلچھٹ پاک کیا ہے یعنی تو نے کبھی بھی حقیقت آشکار نہیں کی اور معاملہ صاف نہیں کیا

اس کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ امام ربانی نے مکتوبات کی جلد اول کے ۱۶۰ ویں مکتوب میں جو بحث کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ :-

مشائخ طریقت تین گروہ میں منقسم ہیں ۔ پہلا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم حق تعالیٰ کی ایجاد سے خارج میں موجود ہے اور اس کے اندر اوصاف کمال میں سے جو بھی ہے تمام کا تمام حق تعالیٰ کی ایجاد سے ہے ۔

دوسرا گروہ عالم کو حق تعالیٰ کا ظل اور سایہ جانتا ہے لیکن یہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم، خارج میں موجود ہے لیکن وہ ظلّیت کے طریق پر ہے۔ اصالت کے طریق پر نہیں اور عالم کا وجود، حق تعالیٰ کے وجود سے قائم ہے۔ جیسے سایہ کا قیام۔ اصل کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ یعنی خارج میں بس ایک ہی موجود ہے اور عالم کے لیے خارج میں کوئی تحقق اور ثبات نہیں ہے۔ یہ گروہ بھی عالم کو حق تعالیٰ کا ظلّ کہتا ہے اور یہ طبقہ واصلین، کاملین کا ہے۔ حسبِ تفاوت درجات وصل و کمال

امام موصوف کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

پہلے گروہ کو ایجادیہ کہتے ہیں اور یہ طبقہ متکلمین کی طرح "ہمہ از وست" کا قائل تھا اور مخلوق وخالق، مصنوع و صانع، نقش و نقاش، کوزہ و کمہار اور تصویر و مصور کی طرح جانتا تھا۔

دوسرے گروہ کو شہودیہ کہتے ہیں اور یہ "ہمہ بدوست" کا قائل ہے اور مخلوق و خالق کو عکس و شخص کی طرح جانتا ہے۔ جیسا کہ عکس شخص کے بغیر قائم نہیں رہتا، اسی طرح عالم، حق تعالیٰ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

ان دونوں گروہوں کے نزدیک وجود ممکن ، جمیع وجوہ سے وجود واجب (حق تعالیٰ) کا غیر ہے۔

تیسرے گروہ کو وجودیہ کہتے ہیں اور یہ "ہمہ اوست" کا قائل ہے۔ پہلا گروہ صرف ایجاد کا قائل ہے، دوسرا گروہ ایجاد کے اقرار کے یا وجود انعکاس کا قائل ہے اور تیسرا گروہ ایجاد و انعکاس کے اقرار کے ساتھ ساتھ صورتوں میں وجود کی معیت کا قائل ہے اور اس کے نزدیک وجود کے انضمام کے بغیر صورتوں کے لیے کوئی ظہور اور کوئی نشان اور علامت نہیں ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ:

وجودیہ کے نزدیک وجودات خاصہ کے درمیان ایک جہتِ جامعہ ہے اور یہی وجود عام ہے اور یہ وجود عام (حق تعالیٰ) جوہر قیوم اور جنسِ اعلیٰ ہے اور وجوداتِ خاصہ اپنے جمیع اجزاء کے ساتھ وجود واحد کی ذات میں اعراض مجتمعہ ہیں اور اس جنسِ اعلیٰ (وجود عام) کی نسبت وجودات خاصہ کے ساتھ مشہور چار نسبتوں میں سے عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔

اور شہودیہ ایجادیہ اور بہت سارے متکلمین کے نزدیک وجوداتِ خاصہ کے درمیان کوئی جہتِ جامعہ نہیں ہے اور اس جنسِ اعلیٰ (وجود عام) کی نسبت وجودات خاصہ کے ساتھ مذکورہ

نسبتوں میں سے نسبت تباین ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ علمائے ظاہر کے نزدیک عالم، وجود اصلی کے ساتھ موجود ہے۔ اور علمائے باطن کے نزدیک خواہ وجودی ہوں یا شہودی عالم، وجود ظلی کے ساتھ موجود ہے۔ امام ربانی اور شیخ ابن عربی دونوں وجود اصلی کی نفی میں متفق ہیں اور وجود ظلی کے اثبات میں بھی متفق ہیں اور وجودِ ظلی کو وہم اور خیال تصور کرتے ہیں اور خارج میں احدیت مجردہ کے سوا کسی کو موجود نہیں مانتے ہیں۔ امام ربانی وجودِ ظلی کو خارج میں ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے مکتوبات کی جلد دوم کے پہلے مکتوب میں لکھا ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ موجود ظلی کے مسئلہ میں امام ربانی کے اقوال اور آراء مختلف ہیں مکتوبات کی جلدِ دوم کے مکتوبِ اول وغیرہ میں لکھتے ہیں کہ:۔ عالم، وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی ہے۔ اور مذکورہ جلد کے ۴۴ ویں مکتوب اور دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ عالم، ایک وہم محکم اور خیالِ استوار کے ساتھ موجود ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کے تعلق سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "مکتوب مدنی" میں فرماتے ہیں:۔

عالم کے بارے میں مجدد الف ثانی کے اقوال اور آراء مختلف ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ عالم وجود ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہے۔

ایک دوسرا قول یہ ہے کہ عالم، وہم اور خیال میں موجود ہے۔ مگر اتنی بات ہے کہ اللہ تعالے نے اس مرتبہ میں عالم کو استواری اور مضبوطی عطا کی ہے جس کی وجہ سے وہ وہم محکم اور خیال استوار ہو گیا۔

نیز مکتوبِ مذکور میں فرماتے ہیں:۔

اسی طرح مجدد الف ثانی کے اقوال اور آراء کا یہ اختلاف کہ بے شک عالم، وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی و ہم محکم نفع والا اختلاف ہے، جب کہ مقصود یہ ہے کہ بے شک موجودات خاصہ اس طرح متحقق اور ثابت ہیں کہ ان سے ان کے آثار ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ خواہ آپ اس ثبات و تحقق کو وجود خارجی سے موسوم کریں یا اس کو وہم محکم اور خیال استوار سے تعبیر کریں، دونوں برابر ہیں۔

اور اگر آپ مجھ سے حق خالص سے متعلق سوال کریں تو میں یہ کہوں گا کہ بے شک ذاتِ الٰہیہ

جس طرح کہ وہ ہے۔ بہت ہی جلیل اور عظیم ہے اس سے کہ وہ خارج میں ہے یا اعیان میں۔ اس لیے کہ خارج نفسِ رحمانی کا نام ہے اور اعیان میں کہنا بھی خارج کے طرف اشارہ ہے۔
ہاں! حق تعالیٰ کے لیے خارج میں تجلّی عظیم ہے۔ اسی تجلّی کی شرط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خارج میں یا پس پردہ ہونے کی صفت سے متصف ہوتا ہے۔
اور اگر آپ مجھ سے ان سارے اقوال سے متعلق سوال کریں گے تو میں ان کا انکار نہیں کروں گا مگر تعبیر کی جہت سے یا شئی کو غیر موزوں اور غیر محل میں ذکر کرنے کی جہت سے انکار کروں گا، ورنہ صاحبِ کشف ایسی چیز بیان نہیں کریں گے جس کی اصلاً کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔
نیز جاننا چاہیے کہ شیخ ابنِ عربی اور امام ربانی کے درمیان اسماء کی اصلیت اور ممکنات کی فرعیت کے مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے اور ان دونوں اکابرین کا وجدان اور فہم ایک ہی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک بزرگ نے اس مقدمہ کو دوسری عبارت سے تعبیر کیا ہے۔ اور امام ربانی نے سہو بشری اور ذہول علمی کی وجہ شیخ ابنِ عربی کی عبارت کو اپنے فہم و وجدان کے خلاف محمول کیا ہے۔
یہی وہ مقام ہے جس کی وجہ سے شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی "مکتوبِ مدنی" میں اس طرح وضاحت فرماتے ہیں کہ :-
جو شخص اس مرتبہ میں اسماء کی اصلیت اور ممکنات کی فرعیت کی تعبیر کا ارادہ کیا ہے اس کے لیے دو عبارتیں ہیں۔ اور وہ دونوں بھی صحیح ہیں۔
شیخ ابنِ عربی کی تعبیر یہ ہے کہ حقائق ممکنات یہی اسماء اور صفات ہیں جو علم میں متمیز اور متفاوت ہیں۔
اور امام ربّانی کی تعبیر یہ ہے کہ حقائق ممکنات عکوس ہیں۔ ایسے اسماء اور صفات کے جو اعدام میں منطبعہ ہیں۔ یہ ایسے اعدام ہیں جو اسماء کے مقابل ہیں۔
اور ان دونوں تعبیرات کے اندر صرف معمولی سا فرق ہے اور اشیاء کی حقائق ماھی علیہ کی تفتیش کے وقت اس کی پرواہ نہیں کی جاوے گی۔
اور امام ربانی کی تعبیر (ان حقائق الممکنات عکوس الاسماء والصفات المنطبعۃ فی الاعدام المقابلۃ) شیخ ابن عربی اور اُن کے متبعین کی تعبیر کی مخالف نہیں ہے۔
اس معنی و مفہوم میں شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین کی تصریحات اور تلویحات کثرت سے موجود ہیں اور

ہم نے مسئلہ کی مختلف وجوہات کی جانب اشارہ کردیا ہے۔ لہٰذا شیخ کے کلام کو نقل کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے اور ان کی تصریحات کو مسلسل نقل کرکے بحث کو طویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے

اور شیخ ابنِ عربی کی یہ تعبیر (حقائق الممکنات ھی الاسماء) اس مفہوم میں ہے کہ اسماء ہی وجود میں اصل ہیں۔ اور ان کے لیے طرفِ مقابل میں ظلال وعکوس ہیں جن کو اعیانِ ممکنات سے موسوم کیا جاتا ہے یا اس مفہوم میں ہے کہ بے شک عارف کے لیے اسماء میں سے ایک رب ہے اور وہی عارف کی حقیقت ہے جس کی جانب عارف رجوع کرتا ہے۔

یہ مفہوم امام ربانی کی تعبیر کے خلاف نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں تو امام ربانی کے کلام سے ان کے کلام پر بہت ساری دلیلیں قائم کردیں۔

امام ربانی کے کلام کا عمل یہ ہے کہ انہوں نے شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین کے بعض مقالات کو دیکھا اور اپنے وجدان وفہم کے خلاف پر محمول کردیا اور یہ لغزشِ علمی و ذہول فہمی ہے منزلِ کشفی نہیں۔ علمائے کرام علمی لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ نہیں ہیں اگر ان کے کلام میں بھی کچھ علمی لغزشیں اور فہمی خطائیں پائی جاتی ہیں تو ان امور کی وجہ سے ان کے مراتبِ بلند درجاتِ علیا مجروح نہیں ہوسکتے۔ شاہ ولی اللہ کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

اصحابِ عقائد نے کہا ہے کہ مجتہد سے خطا اور صواب دونوں کا صدور ہوتا ہے۔ جب علامۃ امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان اور تمام عظیم الشان مجتہدین کی خطا اور ان کے درجاتِ علیا اور مقاماتِ رفیعہ کے لیے کوئی نقصان اور ضرر کا باعث نہیں بن سکتی ہے تو امام ربانی جو مقلد حنفیہ ہیں، کی خطا اور غلطی ان کے مقام رفعت کے لیے کیوں کر نقصان اور ضرر کا باعث ہو سکتی ہے۔

حاصلِ کلام!

وجودیہ اور شہودیہ کے درمیان کثیر مباحثات ہیں اور ان مباحث میں طویل مقابلے ہیں جن کی ترجمانی یہ مختصر کتاب نہیں کرسکتی۔

تفتیش و تنقیح اور بحث ومباحثہ کے بعد واقعی جب عالم ہر دونوں (شہودیہ اور وجودیہ) کے نزدیک موجود ظلی ہے (موجود اصلی نہیں) تب تو ہر دونوں کی جائے رجوع اور مطمح نظر ایک ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب "مکتوب مدنی" میں یہ فیصلہ فرماتے ہیں:۔

ہمارے نزدیک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مکشوف پوری طرح صحیح ہیں لیکن اس قول کو وحدۃ الشہود ان العالم عکوس الاسماء والصفات انطبعت فی مرایا اور عدم المقابلۃ

تنزلکِ الاسماء والصفات)

شیخ ابن عربی نے امام ربانی کی تعبیر کو غلطی اور سہو پر محمول نہیں کیا ہے۔ بلکہ شیخ ابنِ عربی اور ان کے متبعین حتیٰ کہ حکماء نے بھی سہو پر محمول نہیں کیا ہے۔ اور یہ بات اس لیے ہے کہ اس تعبیر کا خلاصہ مجازات اور استعارات (جو صعوبتِ فہم اور دقتِ فکر کو واجب کر دیتی ہیں) کی تخلیص اور تہذیب کے بعد یہ ہے کہ حقائقِ امکانیہ انتہائی ضعیف اور انتہائی ناقص ہیں۔ اور حقیقتِ وجوبیہ انتہائی کامل اور انتہائی قوی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ممکن ہے کہ حقائقِ امکانیہ کے تعلق سے یہ بات کہی جائے کہ بے شک وہ (حقائقِ امکانیہ) اعدام ہیں۔ جس میں وجودات (اسماء) کی صورتیں ظاہر ہوئیں اور یہ قول متفقہ علیہ ہے جس میں کسی قسم کا اخفاء اور اشتباہ نہیں ہے۔

وحدۃ الوجود کے مسئلہ میں اور بھی دوسری تفصیلات ہیں جن کو فقیر (مصنفِ فصل الخطاب) کے فتویٰ "غایۃ التحقیق" میں دیکھ سکتے ہیں۔

نیز یہ بھی جان لینا چاہئے کہ وجودیہ، شہودیہ، ایجادیہ اور علم کلام کے علماء یہ تمام اہل سنّت جماعت میں شامل ہیں۔ اور اہل سنّت کے اختلافات میں ایک دوسرے پر عیب اور نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیے زبانِ نبوت نے ارشاد فرمایا علماء کا اختلاف رحمت ہے۔ اور اہلِ سنّت کے ہر مکتبۂ فکر کے افراد کو اُن کے موقف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا : تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ تم میں کون زیادہ ہدایت کی راہ پر گامزن ہے۔ ان اختلافات میں مجتہد ہی کو کسی ایک جانب کے حق و صواب ہونے کا یقین نہیں ہے تو ایک مقلد کو یہ بات کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس موضوع کی تفصیل پانچویں مقدمہ میں دیکھی جائے۔ اس اختلافی مسئلہ میں بعض لوگ علمائے کرام اور صوفیائے عظام پر جو لعن وطعن کر رہے ہیں اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔

نیز یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ "الطاف القدس" کے مصنف شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے شاگردِ رشید شاہ شرف الدین صاحب مصنف "قول الفصل" قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں وجودیہ کی غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے "ہمہ اوست" کہہ دیا۔ پھر عبودیت اور ربوبیت کے لوازم کے درمیان یہ فرق اور دوری دیکھی تو حیران رہ گئے۔ اس غلطی کا حل دو سہو کے بیان پر موقوف ہے۔

ایک سہو جو وجود عام کے ساتھ وجوداتِ خاصہ کی نسبت کی معرفت میں ہوا اور دوسرا سہو جو

ذاتِ بحت کے ساتھ وجود عام کی نسبت کے درمیان ہوا۔

سہو اول کا بیان یہ ہے کہ ظہور ایک نسبت ہے ظاہر اور مظہر کے درمیان اور اس نسبت کا حکم ساری نسبتوں کے حکم کے علاوہ ہے۔ کیوں کہ ظاہر جمیع اعتبار سے مظہر کا عین نہیں ہے اور جمیع اعتبار سے مظہر کا غیر بھی نہیں ہے۔ نوع انسان کے مانند بہ نسبت افراد انسان۔

اگر نوع (مثلاً حیوانِ ناطق) من جمیع الوجوہ اس فرد (مثلاً زید) کا عین ہوتا تو چاہیے کہ یہ فرد (زید) دوسرے فرد (بکر) پہ محمول ہو جائے۔ جیسا کہ نوع محمول ہوتا ہے۔ اور اگر نوع من جمیع الوجوہ اس فرد کا غیر ہوتا تو ھذا انسان صحیح نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ ھذا حجر صحیح نہیں ہے۔ نوع انسان و نوع فرس، حیوان کی بہ نسبت ؏ اور حیوان و شجر نامی کی بہ نسبت اور نامی و جماد جسم کی بہ نسبت اور جسم و مجرد، جوہر کی بنسبت اور جوہر و عرض وجود عام کی بنسبت یہی حکم رکھتے ہیں۔ لہذا یہ امر بدیہی ہے کہ ان مواضع کے اندر حمل کے مصداق اور تغائر کے مصداق ہر دونوں پائے جاتے ہیں۔ اور اس صورت میں ہر دو قبیل کے احکام کی گنجائش ہوتی ہے۔

عقولِ قاصرہ کبھی ان کو (مصداق حمل و تغائر) من جمیع الوجوہ عینِ شئی کی قبیل سے قرار دیتی ہیں (جیسے ملاحدہ) لیکن جب عینیت کے لوازم نہ پائے جائیں تو اس عقیدہ کو توڑ دیتی ہیں اور کبھی ان کو من جمیع الوجوہ غیر کے قبیل سے قرار دیتی ہیں (جیسے اکثر متکلمین) لیکن جب غیریت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو حیران رہ جاتی ہیں۔

عقول سلیمہ جانتی ہیں کہ عینیت اور غیریت کی نسبت کے علاوہ ایک نسبت ہے جو اشیاء کی خصوصیات سے پیدا ہونے والی ہے۔ ان کے اثر سے وجودِ عام کا دامن پاک و صاف ہے۔ جیسے جلد کی سیاہی قد کی کوتاہی اور زبان کی لکنت نوعِ انسان کو ملوث نہیں کرتی۔ ہر چند کہ کالا شخص، پست قد اور صاحبِ لکنت انسان ہی ہے۔ اور جو بھی چیز من حیث المطلقیت، اطلاق کے مرتبہ سے ظاہر ہو جائے تو اس کو خصوصیات کے ساتھ اس کو منسوب نہ کرنا چاہیے۔

جیسا کہ نوع (حیوان ناطق) ہونے، کلی ہونے اور مطلق ہونے کو اس فرد (زید) کے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ مطلق (حیوان ناطق) مقید (زید) میں ہے۔ جب ان انواع مختلفہ کے اندر خواص متنوعہ ہاتھ لگ جاتے ہیں تو عقل امور متغائرہ کو دلیل بنا کر الاشیاء تعرف باضدادھا کے حکم کے مطابق مختلف انواع کے ثبوت کا یقین کر لیتی ہے۔ اور ہر ایک نوع کو دوسری نوع سے جدا کر لیتی ہے۔ برخلاف وجود عام (حق تعالیٰ) کے کہ اس کا غیر معقول اور محسوس نہیں ہے کہ اس کے اندر

عقل تصرف کر سکے اور پھر غیر سے پہچان سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ لطافت میں لطافت اور بساطت میں بساطت ہے حیرت کے سوا عقل کو کوئی شئے میسر نہیں ہوگی۔

اسی لیے فلاسفہ نے جوہر اور عرض کے درمیان حقیقتِ مشترکہ کا اثبات نہیں کیا ہے اور وجودِ عام کو جنسِ اعلیٰ نہیں شمار کیا ہے۔ اس کا سبب فلاسفہ کی عقل کے نزدیک وجودِ عام کا عدم حضور ہے۔ ہم خود جانتے ہیں کہ ایک حقیقت دو جسم کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ کبھی قیام کے لباس میں بذاتِ خود ظہور کرتی ہے اور جوہر کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اور کبھی قیام کے لباس میں اپنے غیر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور عرض کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی معنی کی رنگینیوں اور عجائب میں سے یہ بات ہے۔ عالم مثال (علم) میں جوہر کا (شبیہ) اعراض ہونا۔

اور خیال کی منزل میں جوہر (کوہ محسوس) کا عرض (کوہِ معلوم) ہونا اور موجود خارجی پر صورتِ ذہنیہ کا صادق آنا۔ (اس طرح کہ یہ یہی ہے جس کو میں فراموش کیا تھا۔) اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں ہیں جو مخفی اور مستور نہیں۔

لیکن اصحابِ ذوق، ذوق کے حاسہ سے بطریقِ حضور شئی لذاتہٖ (جیسے ہم خود اپنے آپ کو دیکھیں) شئی کا ادراک کر لیتے ہیں اور بطریقِ حضور شئی بذاتہٖ (جیسے ہم سورج کی روشنی میں پہاڑ کو دیکھیں شئی کا ادراک کر لیتے ہیں۔ بطریقِ حضور شئی فی ذاتہٖ (جیسے آئینہ میں تعیناتِ خارجیہ) شئی کا ادراک کر لیتے ہیں۔ اور حقیقت کو کئی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے جانتے ہیں اور اس کے ذریعہ اشیاء کے ناآشنا سے آشنا ہوتے ہیں۔ غرض ظاہر و مظاہر میں ظہور نسبت کا کچھ حصہ اصحابِ ذوق کی عقل میں پایا جاتا ہے۔

سہوِ ثانی کا بیان یہ ہے کہ وجودِ عام اور ذاتِ بحت کے درمیان ایک معلوم الانیت اور مجہول الکیفیت نسبت ہے۔ جمیع وجوہ کے ساتھ نہ تنزل ہے اور نہ جمیع وجوہ کے ساتھ ظہور ہے۔

پس ان حقائق سے ہر حقیقتِ مفصلہ کے ثبوت پر جو بھی اشکال پیدا ہوتا ہے وہ اس جگہ (یعنی وجودِ عام اور ذاتِ بحت کے درمیان نسبت کی جگہ) سننے کے قابل نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس مرتبہ میں داخل کرنے کے قابل ہے۔

حضرات صوفیا (میں) سے ایک جماعت نے جب اپنی ذات میں دیکھا تو ان کو وجودِ عام مشہود ہوا۔ جس کو انہوں نے وجود سے تعبیر کیا۔ اور انہوں نے اس میں اس درجہ لطافت اور بساطت کو پا لیا جو عقل و دانش کے دائرہ میں سما نہیں سکتی تو اسی کو مبدأ المبادی (حق تعالیٰ) یقین کر لیا۔

اوران کو لطافت و بساطت سے جو کچھ بھی حاصل ہوا اسی وجود پر منطبق کر دیا۔ اوراس معرفت میں ابدالدہر رہ گئے اور حقیقت کو نہیں جان سکے۔ ع ہنوز ایوانِ استغنا بلند است ۔ ایوانِ استغنا ابھی تک بلند ہے ۔

جو بھی شخص علامہ قیصری کے مقدمہ کا مطالعہ کرے گا وہ اس مذہب کو بخوبی جان لے گا۔ اس غلطی کا سبب وجود عام پر رک جانا ہے اوراس کے کئی وجوہ میں سے ایک وجہ پر اکتفا کر لینا ہے۔ اوراس کی حقیقت اور ماہیت تک رسائی حاصل نہ کرنا ہے۔ اگر وجود عام کی کنہہ اور ماہیت تک رسائی حاصل کر لیتے تو اس کو مبداء المبادی نہیں کہتے۔

صوفیاء کی ایک جماعت (مانند شیخ ابن عربی اور شیخ صدرالدین قونیوی) کا وجود عام کے ماوری پر کبھی گزر ہوا تو انہوں نے ذات بحت کو مبدأ المبادی اور اول الاوائل سمجھ لیا۔ اور وجودِ عام کو صادر اول اور موجودات کی شکلوں اور صورتوں کو وجود منبسط کہہ دیا۔ لیکن احکامِ تفصیلہ کے معاملہ میں وجود عام اور ذاتِ بحت دونوں کو خلط ملط کر دیا۔ اور ایک ہی نام (یعنی اسم موجود) سے موسوم کر دیا۔ اور تسامح اور تساہل کی وجہ سے ہر ایک کے احکام کی تعبیر کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔

بعض حقائق کو بعض کے ساتھ خلط ملط کر دینا اور شئی الطف کو اپنے مقام سے ہٹا دینا! اور کئی حقائق کو ایک ہی اسم سے موسوم کرنا صوفیاء کی قدیم رسم ہے۔ ولیس ھذا اول قارورۃ کسرت (محاورہ ہے: یہ پہلی بوتل نہیں جو توڑ دی گئی ہو) یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اس جماعت کے بعض متبعین حضرات (مثلاً تحفۃ المرسلہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنف اور مولانا عبدالرحمان جامی وغیرہ) کو اس تسامح اور تساہل کی وجہ سے ایک اشتباہ واقع ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ خیال کیا کہ وجود ایک ہی ہے جو اعتبارات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو گیا۔ مختلف حقائق کے ساتھ تعلق کی وجہ سے وجود عام ہے اور صرافت کی وجہ سے ذات بحت ہے۔

اس اشتباہ کی وجہ عدم تفرقہ ہے۔ اس نسبت کے درمیان جو مختلف حقائق کو وجود عام کے ساتھ ہوتی ہے اوراس نسبت کے درمیان جو وجود عام کو مبدأ المبادی کے ساتھ ہوتی ہے۔

اور ایک گروہ (شہودیہ) جس کا ذوق اور وجدان تجلی اعظم سے پیوستہ تھا برہان عقلی کے ذریعہ صفاتِ تنزیہ کو واجب میں اثبات کیا ہے (جیسے متکلمین) یا شرائع کی تقلید میں صفات تشبیہ اعتقاد کیا ہے۔

ان خواص کو نہ وجود عام میں پائے اور نہ اس چیز میں جو اہل معرفت نے ذات بحت کے لیے
درمیان میں لاکر اس کا مصداق سمجھے ان دونوں نسبتوں کے انکار کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔
اتنی بات ثابت شدہ سمجھے کہ ذات بحت کے ساتھ تجلّی اعظم کے انتساب کے اعتبار سے اور
ذات بحت ان انوار و عکوس کہ ساتھ جو تجلّی اعظم سے پھیلے ہوئے ہے بہت سارے احکام رکھتی ہے۔
اور شرائع میں انھیں احکام کا بیان ہوتا ہے اور وجدان، برہان اور تقلید شرائع کو اس
میدان سے باہر گذر نہیں ہے اور ان کے نزدیک ان کے ماوراء کی کوئی خبر نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقتہ
الامور۔ شہودیہ اور وجودیہ کی بحث کا خلاصہ مکمل ہوا۔

مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات

مولانا ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ صاحب افسر شفاء حسینی گلبرگہ

نام تیرا لے رہا ہوں اے رحیم	یہ میرا پیغام لے جا اے نسیم
یا وَدُودُ یا وَدُودُ یا وَدُود	ذرّہ ذرّہ میں ہے تیرا ہی وجود
یا قَدِیرُ یا قَدِیرُ یا قَدِیر	مال و دولت میں ہو دل میرا فقیر
یا کَرِیمُ یا کَرِیمُ یا کَرِیم	دین و دنیا میں نہ رکھ مجھ کو سقیم
یا عَزِیزُ یا عَزِیزُ یا عَزِیز	رکھ مجھے ہر حال میں اپنا عزیز
یا جَلِیلُ یا جَلِیلُ یا جلیل	جاہ و عظمت میں بنا اپنا خلیل
یا حَسِیبُ یا حَسِیبُ یا حَسِیب	کر بلند ہر حال میں میرا نصیب
یا وکیلُ یا وکیلُ یا وکیل	ہر قدم پہ تو رہے میرا کفیل
یا عَفُوُّ یا عَفُوُّ یا عَفُو	کرم سے کر سارے گناہوں کو عفو
یا سَمِیعُ یا سَمِیعُ یا سَمِیع	سمع و طاعت میں رہوں تیرا مطیع
یا عَلِیمُ یا عَلِیمُ یا عَلِیم	علم مجھ کو کر عطا تو اے علیم
یا لطیفُ یا لطیفُ یا لطیف	سب گناہوں سے الٰہی کر عفیف
یا قَوِیُّ یا قَوِیُّ یا قوی	دم بدم ایمان ہو میرا قوی
یا بَصِیرُ یا بصیرُ یا بصیر	علم و عرفاں کر عطا مجھ کو خبیر

یا حکیمُ یا حکیمُ یا حکیم
مانگ خالق سے تو اے افسر حکیم!

مرسلہ: حافظ محمد سہیل جنیدی، گلبرگہ
متعلم نمرۂ ثانیہ۔ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

چالیسواں فائدہ

تیرھویں صدی ہجری کے اہلِ علم میں سے چند علماء جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔

کیا عرفاء کرام اور کیا علمائے عظام اور کیا شیعہ حضرات اور مشہور حکماء وحدۃ الوجود کے قائل ہزاروں ہیں۔ جن میں سے چند اکابرین کی تفاصیل مولانا فقیہہ علی مہایمی کی کتاب "اجلۃ التائید شرح ادلۃ التوحید" اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتاب "نفحات" اور مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب "اخبار اخیار" اور مولانا شاہ عبدالقادر فخری کی کتاب "اصل الاصول" اور ان کے علاوہ دوسرے اہلِ قلم حضرات کی تصانیف میں تلاش کیجیے۔

قائلانِ وحدۃ الوجود کے اقوال و آراء کی کثرت ان کے نقل میں مانع ہو رہی ہے۔ لہذا ناچار یہ فقیر بعض علمائے کرام متاخرین کے چند اقوال اس کتاب کے آخر میں نقل کر رہا ہے جو تیرھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

بحرالعلوم ملک العلماء مولانا عبدالعلی "شرح سلّم" میں فرماتے ہیں کہ

"ہم اس کتاب کو اس حکمت حقہ کے ذکر سے منوّر کرتے ہیں جو پیغمبروں اور سچی خبر دینے والے رسولوں پہ وحی کی گئی تھی اور اولیاے عظّام پر جن کا انکشاف کیا گیا ہے۔ معلوم کر رکھو کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ موجود ہے اور وجود بحت ہے۔ اور بالذات موجود ہے۔ اور اللہ کے ماسوا کسی شئی کا وجود نہیں اور پورے موجوداتِ عالم اللہ تعالیٰ کے تشبیون اور تعینات ہیں۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ کا ظہور ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ واجب بھی ہے اور جاعل بھی اور سارے متعینات ممکن اور مجعول ہیں۔ پس کثرت میں واحد کا ظہور ہوا ہے۔ اور کثرت صرف بالاعتبارات تعین واحد کی مغائر ہوتی ہے اور اعتبارات کثرت کا وجود بھی تعین واحد سے ہی مستعار ملا ہوا ہے اور موجود درحقیقت اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہی ہے۔ اور ....

اللہ سبحانہٗ وجود مطلق ہے۔ لیکن ان معنوں میں نہیں کہ اطلاق اللہ سبحانہٗ کے لیے قید بن جائے۔ وہ نہ کلی ہے اور نہ جزئی اور نہ ہی کثیر اور نہ ہی اس کے سوا اس کے ساتھ کوئی شئی ہے اور نہ ہی وجود میں اس

کا کوئی شریک ہے، وہی ہے حق اور فی حد ذاتہٖ منزہ اور واجب لذاتہٖ ہے اور وہ خالق مشبہ ہے تعینات عدمیہ کے ساتھ اور نہ واجب، ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی ممکن واجب۔ پس اللہ تعالیٰ تشبیہ اور تنزیہ دونوں کا جامع ہے۔ وہ فقط منزہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اشعریہ کا مذہب ہے۔ اس لیے کہ یہ تقید ہے اور وہ فقط مشبہ بھی نہیں ہے جیسا کہ مجسمہ کا مذہب ہے۔ اس لیے کہ یہ تحدید ہے اور اللہ تعالیٰ تقید اور تحدید دونوں سے بری ہے۔

سید الاولیاء، رئیس الاتقیاء، امام المتقین زمین پر اللہ کے خلیفہ، طالبین کے ہادی شیخ اکبر ولایتِ محمدیہ کے خاتم شیخ محی الملۃ والدین ابنِ عربی قدس سرہٗ نے اللہ تعالیٰ ان کے کلام کی لذت سے ہمیں بہرہ ور کرے۔

"اگر تم صرف تنزیہ کے قائل ہو تو تم اللہ تعالیٰ کو قید سے مقید کر دو گے یعنی خدا کے ظہور کے منکر بن جاؤ گے۔ حالاں کہ خدا نے خود اپنے آپ کو ظاہر کی صفت سے متصف کیا ہے۔ اگر تم صرف تشبیہ کے قائل ہو جیسا کہ مجسمہ کا عقیدہ ہے کہ خدا مجسم و مشبہ ہے تو تم خدا کی حد بندی کر دو گے حالاں کہ خدا کسی بھی حد بندی میں محدود نہیں ہے۔

اگر تم تنزیہ اور تشبیہ دونوں کے قائل ہو یعنی عین تشبیہ میں خدا کے منزہ ہونے اور عین تنزیہ میں مشبہ ہونے کے قائل ہو تو تم معرفت الٰہی میں صائب الرائے بن کر امام اور سردار کہلاؤ گے۔

ایسے میں تم یہ کہنے کے قابل بن جاؤ گے کہ جو بھی شخص اللہ کے وجود کے لیے جوڑ ٹھہرائے گا یعنی وہ اس بات کا قائل ہو کہ وجود متعدد و متبائن ہیں۔ اللہ کے لیے ایک وجود علاحدہ ہے اور ممکن کے لیے ایک وجود علاحدہ ہے تو اس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا، لہذا وہ مشرک ہے اور یہ شرکِ خفی ہے اور جو شخص اس لیے وجود کے واحد و فرد ہونے کا قائل ہو کہ وجود نفسِ ذاتِ حق ہے اور واحد ہے اور اس کے مظاہر کی کثرت اس کی وحدت کے منافی نہیں ہے تو وہ شخص موحد ہے۔

تم اس قسم کی تشبیہ سے بچنا کہ خود کو ایک موجود اور خدا کو موجود دوم سمجھو بلکہ مظاہر مشبہ میں تشبیہ کے قائل ہونا چاہیے اور اگر تم مفرد ہو یعنی تشبیہ کو تنزیہ سے الگ کرنے والے ہو تو ایسی تنزیہ سے خود کو بچائے رکھو۔ ماحصل یہ کہ تمہیں عین تشبیہ میں تنزیہ کے اور عین تنزیہ میں تشبیہ کے قائل ہونا چاہیے۔

تم عین حق نہیں ہو اس لیے حق وجودِ مطلق ہے اور تم مقید و متعین۔ ظاہر ہے کہ مقید مطلق کا عین نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تم عینِ حق ہو بحسبِ حقیقت، اس لیے کہ حق تمہارے اندر متعین ہے اور تم حق کو عین موجودات میں سہل طور پر تعین کی قید سے بری بھی اور متعین میں ظاہر بھی دیکھتے ہو۔ انتہیٰ کلامہ الشریف

آپ کا قابلِ شرف کلام پورا ہو گیا۔

منکرین کا کہنا ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود متعدد وجوہ سے خلاف عقل ہے۔ اولاً یہ کہ اس سے واجب اور ممکن کا اتحاد لازم آتا ہے جو یقیناً محال ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے تمام موجودات کا حقیقت میں متحد ہونا لازم آتا ہے جو یقیناً محال ہے۔ ثالثاً یہ کہ اس سے کثرت میں واحد کا ظہور ہونا لازمی آتا ہے اور بہ بداہتہً محال ہے۔

ان اشکلات واحتمالات کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اولاً تو یہ مسئلہ انبیائے کرام کے نزدیک وحی کے نور سے اور اولیائے کرام کے نزدیک مکاشفہ کے نور سے منکشف ہوا ہے۔ لہٰذا عقلِ متوسط کی مخالفت میں اصل مسئلہ کو کوئی ضرر نہیں، لیکن عقلِ نورانی اس کی مخالفت نہیں کرتی۔ ثانیاً وجوب مطلق مع امکان افراد کے لیے کئی شواہد ہیں۔ جس طرح دو نقیض کا مفہوم ہے۔ مفہوم واجب ہے اور اس کے افراد یعنی دونوں نقیض میں سے ہر ایک ممکن ہے اور تمام موجودات حقیقت میں مخالف ہونے کے لیے اب تک کوئی دلیل قائم نہیں ہوی اور دعویٰ بداھت بلا دلیل صحیح نہیں۔ حقائق کی تنقیح کی دشواری کا تم بھی اعتراف کرتے ہیں اور کثرت میں واحد کا ظہور ممتنع نہیں ہے۔ تم میں سے اکثر طبعی کے وجود کے قائل ہیں اور کثرتِ محضہ سے امرِ واحد کے عدم انتزاع میں بداہت کا دعویٰ کرنے والے بھی تمہارے اندر موجود ہیں۔ پس اس سے تمام موجودات کے درمیان ایک امرِ مشترک کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو وجود کو اسی امرِ مشترک سے منتزع کرتا ہے اور وہی امرِ واحد، وجودِ حقیقی ہے اور وہ وجود واجب ہے اور عدم کے قابل نہیں۔

اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وجود، واجب الوجود اور تمام حقائق کی حقیقت اور عالم اس کے شیون ہیں اور وہ وجود ایک خاص قید سے منزہ ہے۔

نیز منکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ وحدۃ الوجود شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بات بھی غلط ہے۔ کیوں کہ قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ اس کی تائید میں ہیں۔ ان ہی دلائل سے ایک دلیل کلمۂ توحید ہے۔

اس طرح اصولِ دین میں تاویل کرنا باطل ہے، جو مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور ان کفّار نے اس بات پر تعجب کیا کہ اُن کے پاس ان ہی میں سے ایک پیغمبر آگیا اور کہنے لگے کہ یہ شخص خوارق میں ساحر اور دعوے نبوت میں جھوٹا ہے اور کیا یہ شخص سچا ہو سکتا ہے! کہ اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے۔

یہ آیتِ کریمہ اس موقعہ پر نازل ہوی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے یہ

یہ فرمایا۔ ایک کلمہ کہو جس کی وجہ سے تم نجات پاؤ گے اور عرب وعجم کے مالک بن جاؤ گے۔ انہوں نے کہا بلکہ دس کلمات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو لا الٰہ الا اللہ: پس وہ فرار ہو گئے اور کہا۔ اتنی مخلوقات کے لیے ایک ہی الٰہ کیسے ہو سکتا ہے اور کیوں کر کثیر خداؤں کا ایک ہی خدا قرار دیا جائے۔ دوسروں نے کہا: ہم نے تو یہ بات اپنے پچھلے مذہب میں نہیں سُنی۔ ہو نہ ہو یہ اس شخص کی گھڑت ہے۔ چلو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر قائم رہو۔ یہ کوئی مطلب کی بات ہے جیسا کہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس قصّہ کو بیان کیا ہے۔ وہ اہلِ لسان تھے۔ پس انھوں نے جو کچھ سمجھا وہی مراد مدلول ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فہم کا انکار نہیں کیا۔ ان دلایل میں سے ایک دلیل اللہ کا قول ہے، وہی ہے جو آسمان میں الٰہ ہے اور زمین میں الٰہ ہے اور یہ دلیل بھی ہے۔ بے شک اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ جنھوں نے اپنی قوم سے کہا: ایک الٰہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ نہیں جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر یہ پیغام دے کر بھیجا، تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں۔ اسی طرح ہودؑ، شعیبؑ اور صالح علیہ السلام نے فرمایا جیسا کہ سورہ اعراف میں قصّہ بیان کیا گیا اور بے شک الٰہ حق سے مراد قول غیر مسموع ہے۔ پس بلا شبہ ایسا قول ہے جو رسولوں کے عدم بیان کی وجہ سے ہے۔ ان کی مراد اصولِ دین میں ہے اور کلام کا آغاز خطاب میں لے آنے سے تاویل کیا گیا ہے۔ یہ دلیل بھی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ فی الواقع اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک صحابہ کرام کے ہاتھوں پر تھا۔ اور یہ دلیل بھی ہے، اللہ کا ارشاد ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے کے لائق کوئی اور معبود بھی ہے۔ بلکہ یہ قوم حد سے تجاوز کی ہوی ہے۔ اور یہ دلیل بھی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اگر تم رسّی کو لٹکا دو تو وہ بھی اللہ ہی پر جا گرے گی اور یہ صحیح حدیث ہے اور یہ حدیثِ قدسی بھی دلیل ہے۔ بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ جب محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے اور میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہ بھی صحیح حدیث ہے۔

حاصلِ کلام!

مسئلہ وحدت الوجود کی صحت واثبات پر نورِ وحی شاہد ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

اللّٰھم ثبت قلبی علی الایمان مدۃ الحیوۃ الدنیا وبعد المماۃ بتصدق بنبیک و حبیبک ومصطفاک وآلہ الکرام واصحابہ العظام صلوات اللہ علیہ وعلیھم اجمعین

سندالعلماء مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی "تحفہ اثنا عشریہ" میں فرماتے ہیں:

چودھواں عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کسی شئے میں حلول نہیں کرتا اور نہ ہی کسی بدن میں داخل ہوتا ہے۔ تمام غالی شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ائمہ کے بدن میں حلول کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ابومسلم مروزی صاحب الدعوۃ کے بدن میں بھی جس کے قائل زرامیہ ہیں۔

طرفہ طرازی یہ ہے کہ شیخ ابن مطہر حلی نے ان ساری باتوں کو جاننے کے باوجود کتاب "نہج الحق" میں حلول کے قول کو صوفیائے اہل سنت جماعت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ حالاں کہ یہ سبھی حضرات حلولیہ کو کافر قرار دیتے ہیں اور یہ تمام باتیں مسئلہ وحدت الوجود (جو انتہائی دقیق اور غامض ہے) کو نا سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ حلول کو محمول کیا گیا۔ اس جگہ ان علماء کی دقیقہ شناسی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ چناں چہ یہی معاملہ دیگر مطالبِ غامضہ کا بھی ہے جو ائمہ حضرات کے کلام میں واقع ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کو غلط سمجھ کر مسخ اور تبدیل کر دئے ہیں۔ شیعہ کے بعض غالی فرقے مثلاً بنانیہ، نصیریہ اور اسحاقیہ وغیرہ حلول کے بجائے اتحاد کے چکّر میں پھنس گئے ہیں۔ حالاں کہ اتحاد مطلقاً باطل ہے۔ اور اس کا بطلان تو روشن بدیہیات میں سے ہے۔ شیخ ابن مطہر حلی نے کمال دقیقہ شناسی کے زعم کے ساتھ اتحاد کے قول کو بھی سالکین اہل سنت کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ حالاں کہ ان بزرگوں کی مراد اس اتحاد سے ان معنوں میں سے ایک ہے نہ کہ حقیقی اتحاد مراد ہے۔

معنی اول یہ کہ تجلّی کا نور ظاہر ہونے کے وقت میں بندے کی انانیت کا مضمحل اور زائل ہوتا ہے جس طرح کہ آفتاب کی روشنی ظاہر ہونے کے وقت میں چراغ کی روشنی مضمحل اور زائل ہو جاتی ہے اور اسی حالت کا پیش آنا اور نور تجلّی کا ظاہر ہونا قرآنِ مجید اور اقوالِ عترت سے ظاہر ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے پس اُن کے رب نے جو اس پر تجلّی فرمائی تو اس پہاڑ کے پرخچے اڑادئے اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اور اللہ کا یہ ارشاد: جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو منجانب اللہ آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں یعنی فرشتے، ان پر بھی برکت ہو اور جو اس کے پاس ہے یعنی موسیٰؑ ان پر بھی برکت ہو۔ یہ دعا بطور تحیہ وسلام کے ہے اور رب العالمین پاک ہے۔ اور اقوال عترت طاہرہ میں سے حضرت صادق کا قول، جو ابو بصیر کے مراسلہ میں ہے۔ کلینی کی روایت سے پیچھے گزر چکا ہے۔ کہ بے شک مومنین دنیا میں یوم قیامت سے قبل خدا کو دیکھ لیں گے۔ اور اس معنی کی توضیح وتشریح شیخ ابن فارض مصریؒ نے "قصیدۂ تائیہ" میں کیا ہے۔

اسی مفہوم کو شیخ ابن فارض مصری علیہ الرحمہ نے اپنے "قصیدۂ تائیہ" میں واضح کیا ہے۔ صوفیائے کرام کے نظریۂ اتحاد کا ثبوت ایک ایسی حدیث سے ہے جس کی روایت ضعیف نہیں ہے۔ اور وہ اشارہ کر رہی ہے بندے کے محبوب ہونے کے بارے میں جو نوافل یا ادائے فرائض کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور تنبیہ الاشارہ کا مقام کنت لہ سمعا سے نور آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہے اور وہ حدیث قدسی یہ ہے:۔

میرا بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں اور جب اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلنے لگتا ہے۔

معنئ دوم یہ کہ خود کو آئینہ قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کے مظاہر میں سے ایک مظہر سمجھیں۔ اس طرح کہ بعض احکام مظہر سے منسوب ہوں گے اور بعض منسوب نہ ہوں گے لیکن جو وصف کہ ظاہر کی پاکی و نزاہت میں عیب و نقص کا باعث ہو مظہر سے آگے نہ بڑھے اور جو وصف کہ مرتبۂ ظاہر کا عنوان ہو مظہر کی طرف نزول نہیں کرے۔ اور یہ معانی و مفاہیم بھی قرآن کریم اور اقوال عترت سے پوری طرح ظاہر ہے۔
جس کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کی، بے شک جو لوگ آپ کے دست حق پرست پہ بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں اور حضرت امیرؓ کا "خطبۃ البیان" اور "خطبۃ الافتخار" فرقۂ امامیہ کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے اگر شیخ حلی اتحاد کے ان صحیح معنوں سے دانستہ طور پر لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ دوسرے ذی فہم شیعہ ان معنی کو سمجھے ہوئے ہیں اور عقل و فہم کی ترازو میں عمدہ طور پر تولے ہیں۔
خواجہ نصیر طوسی کا کلام "شرح مقامات العارفین" میں اور صدرائے شیرازی کا کلام "شواہد ربوبیت و اسفار" میں اور ابن ابی جمہور کا کلام اور اس فرقہ کے دوسرے متاخرین کا کلام ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اور اگر ان اشخاص پر بھی اعتماد نہ ہو کہ ان کا کلام تصوف، فلسفہ اور شریعت کے درمیان مخلوط ہے تو مقداد اور شارح قواعد اور صاحب "کنز العرفان فی تفسیر الاحکام" کا کلام نقل کرتا ہوں۔
"شرح الفصول فی علم الاصول" میں حضرت مقدادؒ سالک کو پیش آنے والے احوال کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ: اتحاد سے مراد یہ ہے کہ سالک بغیر کسی تکلیف کے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کرتا رہے اور کہتا ہے کہ اسی سے ساری مخلوقات اور موجودات قائم ہیں۔ اس حیثیت سے کل ایک ہی ہو گا کیونکہ سالک

جب اللہ تعالےٰ کی تجلّی اور نور سے دیکھنے والا ہو جائے گا تو اس کو سوائے اللہ کی ذات کے کوئی نظر نہیں آئے گا۔ نہ رائی اور نہ مرئی۔

نیز مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی ایک عالم کے جواب میں فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجمع کمالات و مناقب۔ فہیم احکامِ شریعت مولوی نور اللہ صاحب سلّمہٗ اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالےٰ آپ کے جذبۂ حفاظتِ شریعت و اصلاحِ دین میں اضافہ فرمائے۔

بعد از ابلاغِ سلام مسنون۔ فقیر عبدالعزیز عرض کرتا ہے کہ آپ کا مکتوب گرامی مسئلہ توحیدِ وجودی و شہودی کے استفسار سے متعلق اور میاں رمضان شاہ کے وحشت ناک اقوال کی تردید و انکار سے متعلق موصول ہوا۔

مہربانِ من!

حقیقت الامر یہ ہے کہ عظیم صوفیائے متقدمین نے اس مسئلہ میں اس طرح سے توضیحات اور اشارات کی ہے کہ تاویل کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ کبھی حکایت کے ذریعہ تاویل ہو سکتی ہے اور کبھی سُکر و مستی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ خود آپ ہی نے چند بزرگوں کے ارشادات نقل فرمایا ہے۔ طبقۂ سلف گزر جانے کے بعد اور پانچ سو صدی ہجری کے بعد صوفیائے کرام دو فرقوں میں بٹ گئے اور ایک کثیر جماعت نے ان اشارات کو حقیقت پر محمول کیا۔ اور اس بات کے قایل ہو گئے کہ وجوب، امکان، قدیم، حادث، مجرد، جسمانی، مومن، کافر، نجس اور طاہر کے مراتب و درجات میں ایک ہی وجود ظاہر لیکن ہر مظہر علاحدہ حکم رکھتا ہے۔ اور ان مظاہر کے احکام میں فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ مومن کے لیے نجات کا حکم ہے تو کافر کے لیے قتل و قید کا حکم ہے اور تمام صفات متضادہ میں اسی طرح قیاس کر لینا چاہیے۔

وجود کا ہر مرتبہ ایک حکم رکھتا ہے۔ لہٰذا فرقِ مراتب نہ کیا گیا تو زندیقیت ہے۔

اور یہی فرق ظاہر شریعت کے احکام میں قائم ہے۔ اسی لیے تو منکوحہ عورت حلال ہے اور اجنبی عورت حرام اور باپ کی تعظیم و تکریم واجب ہے اور کافر معاند واجب التحقیر ہے اور جو شخص صرف وحدت الوجود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شریعت کے احکام میں فرق نہ کرے تو خلافِ شرع اور الحاد و زندیقہ ہے۔

اور اسی طرح وجود جو ذاتِ حق کا عین ہے صوفیاء کے نزدیک مظاہر مختلفہ میں ظہور کے باوجود منزّہ

احدیت میں نقائص سے پاک اور منزہ ہے اور کمالات سے متصف ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ مراتب کثرت کا نقصان اس پر عائد نہیں ہوتا۔ جیساکہ آفتاب کی شعاعیں نجاسات پر واقع ہونے کے باوجود آفتاب نجس نہیں ہوتا اور انسان کی حقیقت کلیہ کسی مسلمان، کافر صالح، فاسق، عالم اور جاہل میں ظہور کرنے کے باوجود خود کوئی نقص اور نقصان قبول نہیں کرتی اور بہت سے نامور صوفیائے کرام اور علمائے کرام نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ چناں چہ سلسلۂ قادریہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ صدرالدین قونوی اور شیخ عبدالکریم جیلی اور شیخ عبدالرزاق جھجانوی اور شیخ امان پانی پتی رحمہم اللہ کی کتابیں اور سلسلۂ کبرویہ میں مولانا جلال الدین رومی اور شمس الدین تبریزی رحمہما اللہ کی کتابیں اور سلسلۂ سہروردیہ میں شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اور سلسلۂ چشتیہ میں سید محمد گیسودراز اور سید جعفر مکی رحمہما اللہ کی کتابیں اور سلسلۂ نقشبندیہ میں خواجہ باقی باللہ اور عبیداللہ احرار اور مولانا نورالدین جامی اور مولانا عبدالغفور لاری کی کتابیں نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔

ان کے علاوہ شیخ عبدالرزاق کاشی، شمس الدین قنباری قیصری اور سعیدالدین فرغانی وغیرہ بھی اسی مسلک کے پیروکار اور مؤید گزرے ہیں اور ان بزرگوں کی کتابیں بھی مشہور اور موجود ہیں۔ اور آنجناب کے مطالعہ میں آئی ہوں گی۔

صوفیائے کرام کی دوسری جماعت نے ان اشارات کو تاویل حکایت یا سکر و مستی پر محمول کرتے ہوئے وحدت الوجود کا انکار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ بعض اوقات وجود کی وحدت سالک کی نگاہوں میں نظر آتی ہیں بغیر اس کے کہ حقیقت میں وحدت ہو جیساکہ آفتاب کی روشنی میں تمام سیارے بے نور نظر آتے اور دکھائی نہیں دیتے حالاں کہ نفس الامر میں ان کا وجود ہے اور وہ روشنی بھی رکھتے ہیں لیکن دن کے وقت میں آفتاب کی روشنی کے غلبہ کے باعث ان کی روشنی مضمحل ہو جاتی ہے اور یہی حالت و کیفیت چراغ کی ہوتی ہے۔ جب کہ وہ مشعل کے آگے رہے۔

اسی لیے جو حضرات توحید خالص کے نظریہ سے لوٹ چکے ہیں ان کے نزدیک توحید صرف شہود اور نظر میں ہے بغیر اس کے کہ وجود میں ہو۔ چناں چہ شیخ علاؤالدین سمنانی اور دیگر صوفیائے متقدمین کا یہی مسلک ہے اور امام ربانی مجدد الف ثانی اور اُن کے متبعین کا بھی یہی موقف ہے اور ان حضرات نے بھی اس عقیدہ کے اثبات میں بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ اور آپ کو بھی معلوم ہی ہوگا۔

حاصلِ کلام! ہم لوگ جو وجودی اور شہودی کے اختلاف کے بعد پیدا ہوئے ہیں طرفین میں

سے کسی ایک جانب کی صحت و درستگی کا جزم و یقین حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا ہمارے لیے یہی ایک راہ ہے کہ جس طرح مذاہب اربعہ میں حق کو دائر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں مذہبِ حنفیہ صواب پر مبنی ہے اور خطا کا احتمال ہے اور مذہبِ شافعیہ و مالکیہ اور ان کے علاوہ دیگر مذہب خطا ہیں اور صواب کا احتمال ہے۔

اسی طرح ان دونوں مذاہب (وجودی و شہودی) میں سے کسی ایک مذہب کی دلیل راجح معلوم ہو تو دوسرے مذہب کو غلط اور گمراہ خیال نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ دوسرے مذہب کو غلط سمجھنے سے نامور علماء و مشائخ کی کثیر جماعت کا کافر اور گمراہ ہونا لازم آئے گا۔

ہاں! اگر کسی ایک مذہب کی تقلید میں غلو کرے اور فرق مراتب کو نظر انداز کر دے اور جادۂ اعتدال سے قدم باہر رکھے اور عابد کو معبود، حادث کو قدیم، ملوث کو منزہ، حرام کو حلال اور نجس کو طاہر خیال کرے تو یقیناً ایسے اشخاص ملحد و زندیق قرار پائیں گے۔

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی کے فرق کے باعث جو اختلاف امّت میں پیدا ہوا وہ سنّی و رافضی یا سنّی و خارجی کے اختلاف کے مانند نہیں ہے کہ فریقین جانبین سے ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر قرار دیں بلکہ شہودی اور وجودی کا اختلاف تو مذاہبِ اربعہ کے اختلاف کی طرح ہے۔

ہاں! اگر کوئی وجودی شخص جادۂ اعتدال سے قدم باہر رکھتے ہوئے الحاد و زندیقہ کی نوبت و مصیبت پیدا کر دے تو وہ یقیناً گمراہ اور گمراہ کن ہے۔ اور اسی طرح کوئی شہودی شخص اعتدال کی روش ترک کرتے ہوئے علماء اور صوفیا کے گروہ کثیر کو گمراہ اور کافر کہنے لگے تو وہ یقیناً مطعون اور قابلِ سرزنش ہے۔

یہ ہے اس اختلافی مسئلہ کی تفصیل، اب میاں رمضان شاہ کے احوال ملاحظہ کیجیے:

اگر وہ احکامِ شریعت کے پابند ہیں اور لوگوں کو نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن، ذکر، خوف، رجا، تقویٰ اور صلاح کی دعوت دے رہے ہیں تو الحاد و زندقہ سے بہت دور ہیں۔ معاذ اللہ! اگر وہ شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کر رہے ہیں اور لوگوں کو اباحت اعمال اور الحاد و زندقہ کی تلقین کر رہے ہیں۔ تو یقیناً گمراہ کہنے کے قابل اور کافر قرار دینے کے لائق ہیں۔

فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں چند ایسے وجوہ ہوں جو تکفیر کے موجب ہوں اور ایک ہی وجہ ایسی ہے جس سے عدم تکفیر کا پہلو نکلتا ہے تو مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اسی پہلو کو

اختیار کرے جب کہ قائل خود وجہ کفر کی وضاحت کیا ہو۔

فتاویٰ عالمگیری اور دیگر مستند فتاویٰ میں مرقوم ہے، جب کسی قول اور مسئلہ میں چند ایسے اسباب اور وجوہ پائے جاتے ہوں جس سے تکفیر لازم آرہی ہے اور ایک وجہ ایسی ہے جس سے تکفیر لازم نہیں آتی تو مفتی کو چاہیے کہ اسی ایک مانع تکفیر وجہ کو اختیار کرتے ہوئے کسی مسلمان کو کافر قرار نہ دے الا یہ کہ قائل خود اپنے ارادے کی وضاحت کر دے۔ جس سے تکفیر لازم آرہی ہے تو ایسی صورت میں تاویل بے سود ہے۔ پھر اگر قائل کی نیت میں مانعِ تکفیر وجہ موجود ہو تو وہ مسلمان ہے اور اگر موجبِ تکفیر وجہ ہو تو مفتی کا فتویٰ نفع نہیں دے گا۔

واللہ یحق الحق وھو یھدی السبیل ۔ السلام علیکم وقلبی لدیکم

نیز مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی ایک سائل کے جواب میں لکھتے ہیں کہ وحدت الوجود حق اور واقع کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اس کے ثبوت کے لیے دلائل عقلیہ اور نقلیہ موجود ہیں۔ چناں چہ شیخ علی مہایمی گجراتی کی کتاب "ادلۃ التوحید" میں شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہے۔

علمائے متکلمین اس مسئلہ کو رد کرنے کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ مسئلۂ وحدت الوجود بہ کمالِ دقت و باریکی کے باعث بہت سارے عقلی اور نقلی شبہات وارد ہوتے ہیں اور ان شبہات کا حل متکلمین کو میسر نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اس مسئلہ کا انکار کیا اور یہ سطحی متکلمین کی حالت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا تعلق اسرار و رموز سے ہے اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے پر شریعت کا انحصار نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح اور تلقین عوام کے حق میں الحاد کا دروازہ کھول دیتی ہے اور ان کے لیے اباحت اعمال، شرور و فساد اور تکالیفِ شرعیہ میں مداہنت کا باعث ہے۔ چناں چہ مسئلۂ وحدت الوجود کی اسی دقّت و باریکی کی وجہ سے اس کا اظہار و بیان اور تشریح و تلقین ممنوع اور محذور ہے۔ اسی لیے متکلمین نے اس باب میں کفِ لسان کو واجب اور ضروری سمجھا، جیسا کہ حدیث شریف ہے۔ جب قضا و قدر کا ذکر ہو تو سکوت اختیار کرو اور جب میرے صحابہؓ کا تذکرہ ہو تو ان کی ذوات کو ہدفِ تنقید و بحث نہ بناؤ اور جب نجوم کا ذکر ہو تو خاموشی اختیار کرو۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس دقیق مسئلہ میں تحقیق و تفتیش اور تفصیل کے درپے ہونا گویا خود کو گمراہی میں مبتلا کرنا ہے اور دوسروں کو بھی ضلالت کے بھنور میں جھونک دینا ہے۔ اور یہی متکلمین محققین کا موقف ہے۔ اس سکوت و احتیاط کے باوجود ان حضرات نے اپنی کتابوں میں اس مسئلہ

پر اجمالاً بحث کی ہے۔ جیسے امام غزالی، امام رازی اور ان کے علاوہ اور بھی اس فن کے دوسرے امام اگر اس مسئلہ کی تفصیل و تشریح دیکھنی ہو تو کتاب "تنبیہ المحجوبین" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حاصلِ کلام!

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ابتدا میں دلائل و براہین کی روشنی میں منکشف نہیں ہوا بلکہ محض موہبت و معرفت سے منکشف ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا منکشف ہونا کسب و تحصیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے انکشاف کو حالات و کیفیات کے ورود ہونے پر منحصر سمجھنا چاہیے۔

ہاں! اگر کسی شخص کو اولیاء اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں کلام کرنا منظور ہو تو اس کو چاہیے کہ ان بزرگوں کے بارے میں بداعتقاد نہ ہو جائے اور رسائلِ توحید ملاحظہ کرے تاکہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے واقفیت حاصل کرے۔ ان کے بارے میں اعتقاد فاسد نہ پھیلائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسا آدمی اس مسئلہ کو کسب و تحصیل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرے۔ ورنہ یہ مسئلہ عقل و فہم اور فکر و نظر کی راہ سے سمجھ میں آنے والا نہیں، اسی لیے تو کہا گیا: هو طور وراء طور العقل

وہ مقام ہی عقل سے ماوراء ہے

اور یہ ارشاد بھی ہے کہ قلندر جو بھی کہتا ہے مشاہدے کے بعد ہی کہتا ہے۔

ایک عامی شخص جو اس مرتبہ کو نہیں پہنچا ہے اور نہ عالم متکلم ہے، وہ اس بات کا مکلّف ہے کہ متشابہاتِ قرآن پر ایمان کی طرح اجمالاً یہ جان لے کہ حضرات صوفیاء نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صواب ہے اور میری عقل ان حقائق و اسرار تک نہیں پہنچ پا رہی ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ علمائے متکلمین کی وہ جماعت جو معتمد اور مستند ہے۔ اس نے صراحتاً مسئلۂ وحدت الوجود کا انکار نہیں کیا ہے۔ بلکہ سکوت اختیار کیا ہے اور اس کے اظہار و بیان سے اپنی زبان و قلم کو روک لیا ہے۔ انہیں اسباب و وجوہ کی بناء پر جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ہاں! علمائے متکلمین کے مقلدین اور متبعین نے ان کے سکوت کو انکار خیال کیا ہے جیسے علامہ تفتازانی اور قاضی عضد اور دیگر متاخرین۔

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس باب میں امام غزالی اور امام رازی اور ان کے ہم مثل علماء ہی لائقِ تقلید ہیں نہ کہ متاخرین کا گروہ۔

نیز مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی "رسالۂ لحیہ" میں فرماتے ہیں: اب میں مقصود میں بحث کا آغاز کرتا ہوں۔ بادشاہ معبود پر اعتماد کرتے ہوئے جب کہ وہی مقصود ہے اور وہ مشہود بلکہ وجود کے دائرہ میں موجود ہے

مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی "صراط مستقیم" کے دوسرے باب میں فرماتے ہیں لوگ وحدۃ الوجود کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے عرض ہے کہ اس باب میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ مخلوقات حق تعالیٰ کا عین نہیں ہیں۔ اگرچہ کہ ان کا وجود اور قیام اسی کی ذاتِ پاک سے قائم ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے صفات سے سمجھنا چاہیے کہ صفات حق تعالیٰ کے عین ہیں اور نہ غیر بلکہ اس کی ذات سے قائم ہیں۔ اسی طرح دوسری مخلوقات صفات کے عین ہیں اور نہ غیر۔ بلکہ ان کے مظاہر ہیں۔ صفات اگرچہ کہ بذات خود مظاہر سے مستغنی اور بے نیاز ہیں، لیکن باوجود مظاہر مختلفہ (جو مخلوقات سے عبارت ہیں) سے استغناء کے حکمت الٰہیہ اسی چیز کی متقاضی رہی کہ صفات کا ظہور مظاہر ہی کے ذریعہ ہو۔

اکابر صوفیاء کے مقصود کا معنی اور ان کی مراد کا مفہوم یہی ہے۔ لیکن ملحدین وقت بزرگوں کے اقوال وارشادات کو ان کے مقصود اور مراد کے خلاف عمل کرتے ہوئے تحریف اور تلبیس کی راہ ہموار کئے ہوئے ہیں۔

لہذا وحدت الوجود کے تعلق سے اس قدر علم وآگہی کافی ہے۔ لیکن اپنے اوقات کو اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ کے ذریعہ صرف کرنا نہ صرف بے فائدہ ہے بلکہ حضرات انبیاء کرامؑ کی طاعت کے کمالات وبرکات سے محروم ہونے کا موجب ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی "صراطِ مستقیم" کے بابِ اول میں لکھتے ہیں:۔

حاصلِ کلام!

بساطِ وجود پر حق تعالیٰ کی قیومیت کا انبساط اور ان حقائق متکثرہ کا قیام اسی ذات متوحد ولا شریک سے سمجھا جائے گا۔ اور آیت ھو الاول والآخر والظاھر والباطن اور آیت وھو بکل شئی محیط اور حدیث لو دلیتم بحبل الی الارض السابعۃ السفلی لھبط علی اللہ اسی عظیم حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے۔

سبحان اللہ حب عشقی اور جذب تجلی علمی کی کیا خوب تاثیر ہے کہ جس کے فیض سے یہ مشتِ خاک یعنی انسان مقامِ مقدس یعنی بارگاہِ الٰہی میں کس قدر قابلِ عظمت ہوگیا اور رب الارباب کی مجلس میں یہ حقیر مٹی کس قدر بلند مرتبہ ومقام سے سرفرازی ہوی۔ عشق ہی کی بدولت جسم خاکی افلاک پہ پہنچ گیا اور کوہ رقص ووجد میں آگیا اور چالاک ہوگیا۔ اے عاشق طور میں جان عشق کی برکت ہی سے آئی اور وہ مست ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش کھاکر گر پڑے۔

وحدت الوجود سے متعلق بات کرنا اور معارف الٰہیہ میں لب کھولنا اوران ابیات کے مضامین کی تشریح اسی مقام کے لوازم سے ہے۔

نے بلند وپست آواز میں جو کچھ کہ رہی ہے اگر میں اس کو فاش کردوں تو دنیا والے مجھ پہ برہم ہوجائیں۔ جملہ معشوق ہے اور عاشق پردہ۔ اور زندہ معشوق اور عاشق مردہ۔

حاصل کلام!

اس مختصر سے رسالہ میں مزید دوسرے اقوال وارشادات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور طعن وتشنیع کرنے والے زیادہ تر لوگ مولانا شاہ اسماعیل دہلوی کے ساتھ مکمل اعتقاد رکھتے ہیں اور اُن کے فرمان وارشاد کو بے چون وچرا تسلیم کرلیتے ہیں جس کی وجہ سے ان ہی کے قول کو اس صدی کے علمائے متاخرین کے اقوال کے اخیر درج کیا گیا ہے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم ۔۔

مکتوبات

حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ

ترجمہ و تلخیص:

مولوی حافظ ابو النعمان محمد شبیر الحق قریشی قادری استاد دار العلوم لطیفیہ ویلور

مجدد جنوب سلطان المرشدین حضرت مولانا مولوی الحاج شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ نے اپنے تلامذہ، مریدین، معتقدین اور متعلقین و متوسلین کے نام فارسی میں خطوط تحریر فرمائے ہیں جن میں سے چند مکتوبات کا ترجمہ حاضر ہے۔

مکتوب نمبر ۳۳۸

مکتوب بنام شیخ علی سپاہی پلٹن ۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سلام مسنون کے بعد قلب سراپا سعادت پر واضح ہو کہ آپ کا ۶ ربیع الاول ۱۲۷۹ سنہ ہجری کا تحریر کردہ مکتوب نظر نواز ہوا۔ دینی مسائل اور احکام کے استفسار پر مشتمل رہنے کی وجہ سے قلب کے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا باعث بنا۔ الحمد للہ علی ذالک: ایں کار دولت است اکنوں تا کرا رسد۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے امور و مقاصد میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ فقیر بہتر سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے اور لب گور بیٹھا ہوا ہے۔ اور یہ ایسا وقت ہے کہ فقہ کی کتابوں کی جانب رجوع کرنے سے قاصر ہوں اور قلب کا رجحان اور میلان مطالعہ اور تحقیق کی طرف نہیں ہے۔ کیا کیا جائے اسی روش سے پرورش کر رہے ہیں، جیسے ہماری پرورش ہو رہی ہے اسی نہج پر رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قلیل الفرصت ہوں ایک نا رسو بیمار، ایک سر ہزار سودا والا معاملہ ہے۔ مسائل کی تفتیش و تفحص و انتخاب کی مہلت نہیں پا رہا ہوں لیکن چونکہ سوال کرنے کے بعد جواب دئے بغیر کوئی چارہ تھا۔ اسی وجہ سے چند امور پر روشنی ڈال رہا ہوں، جس سے آپ کو اپنے پوچھے ہوئے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے۔ دلائل شرعیہ چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور مجتہد کا قیاس اور مذکورہ چار دلائل کے سوا کوئی دلیل بھی احکام شرعیہ کو ثابت کرنے والی نہیں ہے۔ مولانا شاہ اسحاق دہلوی "مائۃ المسائل" کے چوتھے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"اصول فقہ کے اندر جو شرعی دلائل بیان کیے جاتے ہیں وہ صرف چار رہیں: کتاب، سنّت، اجماع اور قیاس۔ جیسا کہ توضیح، منار، حسامی، اصول الشاشی، مسلم، بزدوی اور اصول کی دوسری کتابوں میں مرقوم ہے۔ لیکن قیاس کے تعلق سے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ وہی قیاس حجت اور دلیل ہے جو اصول فقہ کے اندر بیان کئے گئے شرائط کے موافق و مطابق ہو اور استحسان اور استصحاب وغیرہ قیاس میں داخل اور شامل ہیں۔"

امام ربّانی شیخ احمد سرہند مکتوبات کی جلد دوم کے ۵۵ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

"احکام شرعیہ کے اثبات میں معتبر کتاب، سنت اور مجتہدین کا قیاس ہے اور امّت کا اجماع بھی احکام کو ثابت کرنے والا ہے۔ ان چاروں دلائل شرعیہ کے بعد کسی دلیل سے بھی احکام شرعیہ کا اثبات نہیں ہو سکتا۔"

اب یہ حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اجتہاد صرف فقہائے کرام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ صوفیا، صافیہ بھی مجتہد ہیں۔" شیخ الہند عبد الحق محدث دہلوی "مرج البحرین" میں فرماتے ہیں۔

حضرات صوفیائے کرام بھی خاص طریقے، آداب، اصطلاحات اور مستحسنات ہیں۔ جیسے خانقاہوں کی تعمیر البا‌س خرقہ۔ اجرائے مقراض، کیفیات و ذکر، خلوت گزینی اور اجتماع سماع وغیرہ۔ علماء فقہ کی طرح ان امور کے اندر صوفیاء کے اجتہادات اور استنباطات ہیں۔ اور یہ بھی ابواب علم کی ایک قسم ہے۔ جس میں اجتہاد کی صحت اور اس کے شرائط اور سنت و بدعت کی تحقیق سے بحث ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر صوفی اور فقیہ دونوں برابر ہیں اور دونوں سے اپنے اصل کے وجود اور دلیل کی صحت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی نے "صراط مستقیم" کے پہلے باب میں جو تحریر فرمایا، ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے:

"شریعت کا ایک باطن ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے قلب کا ربط و تعلق ہے اور شریعت کا ایک ظاہر ہے اور وہ اوامر کی اتباع و پیروی اور نواہی سے اجتناب و پرہیز ہے"

نیز مذکورہ باب کے اواخر میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ اصحاب طریقہ (مختلف سلاسل) کے اولیائے کبار نے فن باطن شریعت میں امامت حاصل کی اور اصلاح قلب کے قواعد میں (جو دین متین کا خلاصہ ہیں) اجتہاد کی قوت حاصل کی تھی۔

جب حب ایمانی (یعنی طریق نبوت) کو متواترات اور یقینیات دینیہ سمجھا اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو جمہور اہل ملت نے محفوظ پایا۔ یہاں تک کہ عوام اہل ملت میں سے ہر عامی (جو ان کے بابرکت زمانے میں موجود تھا) اللہ تعالیٰ کی اطاعت جواز مطلق کے احکام کی پیروی، شرع نبوی کی پابندی اور دین مصطفوی کو اپنا دین و مذہب بنا لینے کا یقینی طور پر اپنے ذمہ فرض جانتا تھا اور شکر منعم اور اس کی محبت کی اچھائی اور کفران منعم اور اس کی مخالفت کو برائی کی تمام بدیہات میں سے سب سے زیادہ بدیہی شمار کرتا تھا۔

اس بنا پر ان اولیائے کرام نے اپنے پیروؤں کے اذہان و قلوب میں ان حقائق کو مسلم الثبوت پایا تو حب ایمانی (یعنی طور نبوت) اور اس کے لوازم کی بحث تحصیل حاصل سمجھ کر احکام حب عشقی (یعنی طریق ولایت) کی تفصیل اور اس کے ثمرات کی وضاحت اور ان کی تحصیل کی راہوں کے احاطہ کا قصد کیا اور اس امر میں بڑی کوشش کی اور اہل اسلام کے جم غفیر کو نفع عظیم پہنچایا۔ اور اس سبب سے بارگاہ رب العالمین میں عظیم وجاہت اور بڑی عزت پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے اور اعلیٰ علیین میں ان کے درجات و مراتب کو بلند فرمائے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اجتہاد (خواہ ظاہر شرع میں ہو یا باطن شرع میں) دلائل شرعیہ میں سے ہے اور ایک مقلد کا قیاس دلائل شرعیہ میں کوئی دخل نہیں رکھتا اور اس سے احکام شرعیہ کا اثبات نہیں ہو سکتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک مقلد کو قرآن و حدیث سے احکام و مسائل کا استنباط کرنے اور اجتہاد کرنے کا حق نہیں پہنچتا جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مرقوم ہے :

امام ربانی مجدّد الف ثانی مکتوب کی جلد اول کے ۲۸۶ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں کہ

"ایک مقلد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے امام کے مسلک و مذہب کے خلاف قرآن و حدیث سے احکام اخذ کرے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے"

مولانا شاہ اسماعیل دہلوی "مقدمہ ایضاح الحق" کی پہلی فصل میں استنباط احکام کے مسئلہ میں فرماتے ہیں : "دوسری شرط یہ ہے کہ قیاس مجتہدین کی جانب سے ہوگا۔ مقلدین کی جانب سے نہیں۔ اسی سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنّت سے احکام اخذ کرنے کا مسئلہ مرتبۂ اجتہاد کا متقاضی اور طالب ہے اور ایک مقلد امام مجتہد کی پیروی کے بغیر کوئی چارہ نہیں رکھتا"

"تیسری بات یہ ہے کہ مقلد کو بعض فقہا کے مذہب پر ترجیح و فوقیت دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کے کام کی انتہاء فقہائے کرام میں سے کسی ایک فقیہہ کا انتخاب کرنا اور ان کے اختلاف کی وضاحت کرنا ہے"

مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی "قول الجمیل" میں فرماتے ہیں :

"مقلد فقہاء کے مذہب کو بعض فقہاء کے مذہب کو ترجیح میں کلام نہ کرے بلکہ چاروں فقہی مذاہب کو قبولیت کی منزل میں رکھے"

مولوی خرّم علی بلہوری "شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل" میں لکھتے ہیں :

"چونکہ جمہور اہل سنّت کے نزدیک مذاہب اربعہ میں حق دائر ہے لہٰذا سب کو مجملاً حق جاننے کو فرمایا اور ترجیح مذہب کی گفتگو سے اس واسطے منع کیا کہ ایک مذہب کو ترجیح دینا اکثر اذہان میں مذاہب باقیہ کی تنقیص و تذلیل کا باعث ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے بعض حنفی شافعی کے مذہب کو برا کہنے لگتے ہیں اور بعض شافعی مذہب حنفی پر طعن کرتے ہیں۔ اسی بھید سے افضل الخلق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام سے مجھ کو افضل نہ کہو۔ واللہ اعلم

جس طرح ایک مقلد کو فقہی مذاہب میں ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح اور فوقیت دینے کا حق نہیں پہنچتا اسی طرح حضرات صوفیاء کے طریقوں اور سلسلوں میں سے ایک سلسلہ کو دوسرے سلسلہ پر ترجیح اور فوقیت دینے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی "قول الجمیل" میں فرماتے ہیں :

"حضرات صوفیاء کے سلاسل اور طریقوں میں سے بعض کو بعض پر ترجیح اور فوقیت کی بات نہ کی جائے اور ان بزرگوں

جو مغلوب الحال ہیں اُن کے اقوال و افعال کے رد و انکار کے در پے نہ ہوں۔"

مولوی خرم "شفاء العلیل" میں لکھتے ہیں:

"از آں جملہ یہ ہے کہ گفت گو نہ کرے صوفیوں کے طریقے میں۔ بعض کو بعض پر ترجیح دے کر اور جو اُن میں مغلوب الحال ہیں ان پر انکار نہ کرے۔"

اس سے واضح ہو چکا کہ ایک مقلد کو فقہائے کرام کے مذاہب اور صوفیائے کرام کے سلاسل میں بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی بات نہیں کہنی چاہیے اور مغلوب الحال صوفیا کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ عہدِ نبوت کے بعد جو احکام و مسائل ائمۂ مجتہدین کے اجتہاد و استنباط سے حاصل ہوئے ہیں المجتهد یخطی ویصیب (مجتہد سے خطا و صواب دونوں ممکن ہے) کے حکم کے مطابق یہ احکام خطا اور صواب کے درمیان متردد ہیں۔ مجتہد خواہ مستقل ہو یا غیر مستقل اور مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا بھی کر جائے تو وہ یک گونہ اجر و ثواب کا مستحق ہے اور اسی طرح مقلد بھی مجتہد کی خطا کی تقلید میں نجات کا مستحق ہے۔

امام ربّانی مجدّد الف ثانی مکتوبات کی جلد سوم کے ۲۲ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

"مجتہد پر اعتراض کی کیا بات ہے اس کی خطا بھی ایک درجہ اجر و ثواب کی حقدار ہے اور اس کی تقلید اگرچہ کہ خطا ہی میں کیوں نہ ہو وہ بھی نجات کا باعث ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اجتہادی خطا میں مجتہد اور مقلد دونوں پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ایک مقلد کو بغیر ضرورت اور احتیاط کے اپنے امام کے مسلک کے خلاف عمل کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ امام حجۃ الاسلام غزالی "کیمیائے سعادت" کے رکن دوم کی نویں اصل میں فرماتے ہیں۔

"کسی شافعی شخص کو لائق نہیں ہے کہ نکاح بے ولی اور حق شفعۂ جوار (ہمسائیگی خانہ و زمین) اور اسی قسم کے مسائل کو موضوع بحث بنا کر کسی حنفی شخص پر اعتراض کرے۔ (یعنی مقلد کے لیے روا نہیں ہے کہ دوسرے امام کے مذہب پر حرف گیری اور نکتہ چینی کرے اور اس کی پیروی کرنے والوں پر اعتراض کرے) اور اگر کوئی شافعی شخص ولی کے بغیر نکاح کرے اور نبیذِ خرما کا استعمال کرے تو اس کو ان چیزوں سے روکنا اور منع کرنا ہر شافعی اور حنفی پر ضروری ہے۔ کیوں کہ اپنے منتخب کردہ امام کی مخالفت کرنا کسی مذہب میں جائز نہیں۔"

لہٰذا ہر ایک مذہب کے مقلد پر یہ بات واجب ہے کہ وہ صرف اپنے امام کے مذہب کی اتباع کرے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کوئی شخص اپنے اجتہاد کے خلاف عمل کرے تو گنہ گار ہوگا۔ مثلاً کسی شخص نے قبلہ کا رُخ جاننے کے لیے اجتہاد کیا اور اپنے اجتہاد کردہ رُخ کے خلاف نماز ادا کیا تو وہ گنہ گار ہو جائے گا اگرچہ کہ دوسرا اس کو صحیح گمان کر رہا ہے۔

اور یہ بھی بہت ہی ناقابلِ اعتبار اور بے ہودہ بات ہے کہ آدمی اپنا مذہب ومسلک جب چاہے تبدیل کرسکتا ہے۔ کیوں کہ جب ایک شخص اپنے خیال کے مطابق کسی امام کو فاضل تر قرار دے اور خود کو اس امام کا مقلد سمجھنے کے بعد ضروری ہے کہ وہ اپنے ہی متعین اور مقرر کردہ امام کے مذہب پر عمل کرے۔ اس لیے کہ ایک شخص امام شافعی کو فاضل سمجھنے کے بعد اُن کے مذہب کے خلاف کرنا خواہشاتِ نفسانی کے علاوہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔

صاحب "شرح منہاج الاصول الی علم الوصول" فرماتے ہیں کہ:

"امام شافعی اور دوسرے مجتہدین کا اتفاق ہے کہ مقلد جمیع مسائل میں اپنے ہی امام کی تقلید کرے۔"

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بادشاہِ بخارا کے چھٹے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

"کسی حنفی کو بعض احکام میں مذہب شافعی پر عمل کرنے کی اجازت صرف تین صورتوں میں ہے۔

ایک یہ کہ حنفی شخص جن مسائل کے اندر امام شافعی کی تقلید کرنا چاہتا ہے ان مسائل کو کتاب وسنت کی روشنی میں حنفی مذہب پر ترجیح دے اور یہ کام ایک مجتہد ہی کر سکتا ہے۔

دوسری یہ کہ کسی حنفی مسئلہ پر عمل کرنا دشوار ہو اور اس مسئلہ میں شافعی مذہب پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو مثلاً احکام مفقود اور ان شہروں میں پانی کے مسائل۔

تیسری یہ کہ وہ شخص صاحبِ تقویٰ وطہارت ہو اور صرف احتیاط کی خاطر شافعی مذہب اختیار کرے۔ مثلاً امام شافعی کے نزدیک مقدار سے کچھ زیادہ صدقہ دینا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کے احتیاطی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے حنفی اس مسئلہ پر عمل کرے۔ تو جائز ہے۔ اور اسی طرح احتیاط کے خیال سے مور کا گوشت کھانا چھوڑ دے تو جائز ہے۔

لیکن ان تین صورتوں میں ایک قید یہ بھی رہے گی کہ تلفیق بین المذاہب کی صورت پیدا نہ ہو۔ اور دونوں مذہب کی پیروی میں ایسی صورت اور شکل نہ نکلے جو دونوں مذہب کے لحاظ سے صحیح نہ ہو۔ مثلاً امام شافعی کے نزدیک فصد کھولنا (خون کا نکالنا) ناقض وضو نہیں ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان کے نزدیک ناقضِ وضو ہے۔ اگر کوئی صاحبِ وضو فصد کے بعد بلحاظ شافعی مذہب اسی وضو سے ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرے جو فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والا ہو۔

ایسی صورت میں تلفیق واقع ہو جائے گی۔ کیوں کہ شافعی مذہب کے لحاظ سے وضو ٹھیک ہے لیکن سورۂ فاتحہ قرأت نہ ہونے کی وجہ سے نماز صحیح نہیں۔ اور حنفی مذہب کے لحاظ سے نماز ٹھیک ہے لیکن فصد کی وجہ سے وضو نہیں ہے۔

حاصلِ کلام! اگر کوئی حنفی شخص مذکورہ تین صورتوں سے ہٹ کر مذہبِ شافعی پر عمل کرے یا

کوئی شافعی شخص مذہبِ حنفی پر عمل کرے تو یہ مکروہ اور حرام کے قریب ہے۔ کیوں کہ اس طرح اپنی سہولت اور اپنے نفس کی خاطر اپنے امام کی تقلید ترک کردینا گویا دین کے ساتھ لہو و لعب اور استہزاء ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ اہلِ سنت جماعت کا اختلاف چاہے وہ ظاہر شریعت کے مسائل میں ہوں یا باطن شریعت کے مسائل میں ہوں، وہ اختلاف سنّی و رافضی یا سنّی و خارجی کے اختلاف کی طرح نہیں ہے کہ ایک جانب سے دوسرے جانب کی تکفیر و تضلیل کی جائے بلکہ حق ان مختلف اقوال میں دائر اور منحصر ہے۔ مجتہد اور مقلد ان دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا یقین نہیں کرسکتے۔ اگر ایک قول کی دلیل زیادہ راجح ہو تو دوسرے قول کو گمراہی اور ضلالت نہیں سمجھنا چاہیے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی "مدارج النبوۃ" کے دسویں باب کی چھٹی نوع میں فرماتے ہیں:

"اختلافی مسائل اور امور کے اندر ایک ہی جانب کی صحت و درستگی کا یقین کرلینا اور اس میں تعصب (صحیح قول ہونے کے باوجود قبول نہ کرنا) دکھلانا علمی اختلاف کا مناسب طریقہ نہیں ہے۔ نیز اسی چھٹی نوع میں فرماتے ہیں: اختلافی امور و مسائل کے اندر ایک دوسرے پر عیب جوئی و نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے اور ہر ایک کو اس اس کے موقف پر اور مسلک پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تمہارا رب ہی صحیح اور بہتر طور پر جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ ہدایت کی راہ پر ہے۔"

اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک مجتہد کا قیاس دوسرے مجتہد کے قیاس کو باطل کرنے والا نہیں ہے اور مقلد کو ابتدا میں اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مذاہب اربعہ میں سے جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور وجود کی اثنینیت کی تقلید میں متکلمین کے مذہب کے موافق اور وحدت وجود، وحدت شہود کی تقلید میں وجودیہ اور شہودیہ کے موافق اختیار رکھتا ہے۔ اس لیے کہ علمائے فقہ حنفی و شافعی وغیرہ اور صوفیا رصافیا شہودیہ وجودیہ یہ تمام بزرگانِ دین اہلِ سنت وجماعت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولوی نوراللہ کے نام لکھے ہوئے مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ہم لوگ جو اس اختلاف کے بعد پیدا ہوئے ہیں طرفین میں سے کسی ایک طرف کی صحت کا یقین نہیں کرسکتے۔ ہم لوگوں کے لیے بس یہی ایک راہ باقی رہ گئی ہے کہ جس طرح مذاہبِ اربعہ میں حق کو دائر سمجھتے اور کہتے ہیں، مثلاً مذہب حنفیہ درست اور صواب ہے لیکن خطا کا احتمال ہے اور مذہبِ شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ خطا ہے لیکن درست ہونے کا احتمال ہے، بالکل اسی طرح مذہبِ توحید وجودی اور مذہبِ توحیدِ شہودی کا حال ہے۔ اگر ان میں سے ایک دلیل کی وجہ سے راجح ہو تو دوسرے کو گمراہی و ضلالت نہیں سمجھنا چاہیے۔"

نیز اسی مکتوب میں رقم طراز ہیں :

"توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی کے فرق کی وجہ سے اُمّت کے درمیان جو اختلاف رونما ہوا وہ سنّی و خارجی یا سنّی و رافضی کے اختلاف کی طرح نہیں ہے کہ جانبین سے ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہنے لگیں۔ بلکہ یہ اختلاف مذاہب اربعہ کے اختلاف کے مانند ہے۔"

دل میں بہت سی باتیں ہیں جن کی ترجمانی سے زبانِ قلم قاصر ہے : ؎

عمر بگذشت حدیثِ دردِ من آخر نہ شد شب بآخر شد اکنوں کوتہ کنم افسانہ را

عمر گزر چکی ہے اور میری درد بھری بات پوری نہ ہو سکی۔ رات ختم ہو گئی لہٰذا میں اپنا افسانہ مختصر کر لیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ جلد ختم ہونے والی لذتوں، چرب و شیریں غذاؤں، پراگندہ تعلقات نقش دار و رنگین ملبوسات جو فنا و زوال کے سوا کوئی چارہ نہیں رکھتی ہیں اور آخرکار با دِ فنا کی لپیٹ میں آجاتی ہیں، ان سے ہم فریب نہیں کھائیں گے اور موت کی یاد اور آخرت کے احوال پیش نظر رکھیں گے اور شریعتِ مطہرہ پر عمل پیرا رہیں گے اور باقی رہنے والی ذات کی محبت و الفت کی بو باس سے اپنے مشام کو معطر رکھیں گے۔

یہی کام تو اصل ہے اس کے علاوہ جو بھی کام ہے وہ بیکار اور فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تمہارے ساتھ رہے تم جہاں کہیں رہو۔

نمبر ۱۷۹

مکتوب بنام محمد معروف صاحب المعروف خان عالم صاحب مدراس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون کے بعد خدمتِ شریف میں عرض ہے

حاجی عزیز الدین خان صاحب کی وفات اور خصوصاً صلاح الدین خان صاحب کی وفات فقیر کے قلب و جگر پر نشتر زن ہے۔ آں مخدوم کو کس قدر رنج و غم لاحق ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بندگی بیچارگی ہے۔ اس کے ساتھ امانت کو صاحبِ امانت کے طلب کرنے پر واپس کر دینا ضروری ہے بلکہ مقبول بندہ تو وہی ہے جو اپنے مولیٰ و آقا کے فعل پر راضی ہو۔ اور وہ شخص جو اپنی مرضی کے تابع ہے وہ خود ہی کا غلام ہے۔ اس سے زیادہ کچھ تحریر کرنا جسارت کے مترادف اور لقمان کو حکمت سکھانے کا ہم معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و

حمایت تمہارے ساتھ رہے جہاں کہیں رہو۔ وان اللہ مع الصبرین ۔ اللہ تعالیٰ کی تائید تو صابرین کے ساتھ رہتی ہے۔

مکتوب بنام بخشی الملک نفی صاحب بہادر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلامِ سنتِ سنیہ کے بعد خاطرِ شریف پر واضح ہو کہ ۱۳ ر رجب ۱۲۷۷ہجری کا تحریر کردہ التفات نامہ جو کمالِ لطف و کرم کے ساتھ فقیر کے نام ارسال کیا گیا تھا نظر نواز ہوا۔ غیر اللہ کی تیرگی و کدورت سے پاک و صاف تھا قلب کو خوشیاں پہنچایا۔ الحمد للہ علی ذلک

امام ربانی مجدد الف ثانی ”معارف لدنی“ میں فرماتے ہیں :

” صوفیا کی معرفت، علم حضوری سے عبارت ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ جو فنا اور بقا کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور شناختن و یافتن سے اس کی تعبیر کرتے ہیں۔

اور متکلمین کی معرفت علم حصول سے عبارت ہے حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ جو نظر و استدلال کا نتیجہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو علم کہ خارج سے حاصل ہو وہ صورتِ معلومہ کے حصول سے عبارت ہے۔ اس وقت مقولہ سے اضافت ہوتی ہے جیسا کہ یہ بعض اہلِ قلم کا موقف ہے۔ یا عالم کے عقل و ذہن میں اس علم کی صورتِ حاصلہ سے عبارت ہے۔ اس وقت مقولہ سے ”کیف“ کی بات ہوتی ہے جیسا کہ بعض اہلِ علم کا خیال ہے اور اس علم کو علمِ حصولی کہتے ہیں۔ اور جو علم اس طرح نہ ہوگا یعنی خارج سے حاصل نہ ہو بلکہ عالم کی ذات سے متعلق ہوگا اس علم کو علم حضوری کہتے ہیں۔

اور جب عارف اپنی صفات اور ذات کی فنا کے بعد بقا باللہ سے مشرف ہوا اور اس کی ’انا‘ وجودِ کونی سے پوری طرح قید ہوئی اور اطلاق کی حقیقت پر پہنچ گئی تو عارف لامحالہ علم حصولی سے علم حضوری کی جانب پہنچ چکا۔ اور دانش کے دائرہ سے نکل کر یافتن کی منزل پا لیا۔ کیوں کہ ”یافت“ یا بندہ کی ذات کے باہر میں نہیں ہوگی معاذ اللہ! سادہ لوح اشخاص اس مقام میں حلول و اتحاد کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے اور اکابرِ دین کے ساتھ سوءِ ظن نہ قائم کرلیں یا خود کو بداعتقادی کے بھنور میں جھونک کر ہلاک نہ ہو جائیں۔

بحری فرماتے ہیں : ؎

اپنا چ ہے باد، یا د حق کا ۔۔۔ پر کان ہے معلم اس سبق کا

شیخ عطّار فرماتے ہیں: ؎

گم گشتن و بافتن بخود ہم علمی است عظیم بلکہ اعظم

پس اسی سے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ اصحابِ نظر و استدلال کو اہلِ ظاہر کہتے ہیں اور اصحاب کشف و شہود کو اہلِ باطن کہتے ہیں۔ اہلِ ظاہر کی منزل دانستن ہے اور اہلِ باطن کی منزل دیدن ہے۔ ؎

حسِ حیوان گر بدے شاہ را پس بدیدی گاؤ خر اللہ را

کس بعلم ظاہر ار حق بیں بدی فخر رازی رازدار دین شدی

ارشادِ ربانی ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (اور جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم ضرور انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔)

ریاضت اور مجاہدہ ہی پر ہدایت کا وعدہ جڑا ہوا ہے۔ اور انک لا تخلف المیعاد (بے شک تو وعدہ خلاف نہیں کرتا) حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان ہے۔ فقیر اللہ سے امید رکھتا ہے کہ آپ کی دستگیری فرمائے گا۔ واللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔ اللہ کی ذات ہر شئے پر قدرت رکھنے والی ہے۔

فقیر بعض امور و معاملات کی تنظیم میں مصروف اور مشغول ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ان کاموں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد شعبان میں یا رمضان کے پیچھے آپ کے حسبِ ایما تکلیف دے گا۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ اس تکلیف کو دائمی راحت سے بدل دے گا۔ انہٗ قریب مجیب: بے شک وہ قریب ہے سننے والا۔

مکتوب بنام شہزادہ محمد بشیر الدین صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون کے بعد خاطر امارت مظاہر پر واضح ہو کہ ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۵ سنہ ہجری کا تحریر کردہ مکتوب جو کمال لطف و مہربانی کے ساتھ فقیر کے نام ارسال کیا گیا تھا دستیاب ہوا۔ استعداد حیدری و سلطانی اور آبائی ارتباط کو یاد دلایا۔ اور اس مکتوب کے ذریعہ آپ کی اہل اللہ کے ساتھ محبت و الفت کی بوباس مشام میں پہنچ رہی ہے۔ اور یہ بات قلب کو خوشیاں دے رہی ہے۔ اس طائفہ کے ساتھ محبت و الفت رکھنے والے شخص کے لیے یہی بشارتیں کافی اور وافی ہیں۔ المرء مع من احبہ: آدمی کا حشر اسی شخص کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اُسے محبت اور الفت ہوگی۔ ہم قوم لا یشقی جلیسھم ولا یخیب انیسھم: یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کی صحبت میں رہنے والا بدبخت نہیں ہوگا اور ان کے ساتھ انس و الفت رکھنے والا ناکام اور نامراد نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے ہر کام میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کے ساتھ احسان و بھلائی کا معاملہ کرے۔

نواب زین العابدین خان بہادر سے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر کیا تھا فقیر سعید دارین سید فضل اللہ قادری کے ذریعہ ظاہر کیا۔ نواب موصوف نے کمال بشاشت اور سمعِ اجابت کے ساتھ سُنا اور فرمایا کہ یہ جگہ شاہی خاندان کے رشتہ داروں کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ توفیق و ہدایت فرمائے کہ ہم لوگ اور تمام مسلمان جلد ختم ہونے والی لذّتوں، چرب و شیریں غذاؤں رنگین و منقش لباسوں اور پراگندہ تعلقات، عزت و وجاہت کی طلب اور شان و شوکت کی خواہش سے فریب اور دھوکا نہ کھائیں۔ جن کو فنا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور آخر کار بادِ فنا اڑا لے جائے گی اور باقی رہنے والی ذات کی محبت و جمعیت کی بو باس سے ہم سب اپنے مشامِ جان کو معطر کریں اور اس مختصر دنیا کی قید میں گرفتار نہ ہو جائیں جو قبر میں ساتھ دینے والی نہیں ہے اور آخرت کے احوال اور موت کی یاد پیشِ نظر رکھیں۔ یہی ایک کام ہے۔ اس کے علاوہ سب ہیچ ہے۔

حق تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آں والا مرتبت کے ظاہر کو شریعت غرّا کے ارکان اور ملّتِ زہرا کے احکام سے آراستہ فرمائے اور آں ذی شوکت کے باطن کو دنیا و مافیہا سے خلاصی عطا فرمائے۔ جو خدا کی ملعون اور زوال پذیر ہے۔ ع این کار دولت است اکنوں تا کرا رسد۔

زیادہ کیا عرض کروں اللہ تعالیٰ آپ کو باقی رکھے اور آپ کے وجود سے اسلام کی قوت کو بقا اور دوام عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ فقیر کی دو کتابیں "جواھر الحقائق" اور "جواھر السلوک" آں والا مرتبت کی نظر سے گزریں گی۔

واللہ علی کل شئی قدیر: اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شئے پہ قادر ہے۔

مکتوب بنام مولوی بدر الدولہ بہادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون کے بعد خدمتِ شریف میں عرض یہ ہے کہ کتاب "جواھر الحقائق" ارسال کی گئی ہے۔ تاکہ قبولیت کے درجے کو پہنچ سکے اور آپ کی نظر سے گزر سکے۔ اور فقیر دعائے ظہر الغیب سے مشرف ہو سکے اسلام کی غربت و اجنبیت کے دور میں آپ کا وجود شریف ملّتِ اسلامیہ کے لیے غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ

(بقیہ صفحہ 45 پر ملاحظہ فرمائیں)

حضرت مولانا مولوی ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

> یہ مضمون حضرت مولانا صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ، ویلور کی نوکِ قلم سے نکلا تھا جو پچیس ۲۵ برس پہلے "اللطیف" سنہ 1968ء مئی شائع ہوا۔ یہ دُرِّ نایاب قارئین کرام کی نذر ہے۔
> ادارہ

حمد وثناء اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے جس نے اس خاکدانِ عالم کے اندر ایسے ایسے خاصانِ خدا پیدا فرمایا جن سے قدرتِ الٰہی کے کرشمے صادر ہوتے رہے ہیں۔ "شانِ غوثیت" کے مہتم بالشان عنوان پر کما حقہٗ اور سیر حاصل بحث کرنا ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ کیوں کہ یہ وہ دریائے ناپیدا کنار ہے جس کی وسعت وگہرائی کا اندازہ ہو نہیں سکتا۔ اس وقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کا مقصد چنداں پوشیدہ گوشوں کو اُجاگر کرنا ہے جو عام نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں اور جن کا تعلق علمِ سینہ سے ہے نہ کہ علم سفینہ سے۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ مختلف گلہائے رنگارنگ مضامین اور کثیر التعداد تصانیف میدانِ شریعت ومعرفت، حقیقت وطریقت میں آپ کے نوکِ قلم سے وجود میں آئیں، جس میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہادئے گئے ہیں سادگی وصداقت کے انمول خزانے ہیں جن کے پڑھنے سے عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ بطورِ مثال آپ کی چند تصانیف کے اسمائے گرامی پیشِ نظر کی جاتی ہیں۔

فتوح الغیب : ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس میں ایسی حکمت بھری ہدایتیں ہیں جن کو پڑھنے سے ایمان میں عجیب تقویت اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

غنیۃ الطالبین: ایک جامع تصنیفِ لطیف ہے۔ اس سمندر میں غوطہ لگا کر انسان اپنے مقصود کے گوہرِ نایاب حاصل کر سکتا ہے۔

مواعظِ حسنہ: نادر الوجود مواعظ کا مجموعہ ہے۔

سلوک و تصوف: حقائق و دقائق کے اسرار و رموز فاش کر دئے گئے ہیں۔ مسائل لافانی و لاثانی بیان کئے گئے ہیں جو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آپ کے وعظ کے موقع پر جب کہ آپ کے تبلیغ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، ستر ہزار اشخاص سے زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ اس مبارک مجلسِ وعظ میں کہا جاتا ہے کہ پیغمبروں کی ارواحِ مقدسہ اور ملائکہ بھی شریک رہتے۔ یہود و نصاریٰ اور جنات بھی کثیر تعداد میں شرکت کرتے۔ آپ کی آواز نزدیک و دُور یکساں سماعت کی جاتی تھی۔

ان مواعظ کا وہ اثر تھا کہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں یہود و نصاریٰ اور جنات آپ کے حق پرست پر مشرف بر اسلام ہوئے۔ آپ کے مبارک زمانہ میں آپ کی ذات پُر انوار سے دینِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔

ایک بزرگ کے حالات میں تحریر ہے کہ ایک روز ان کا گزر کسی شاہراہ عام سے ہو رہا تھا۔ ایک شخص جس کی بکری کہیں گم ہو گئی تھی اتفاق سے وہ بھی وہاں پہنچا۔ حضرت موصوف کو دیکھتے ہی کہا آپ ہی نے میری بکری چرائی ہے۔ بر سر بازار چوری کے الزام سے وہ بزرگ بہت حیران و پریشان ہوئے۔ لیکن وہ شخص برابر اصرار و ضد کرتا رہا کہ اس کی بکری اس کو دے دیں۔ محترم بزرگ شرمندگی و رنجیدگی کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوئے۔ کہ "یا اللہ تو اس کی بکری بھیج دے اور مجھے اس ذلت و رسوائی سے بچا لے۔" ختمِ دُعا کے ساتھ ہی وہ بکری آ پہنچی۔ بکری پاتے ہی وہ شخصِ مذکور بہت ہی خوش ہوا اور آپ سے معذرت کرنے لگا۔ کہ میں بخوبی واقف ہوں کہ آپ کی ذاتِ گرامی سے کبھی اس جرم کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ کی برکت سے ہی وہ بکری مجھے حاصل ہو سکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً آپ کی جناب میں، میں نے گستاخی کی، تا کہ اسی حیلہ سے میرا مقصود حاصل ہو۔ ورنہ ہماری دُعا میں وہ اثر کہاں! لہٰذا اپنی تقصیر کی معافی کا طلب گار ہوں۔

جب ان بزرگوں کی دُعا کا یہ اثر ہے تو سرتاجِ اولیاء کی دُعا کا کیا اثر نہ ہوگا؟

سرکارِ غوثیت مآب رضی اللہ عنہ کے مریدِ خاص سے ایک وقت ابلیس کی ملاقات ہوئی۔ اس نے انہیں ایک مراقبہ بتایا اور اس کے عمل کا طریقہ بھی سکھایا۔ جب اللہ کا فضل کسی پر ہوتا ہے تو کسی طرح اس کی ہدایت کا سامان ہو جاتا ہے۔ دفعتاً انھیں خیال آیا کہ اپنے پیر و مرشد سے اس کی اجازت حاصل کریں۔ اس خیال کے آتے ہی فوراً حضرتِ والا کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ سُنایا۔ وہ تو پیرِ روشن ضمیر تھے۔ سُنتے ہی آپ نے فرمایا کہ کہتا

تو صحیح ہے۔ لیکن قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ دھوکہ باز ہے۔ آئندہ دھوکا دے گا۔ پیرانِ پیر دستگیر کی دستگیری سے وہ ابلیس کے پھندے سے بچ گئے۔ اور ایمان میں کسی قسم کی خلل اندازی ہونے نہ پائی۔

سلطان الھند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سبب سے کسی نہ کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا ضروری ہے تاکہ بروقت صحیح رہبری اور دستگیری ہو۔ ایک اور موقع پر قبر کے سوال وجواب سے متاثر ہو کر آپ نے اپنے ملفوظات میں بیعت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ حضرت رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قادری قربی رحمۃ اللہ علیہ "میزان العقائد" میں اور حضرت مولانا شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ نے "جواہر السلوک" میں بیعت کرنا سنت بتایا ہے۔ یہ سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہے۔

عقیدت مندی کی ایک بے نظیر مثال ملاحظہ ہو۔

ایک خاتون سرکارِ غوثیت مآب رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے سچی عقیدت اور دلی محبت رکھتی تھی۔ ہر سال ربیع الثانی کے مہینے میں اپنے گھر کے در و دیوار کی صفائی اور سفیدی کرا کے ادب و احترام کے ساتھ گیارہویں شریف کی نیاز ادا کرتی۔ مسلمان باورچی سے لذیذ و مرغن کھانا تیار کرتی اور بہت سے مسلمانوں کو پُر تکلف ضیافت کرتی یہ اس کا معمول تھا۔

ایک سال حسب معمول گیارہویں کی نیاز کی تیاری کی اور اپنی تمام خدمات انجام دی۔ لیکن اتفاق سے عین گیارہویں شریف کے روز اس کو دست آنا شروع ہو گئے اور دست میں زیادتی کی وجہ سے حالت قریب المرگ پہنچ گئی۔ اپنے دونوں فرزندوں کو اپنے پاس بلایا اور انھیں نصیحت کی کہ دیکھو اب میرا وقت قریب ہے۔ میری موت پر غم نہ کریں مجھے فلاں کمرے میں رکھ دیں اور باہر سے تالا لگا دیں۔ ضیافت میں شرکت کے لیے جو مہمان آئیں گے ان تمام کی برابر خاطر داری مدارت کرنا اور باقاعدہ انتظام کرنا اور میرا حال کسی پر ظاہر نہ کریں۔ اس وصیت سے کچھ دیر بعد اس خاتون کا انتقال ہو چکا۔ حسبِ ہدایت دونوں فرزندوں نے پورے ضبط و تحمل اور صبر و استقلال کے ساتھ تمام خدمات انجام دیں۔ اختتام ضیافت کے وقت ایک بزرگ کی تشریف آوری ہوی۔ ان کو بھی اندر لے گئے۔ دسترخوان کو کھانوں سے آراستہ کر دیا۔ اور کھانے کی اجازت دی۔ لیکن بزرگ نے کھانا تناول فرمانے سے انکار کر دیا اور کہا جب تک میزبان نہ آئیں گی ہم نہ کھائیں گے۔ ان کے اس جملے سے دو نونہالوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے سبب دریافت کیا۔ عزیز بچوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا فلاں مقام میں لاش پڑی ہے۔ اس کمرہ کا قفل کھولنے کا حکم ہوا تو فوراً ارشاد کی تعمیل ہوی۔ آپ نے اس لاش کی طرف اشارہ کر کے اٹھنے کا حکم دیا۔ تو وہ خاتون زندہ ہو کر اٹھ بیٹھی اور بزرگ

آنا فاناً غائب ہو گئے۔ یہ صحیح مشہورِ عالم واقعہ ہے۔ اور سرکارِ غوث مآب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک زندہ کرامت ہے
ایک اور واقعہ جو پہلی بار منظرِ عام پہ آرہا ہے وہ 1956ء کا ہے۔ دادا میاں صاحب ساکن مینمبور
والدِ حسن بابا صاحب، انسپکٹر آف پولیس نے حضرت مولانا ابو الفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبد القادر
قادری رحمۃ اللہ علیہ سے جو اس وقت سجادہ نشین مکانِ حضرت قطبؒ ویلور تھے بیعت سے شرف یاب ہونے
کی درخواست پیش کی۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ پیشاب کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ اور ہر دس پندرہ منٹ پہ
انھیں پیشاب کی حاجت ہوتی تھی۔ جب بیعت کی اجازت حاصل ہوی تو غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہن کر
آپ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ سب لوگ حجرے میں جمع ہوے۔ اعلیٰ حضرت کے
دستِ حق پہ بیعت سے مشرف ہوے۔ وہ ایک عجیب کیف آور منظر تھا۔ اور جب اُن کے حق میں دعا کی جاری
تھی تو سب حاضرینِ مجلس بیک وقت آمین کہہ رہے تھے۔ دُعا بڑی ہی مؤثر تھی۔

اس موقعہ پر ایک خاص بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ صاحبِ موصوف کی آمد سے لے کر بیعت سے فارغ ہو کر
واپس جانے تک شاید درمیان میں کامل ایک گھنٹہ کا عرصہ گزرا ہوگا۔ لیکن اس اثنا میں ان کو پیشاب کی بالکل
ضرورت محسوس نہ ہوی۔ جس کا مشاہدہ تمام حاضرینِ مجلس نے کیا۔

ان کے بعض احباب کا کہنا ہے کہ انتقال سے ایک ماہ قبل بیماری کی وجہ سے اُن کی زبان بند ہو گئی۔
رشتہ داروں کو تعجب ہوا کہ اُن کو کلمۂ طیبہ کیسے نصیب ہوگا؟ خدا کی شان دیکھیے کہ انتقال سے آدھا گھنٹہ پہلے
زبان جاری ہو گئی اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ سب دوست احباب جو اُن کے قریب جمع تھے اللہ اللہ کہتے
ہوے سن رہے تھے۔ اور بعد ازاں کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا
للہ وانا الیہ راجعون۔

سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی یہ تاثیر و فضیلت ہے کہ جس نے موت کے وقت ان کی دستگیری
اور مشکل کشائی کی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ کی عظمت و بزرگی کا یہ
حال ہے کہ ڈوبنے والوں کو آن واحد میں پار لگا دیتے ہیں۔

قدرت کے کرشمے عجیب ہوتے ہیں۔ باطن کا حال اپنے مخصوص بندوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ اُن کی
وفات کے انتالیسویں (۳۹) دن بعد شب میں حضرت پیر و مرشد قبلہ جب کہ آپ سفید و شفاف لباس زیبِ
تن کئے اپنی خانقاہِ مکانِ حضرت قطب ویلور میں تشریف فرما تھے۔ بحالتِ بشارت اور کشف اُن کو دیکھا
بعد سلام و جواب کے حسبِ عادت حضرت پیر و مرشد نے خیریت دریافت کی۔ کہنے لگے کہ سلسلۂ قادریہ میں
داخل ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے میرے تمام گناہوں کو بخش دیا۔ سکرات کے وقت آپ تشریف

لائے تھے اور اس شیطانِ ملعون کو مجھ سے دُور کیا اور کلمہ کی تلقین کی۔ خدائے قدوس نے اپنی رحمت سے مجھے کلمہ نصیب فرمایا۔

اس موقعہ پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں کے سجادہ نشین کو جو بھی بشارت ہوتی ہے وہ بالکل صحیح ہوتی ہے۔ اس کے متعلق متعدد واقعات ہیں جو بشارت کے مطابق ظاہر ہوتے رہے ہیں۔

اس بشارت کی اطلاع کسی طرح ان کے فرزندِ عزیز جناب حسن پاپا صاحب تک پہنچ گئی جو اب شہر مدراس میں اسسٹنٹ کمشنر آف پولیس کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس واقعہ کے چند دن بعد جب کسی موقعہ پر وہ ویلور آئے تو، اس بشارت کے متعلق راقم الحروف سے دریافت کیا۔ میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اس واقعہ کی حقیقت جاننے کی انھیں بہت زیادہ خواہش اور اضطرابی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے حجرے میں ملاقات کے وقت آپ اس واقعہ کے متعلق اعلیٰ حضرت قبلہ سے دریافت کریں۔ چناں چہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو دورانِ گفتگو میں نے اس کا ذکر کیا۔

حضرت قبلہ نے اس واقعہ کی تصدیق فرمائی۔ پھر آپ نے عزیز موصوف کی خاطر اپنی شیریں بیانی اور موثر زبانی سے مذکورہ بالا واقعہ از ابتدا تا انتہا بیان فرمایا۔ ان موثر کلمات سے متاثر ہو کر حسن پاپا صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا آپ سکرات کے موقع پر وہاں گئے تھے۔ حضرت قبلہ نے جواب یوں کہا کہ میں نہیں، وہ حضرت محبوب سبحانی تھے۔ جو اُن کے پیر و مرشد کی صورت میں ظاہر ہوے تھے۔ یہ حضرت محبوب سبحانی کی چشم دید کرامت اور تصرف ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی ہر جگہ دستگیری فرمایا کرتے تھے۔

حضرت محبوب سبحانیؓ فرماتے ہیں کہ جس نے بھی اس سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تو میں اس پر سایۂ ابر کے مانند سایہ افگن رہوں گا۔ اگرچہ وہ مغرب میں ہو اور میں مشرق میں یا وہ مشرق میں اور میں مغرب میں رہوں۔ (قصیدۂ غوثیہ)

آپ مزید فرماتے ہیں کہ میں اپنے مرید کے خاتمہ کے وقت اس کے پاس روحانی طور پر پہنچتا ہوں اور اس سے شیطانِ ملعون کو دُور کرتا ہوں اور کلمہ کی تلقین کرتا ہوں۔ اللہ عزّ و جل اس کو کلمہ نصیب فرماتا ہے۔ اور مرنے والا کبھی اس دنیا سے بے ایمان رخصت نہیں ہوتا۔ اللہ کے کرم سے اس کا خاتمہ بخیر اور باایمان ہوتا ہے۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء۔ قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو ایک جبٹر عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے جس میں آپ کے تمام متعلقین و متوسلین جو قیامت تک اس سلسلہ میں داخل ہوں گے ان تمام کے نام اس میں مرقوم ہوں گے۔ آپ سفارش فرما کر سب کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ (قولِ الجمیل از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

یہ شان ہے حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی جو سرتاج اولیاء ہیں۔ و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین

●●

وسیلۂ نبی بعد از وصال النبیؐ

مولانا شاہ سید عثمان پاشاصاحب قادری عرف فصیح پاشاہ کامل (عثمانیہ) ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور۔

جہاں کہیں کسی برگزیدہ شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کا ذکر پیدائش سے شروع ہوکر اُن کے وصال پر ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دیگر ہے۔ اس میں سیرت کا ذکر پیدائش سے قبل شروع ہوتا ہے اور ان کے وصال کے بعد بھی جاری وساری رہتا ہے۔ ہم کو ہمارے نبیؐ کی رہنمائی ابھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔

چناں چہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آپؐ نے اپنے امتیوں کو بروقت ہدایت فرمائی ہے جس سے حق و صداقت پہچاننے میں مدد ملی ہے۔ حدیث کے صحیح ہونے یا غلط ہونے کا اشارہ ملا ہے۔ آپؐ نے بشارت کے ذریعہ دینِ اسلام پھیلانے کا حکم صادر فرمایا ہے اور ترکِ وطن کرکے دُور دراز مقامات پر جانے اور تبلیغِ اسلام کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اکثر صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمۂ سلفؒ و خلف نے آیت ولو انھم اذ ظلموا .... کا حکم حیاتِ برزخی سے بھی منسلک رکھا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رحمتِ عالمین کے نقلِ مکان کی وجہ سے ساری امت (جس کے حق میں وہؐ حریص رہے اور ہیں) کو ان کے رشتے سے منقطع کردے، یہ ناممکن ہے کہ جس پر خدا اور ملائکہ اور ساری اُمت شب و روز درود کا تحفہ بھیجتے ہوں، وہ نعوذ باللہ من ذٰلک عام مُردوں میں شمار کئے جائیں۔ جب کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کے حق میں حیات اور رزق کا جاری ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے، ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم

یرزقون ہ (آل عمران : ۱۷۱)

ترجمہ :- اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انھیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں ۔ امتِ نبویؐ کے افراد کا یہ مقام ہے تو آقائے امت کا کیا مقام ہو !

احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ اُمت کے احوال آپؐ کے آگے پیش ہوا کرتے ہیں ۔ اور تحفۂ درود شریف پہنچا دیا جاتا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رحمت عالمؐ کی شفقت امت کے صرف انھیں افراد پر محدود ہو جو آپؐ کے ہم عصر رہے ہوں اور بعد میں آنے والے مسلمان اس شفاعت اور شفقت اور دُعائے استغفار سے محروم رہیں !

یہاں ایک نکتہ یاد رکھئے ۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر شئے کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ۔ ایک ظاہری ایک باطنی نباتات ہوں جمادات بلکہ ہر مخلوق کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک باطنی بھی ۔ ذرا غور وفکر سے یہ پتہ چل جائے گا اسی طرح خلاّق عالم کی بھی دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک صوفیاء کی اصطلاح اور قرآن کی اصطلاح میں خدا کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک وجودی ، ایک شہودی ، ایک ذاتی ایک صفاتی ، ایک احدی ایک واحدی ، ظاہری و باطنی ، اول و آخر ، تنزیہی و تشبیہی وغیرہ وغیرہ ۔

اسی طرح رحمت عالمؐ کے وجود کی بھی کئی حیثیتیں ہیں ۔ احمدی و محمدی ، لوری وخاکی ، رشتۂ الوہی رشتۂ بشری ۔ جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے ۔ خود آقائے امت کی زبانی سنئے

یا ابابکر لو یعوفنی حقیقتی غیر ربّی

(اے ابوبکرؓ ! میری حقیقت کو سوائے میرے رب کے کوئی نہیں جانتا ۔)

غالب نے بھی کیا خوب کہا ہے : ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ داں محمدؐ است

باوجود لباسِ بشری پہنا کے عرش اعظم سے بھیجا جانے والا بشری ذہن وفہم میں سما نہ سکا ۔ اپنا حقیقی لباس پہن کر آتا تو کیا خاک سمجھ میں آتا ؟

علّامہ شیخ قضاعی فرماتے ہیں : کہ اگر بعد وفاتِ رسولؐ جوازِ وسیلہ کے لیے کوئی دلیل نہ بھی ہو تو اس کے لیے حالتِ حیات میں جوازِ توسل پر قیاس کافی ہے ۔ کیوں کہ سرورِ عالم کی حیات باطنی ثابت ہے ۔ اور آپؐ کی شفقت امت پر ہمیشہ رہے گی ۔

شیخ عبدالحق شیرانی فرماتے ہیں کہ علی خواص نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو حضورؐ کا

وسیلہ ضرور پکڑو۔ اس سوال کو فرشتے آپؐ تک پہنچاتے ہیں اور آپؐ طالبِ دعا ہوتے ہیں۔
علامہ قسطلانی "شرح مواہب" میں فرماتے ہیں: روضۂ اقدسؐ پر جانے والوں کو چاہیے کہ خضوع اور تضرع کا دامن تھامے شفاعت طلب کرے۔
بیہقی کی روایت ہے کہ عہد فاروقی میں ایک مرتبہ قحط پڑا۔ ایک عابد نے روضۂ اقدسؐ پر جاکر التجا کی کہ امت کے لیے دعا فرمائیں جو قحط کی وجہ سے ہلاک ہو رہی ہے۔ اس شخص کے خواب میں آقائے دوجہاں تشریف لائے اور فرمایا: جاؤ عمرؓ سے میرا اسلام کہو اور بشارت دو کہ بارش ہوگی۔
خود حضورؐ کی بشری زندگی کے دور میں وسیلۂ نبویؐ سے دعا کرنے کی وجہ سے ایک نابینا کی بینائی لوٹ آئی۔ جو ایک مشہور اور معروف واقعہ ہے۔
حضرت سیّد احمد کبیرؒ کا روضہ پر جانا اور دست بوسی کی التجا کرنا اور حضورؐ کا ہاتھ قبرِ مبارک سے باہر نکلنا اور سیّد احمد کبیرؒ کا اس کو بوسہ دینا روایتوں سے ثابت ہے۔
اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں سورۃ الحجرات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے آداب سکھلاتا ہے۔
اتنی سی بات ہے کہ تمہاری آواز کو نبیؐ کی آواز پر بلند نہ کرو اور اس طرح کلام نہ کرو کہ جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کیا کرتے ہو۔
اُتنی سی بات ہے لیکن غور فرماویں کہ ایسے کرنے پر خدائے عزّوجل کی تنبیہہ ہے کہ تمہارے سارے اعمال تباہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔
اور سورۃ الاحزاب میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں داخل ہونے، کھانے پینے اور کوئی چیز طلب کرنی ہو تو اس کے سارے آداب تفصیل سے سکھلاتا ہے۔
کیا شان ہے اس رسولؐ کی جس کے حق میں خود خدا ادب طلب کرتا ہے۔ اور ان آداب کا ذکر اپنے کلام میں امتیاز اور خصوصیت کے ساتھ سمجھایا ہو کیا یہ آداب حضورؐ کی حیاتِ ارضی کی حالت سے ہی وابستہ تھے۔ کیا بعدِ وفات یہ حکم منسوخ ہو گیا؟ اور اگر جاری ہے تو یہ بھی ثابت ہوگا عقلی اور منطقی رُو سے بھی کہ حیاتِ نبیؐ بھی ثابت ہے اور اس کے ثبوت میں ایک واقعہ لکھنا کافی ہے کہ امام مالکؒ نے خلیفہ منصور کو ہدایت دی تھی جب خلیفہ مسجدِ نبویؐ میں دورانِ گفتگو اپنی آواز کو بلند رکھا۔ خلیفہ نے خاموشی اختیار کر لی اور دورانِ دعا چہرے کو قبلہ کی رُخ پر نہیں بلکہ چہرۂ حضور اکرمؐ کی طرف رکھو اور شفاعت طلب کرو۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ حضورؐ کی وفات کے بعد حجرۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور روتے ہوئے معروضہ پیش کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت میں ایک خاص مقام عطا فرمایا ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں "مقامِ محمود" بتلایا گیا ہے۔ عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا یہی شفاعت کا مقام ہوگا۔ (بنی اسرائیل)

اور بھی کئی مثالیں ہیں جس سے حیات النبیؐ اور حقیقت النبیؐ اور وسیلۂ نبویؐ بہ کمال اتم ثابت کیا جا سکتا ہے۔

دُعا کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑنا تو ایک طرف حضورؐ کے آثار شریف موئے مبارک کا وسیلہ پکڑنا بھی جائز اور ثابت ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ جنگ کے دوران آپؓ اپنی کھوئی ہوئی ٹوپی ڈھونڈنے لگے۔ لوگوں نے حیرانی ظاہر کی کہ جنگ جاری ہے اور آپؓ کو اپنی ٹوپی کی لگی ہے۔ تو یہ راز ظاہر کیا کہ اس ٹوپی میں رحمتِ عالمؐ کے موئے مبارک چھپا رکھا ہوں جس کے توسل سے مجھے جنگوں میں فتح ہوتی رہی ہے۔

اسی طرح دعا کے لیے اولیاء اور صالحین کا وسیلہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ جو اللہ کے نزدیک محبوب ہیں اور جن کے تصرّفات ثابت ہیں۔ قربِ نوافل کے ذریعہ محبوبیت کا وہ مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں حدیثِ بخاری کی رُو سے اللہ محبوب کا ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، پاؤں ہو جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے، آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ ان محبوب بندوں کے صدقے سے رحمت نازل فرماتا ہے۔ حضرت قطبِ ویلورؒ اپنی تصنیف "فصل الخطاب" میں فرماتے ہیں کہ حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہٗ اپنی قبر شریف سے تصرف فرما رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے حضرت عباسؓ رضی اللہ عنہٗ کو وسیلہ قرار دے کر بارش کے لیے دُعا کی تھی۔ حضرت عباسؓ تمام مسلمانوں کا وسیلہ تھے اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لے رہے تھے۔ (اے اللہ! تیرے نبیؐ کی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے دعا میں امّت نے مجھے وسیلہ بنایا۔ اے اللہ اپنے نبیؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی لاج رکھ لے اور حضور اکرم صلعم کے وسیلہ سے دعا قبول فرما۔)

جب بارش ہوئی اور لوگ خوشی اور مسرّت سے حضرت عباسؓ کی خدمت میں تحصیلِ تبرک

کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ھذا واللّٰہ وسیلۃ الی اللّٰہ عزوجل :(واللہ یہی (حضرت عباسؓ) اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ہیں۔

اس سے ارباب فہم کے پاس یہ بات مخفی نہ رہی کہ یہاں دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک صالحین کے توسل کا ثبوت اور دوسرا وفاتِ نبویؐ کے بعد حضور کا وسیلہ کا ثبوت۔ اس سے ہمیشہ کے لیے یہ سنّت قائم ہوگئی کہ قرابت دارانِ رسولؐ کو آگے رکھ کر وسیلہ سے دعا کی جانے لگی۔ اور اس کے بعد کاملین اور صالحین کو اعمال صالح، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی بناء پر بھی اس کو آگے بڑھا گیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے بھی توسلِ عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے۔ اور وضاحت فرمائی ہے کہ صالحین کا توسل درست اور جائز ہے اور صالحین کی مزارات کی زیارت تحصیل سعادت اور اکتسابِ فیض کے لیے ہے۔ امت کے طبقۂ خواص کا بھی یہ معمول رہا ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ میں حضرت ابوحنیفہؒ سے تحصیل تبرک اور اکتسابِ فیض کے لیے اُن کے مزار پر جایا کرتا تھا۔ اور جب بھی مجھے کوئی ضرورت لاحق ہوتی تو دو رکعت نماز پڑھ کر آپ کی قبر پہ جاتا اور آپ کے وسیلہ سے دعا کرتا تو وہ ضرورت بہت جلد پوری ہوجاتی۔

ان صالحین سے دعا طلب کرنا اسی طرح ہے جیسا آج بھی زندگی میں زندہ صلح بندوں سے دعا طلب کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مراد مانگی جاتی ہے اور حاجت طلب کی جاتی ہے تو صرف خداوند سے، قادرِ قدرت سے۔ اسی لیے بوسیلۂ محمدؐ، بحرمتِ سید الانبیاء، الٰہی بحقِ محمدؐ، الٰہی بحرمتِ غوث الابرار، بجاہِ فلاں، بابرکتِ فلاں کہہ کر خطاب اللہ کی طرف ہو۔

نشاط النساء بیگم جن کو لوگ بیگم حسرت موہانی کے نام سے جانتے ہیں، ان کا ایک واقعہ جو سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ کے باب میں ایک پہلو ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ بیگم حسرت موہانی کی ریڑھ کی ہڈی میں کچھ اس طرح خرابی پیدا ہوگئی تھی جو ڈاکٹروں کی رائے میں لاعلاج تھی۔ اور جس کی وجہ سے اُن کے جسم کا نصف حصّہ اسفل کئی ماہ سے بالکل بے حس ہوگیا تھا۔ پلنگ پر پڑے پڑے کئی زخم نہایت درجہ تکلیف دہ پیدا ہوگئے تھے۔ پسلیوں میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ مگر ان کی زبان سے اس کے سوا کہ "جو اللہ کی مرضی اور اس کی مصلحت کا تقاضا" کسی نے بھی کوئی حرفِ شکایت نہیں سنی۔ کبھی کبھی اتنا کہہ دیتیں کہ جب بیماری میں تکلیف کی یہ شدّت ہے تو افتراقِ جسم و جان کے وقت کیا حال ہوگا۔ مگر انتقال سے ایک روز قبل نمازِ فجر کے اول وقت ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا کہ "اب مجھے کسی تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے۔ اسی لیے کہ ابھی ابھی حضرت نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔

تو میں نے دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ مجھ کو بھی مدینہ لے چلیے۔ آپؐ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں ہم تم کو جلد بلالیں گے اور تکلیفِ جان کی نسبت بھی فرمایا کہ ہم ذمہ دار ہیں تم کو ایسی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ چناں چہ مجھے اب کوئی تکلیف نہیں ہے۔ الحمد للہ! کہ نتیجہ بھی واقعی اسی شکل میں ظاہر ہوا۔

سخت تکلیف میں مبتلا مسلمان خاتون کو موت کے وقت کس طرح تسلّی عطا فرمائی بعد از وصال یہ آپؐ کی سیرت کا پہلو اور حیات النبیؐ کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔

وما علینا الا البلاغ ••

"قرآن کے آئینہ میں اولیائے کرام کا حسن و جمال" کا بقیہ صفحہ 201 سے آگے)

بتا دیا کہ ولی اللہ وہ ہوتا ہے جو رب کے لیے سب کو ناراض کرنا جانتا ہو۔

جوانی خوفِ خدا کے جوہر سے آراستہ کرنے کے لیے ہے۔ تقویٰ کے زیور سے حیات کو تابندہ کرنے کے لیے ہے۔ جب ایک نوخیز جوان عجز و تواضع اور رقت و انکساری کا پیکر بن کر اللہ کے حضور سربسجود ہوتا ہے تو روح الامین کو بھی اس کی عبودیت پہ رشک آجاتا ہے۔ اہل اللہ کی خدمت صرف اہل زمین پہ ہی نہیں بلکہ اہل فلک بھی کرتے ہیں۔ چناں چہ جنگ بدر کا واقعہ گواہ ہے کہ ۳۱۳ صحابۂ کرامؓ سربکف میدانِ جنگ میں حاضر ہوئے تو اللہ نے اپنے اولیاء کی تائید میں 5000 فرشتوں کو نازل کیا۔ یہ دورِ صحابہؓ کا تھا۔ بلکہ امروز بھی اولیاء اللہ کی تائید فرما رہے ہیں۔ سیروا فی الارض فانظروا کسی ولی کے اشارۂ انگشت سے دیواروں میں حرکت آئی تو کسی ولی کے آستانہ میں جنگل کے بادشاہ جھاڑو دے رہے ہیں اور کسی ولی کا لکڑی کا پیالہ دریا میں گر گیا تو دریا خود اٹھا کر دے رہا ہے۔ ایک صحابی رسولؐ حضرت سفینہؓ اپنے لشکر سے بچھڑ گئے تھے جنگل میں اکیلے تھے۔ شیر نے انھیں دیکھ لیا اور شکار کے لیے آگے بڑھا۔ وہ بھاگنے کی بجائے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے اور شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ میں اللہ کا ولی ہوں اور راہ بھولا ہوں۔ سنتے ہی شیر کسی پالتو کتے کی طرح عاجزی کے ساتھ قریب آیا اور کہنے لگا میرے اوپر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں تمہارے لشکر تک چھوڑ آؤں گا۔

افریقہ کے جنگلات سے مجاہدین اسلام کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں خوفناک درندے بستے تھے۔ مجاہدین جنگل کے دہانے پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں۔ ہم اللہ سے ڈرنے والے ہیں اے جنگل کے درندو! ہم محمدؐ عربی کے غلام ہیں۔ ہمیں کچھ وقت یہاں گزارنا ہے۔ تم یہ جنگل خالی کر دو۔ یہ کہنا تھا کہ تمام چھوٹے بڑے درندے اپنے بچوں کو ساتھ لے کر جنگل خالی کر دیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ولی صرف انسانوں پہ ہی نہیں بلکہ درندوں اور دریاؤں پہ بھی حکومت کرتے ہیں۔ یہ سارا فیضان اس لیے ہے کہ اولیائے کرام اللہ کے ہو جاتے ہیں اور اللہ بھی ہر کام میں ان کا حامی اور مددگار ہو جاتا ہے۔ جب خدا کی نصرت و قدرت کسی بندے کے ساتھ ہو جائے تو ظاہر ہے قدرت الٰہی کی جلوہ نمائی ہر سو نظر آنے لگتی ہے:

جس نے ذرّوں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
جس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

مولانا مولوی پی ۔ محمد ابوبکر صاحب ملیباری لطیفی قادری ۔ مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ۔ ویلور

علمِ وعملِ صالح اور اخلاص، اخلاق اور فکرِ سلیم کا نام جوہرِ انسانیت ہے ۔ مذکورہ چار چیزیں جس میں جمع ہوں تو کہا جائے گا یہ انسان صحیح قسم کا ہے ۔ جس میں علم کی جگہ جہالت ہو وہ حیوان ہے ۔ علم ہو مگر عمل نہ ہو اور اخلاق نہ ہوں، عمل و اخلاق ہوں مگر نفاق ہے، اخلاص سے عاری ہے تو بے فکرا ہے تو یہ انسان غلط قسم کا ہے ۔

جس میں علم وعمل بھی اخلاص وفکرِ آخرت بھی ہو تو قابلِ اعتماد انسان کہا جائے گا ۔ کیوں کہ انسانیت کو یا انسان کو جو کچھ فوقیت، عظمت یا شرف یا ترفع حاصل ہے وہ مادۂ انسانی سے نہیں اس لیے کہ قرآنِ کریم نے انسانی خلقت کے مادّے کا جہاں جہاں بھی ذکر کئے نجس (گندے) فرمایئے ۔ اگر انسان کو فوقیت، شرف و بزرگی ہے یا ترفع حاصل ہے تو صرف اخلاص اپنے کردار اور کمالات سے ہے ۔

حدیث میں ہے : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلّھم ھَا لکون الّا العالمون و العالمون کلھم ھالکون الا العاملون والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون والمخلصون علی خطرٍ عظیمٍ او کما قال ؐ سب کے سب برباد ہیں مگر بچنے والے اہلِ علم ہیں علماء بھی تباہ ہیں مگر وہ بچیں گے جو علم پہ عمل پیرا ہوں گے ۔ عمل کرنے والے بھی رستگاری نہیں پائیں گے مگر جن میں اخلاص پنہاں ہوگا اور مخلص بندے خطرہ کے دہانے پہ ہیں ۔

کیوں کہ ماورای ان سب کے ایک شئے فکر ہے ۔ اگر فکرِ آخرت نہیں ہے تو سب اعمال کا ابطال ہوگا وہ اس بنیاد پہ کہ نجات دہندہ علم وعمل ہے ۔ اور نہ ہی اخلاص ہے بلکہ ان سب پہ حاوی فکرِ آخرت ہے ۔ ان چار چیزوں کے ذکر سے معیارِ انسان کھل کر سامنے آتا ہے ۔ باعتبار اس معیار کے اگر موازنہ یا تفتیش کی جائے تو انبیاء علیہم السلام کا معیار اونچا ہے اور ان میں اعلیٰ آقائے مدنی ؐ ہیں ۔

یہ دولت قطعی ہے اس میں بوئے جہل نہیں، تردد کی آمیزش نہیں، خالص علم جو چشمہ وحی سے ہے نہ کہ کتابوں سے حاصل کردہ۔ انؐ کے علم سے تو کتابیں وجود میں آتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے: ؎

کوئی کیا جان سکتا ہے میرے سرکار کا رتبہ۔ لقب امّی ہے لیکن علم کے دریا بہاتے ہیں

اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اظہر من الشمس ہے۔ کون ہے جو واقف کارِ عملِ نبویؐ سے نہ ہو؟...

امّت کا عقیدہ بلکہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سجدہ ساری اُمّت کی لاکھوں برس کی عبادت سے افضل ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ صورتِ عمل کی جانب نظر نہیں کرتا تے بلکہ حقیقتِ عمل کی جانب نظر فرماتے ہیں جس عمل میں کامل اخلاص، کامل معرفت ہو وہی عمل وزنی اور ثقیل ہے۔ تو آپؐ سے زیادہ عمل و اخلاص والا ہے! حدیث میں آتا ہے:

اِنی اَخشاکم باللہ و اتقاکم للہ: تم سب سے بڑھ کر خوف وخشیت اور تقویٰ مجھ میں ہے۔ گو علم وعمل اور عبادات کی بنیاد اخلاص پر، فکرِ آخرت پہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کامل اور جامع ہے۔ اولین و آخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپؐ کا عمل کامل ہے وہیں ورع و اخلاص بھی اتنا ہی کامل ہے۔

چوتھا جوہر فکرِ آخرت فرمایا: کان دائم الفکرت حزیناً: آپؐ اکثر و بیشتر دائم الفکر رہتے ہیں۔ جیسے کوئی فکر مند غمگین ہو حزن و ملال میں مبتلا ہو۔ یہ فکرِ آخرت ہے، ہمہ وقت آخرت کا فکر در پیش ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو یہی کمالِ عطیہ میں ملا کہ حقوقِ اہلِ دنیا ادا کریں مگر فکرِ آخرت بھی دامنگیر رہے۔ ایک طرف بیوی بچوں سے معاملہ ہے۔ صحابہؓ سے بھی تعلق ہے، حکومت کے مسائل اور فیصلے بھی صادر ہو رہے ہیں تو دوسری جانب خصومات و جہاد بھی، غنائم کی تقسیم بھی لیکن ہر جگہ فکرِ آخرت سر پہ سوار ہے گویا نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم ہ وان عذابی ھو العذاب الالیم ہ اے نبیؐ میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہ میرا عذاب سخت ہے۔ کا پورا پورا مصداق اور نمونہ۔

جب انسانیت کی تسیر علم وعمل اور اخلاص و فکر سے مکمل ہوتی ہے تو کوئی بُرا فعل اس سے صادر نہیں ہوتا، خلافِ شریعت کوئی عمل اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ خلاف تہذیب کوئی کام رونما نہیں ہوتا۔ اسی کا نام گوہر انسانیت ہے۔ اس کی سیرت اکمل السیّر ہے۔ اس سلسلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: عمدہ خصائل والے کا فعل وعمل اس درجہ کا ہوتا ہے کہ اس کا فعل وعمل قرآن اور حدیث کے خلاف نہیں ہوتا۔ مخاطب کا ذہن قلب و متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا اور جاہلیت یا غلط تہذیب کا خیال تک نہیں گزرتا۔ قرآن کریم نے تجارت کرنے والے کو تاجر کہا ہے اور زمانہ جاہلیت میں خِنسار کہتے تھے تو امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ لاتقولو اخنساراً وقولوا تاجراً اس لیے کہ عمدہ اخلاق کے

مالک کا فعل، قول، عمل کسوٹی پر رکھے جاتے ہیں۔ کہیں اس کا قول قرآن کے خلاف نہ ہو اور حاملِ اخلاقِ حسنہ کا قلب آئینہ ہی آئینہ ہو۔ اس کی نیکی اور بدی اس کو نظر آتی ہو اور وہ خود اس کا مصلح بھی ہو۔ چنانچہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ فن نقاشی میں چینیوں اور رومیوں کا مقابلہ ٹھن گیا کہ اپنے فن میں برتری کس کو حاصل ہے؟ بادشاہِ وقت نے اعلان کیا کہ فریقین کے اسباب مہیّا کئے جائیں۔ اپنا اپنا فن دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔ بادشاہِ وقت نے دیکھا کہ چینیوں نے مختلف قسم کے رنگ طلب کئے اور رنگوں کی آمیزش سے دل فریب اور جان فزا نقش و نگار بنائے کہ عقل چکرا جاتی تھی۔ پھر بادشاہ رومیوں کی جانب گیا۔ انھوں نے اپنے کام پر سے پردہ ہٹایا۔ جس دیوار کو انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے صیقل (آئینہ) بنایا تھا۔ تو چینیوں کے سارے نقش و نگار اور جاں فزا مناظر اس صیقل شدہ دیوار پر منعکس ہو گئے اور ایسا دل آویز منظر پیش کیا کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں سیراب نہ ہوتی تھیں۔ بادشاہ نے فیصلہ صادر کیا کہ رومی چینیوں پر سبقت لے گئے۔

اس حکایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت رومی ارشاد فرماتے ہیں کہ اے عزیز! با خدا اپنا کردار رومیوں کا سا بنا لے اور اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت اور کاری گری مت کر کے تو دنیا بھر کے مناظر، پھول، پتیوں کو دیکھتا پھرے بلکہ دل کو مانجھ مانجھ کر رومیوں کی سی حرفت کر لے۔ دل کو صیقل شدہ آئینہ بنا کہ تجھے دنیا کے مناظر بن بولے نظر آئیں گے۔ تو کہاں دنیا ہی ٹٹولتا ہے؟ اور تجھ میں وہ کائنات موجود ہے کہ تجھے دنیا وہیں بیٹھے نظر آنے لگے گی۔ دیکھو! رومیوں نے وہ کاری گری دکھائی کہ چینیوں کی صنعت و حرفت بھی چھین لی۔ ویسے ہی کمالات اپنے اندر جمع کر نہ کہ جہالات۔ اور اخلاق، وہ جوہر پیدا کر کے تو دوسروں کو چمکانے کا باعث بنے۔

کتبِ حدیث میں یہ بات ملتی ہے کہ ایک بار ابوجہل نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ تم بنت ہی قبیح (بری صورت رکھتے ہو۔) عیاذاً باللہ۔ آپؐ نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔ جنابِ صدیقِ اکبرؓ نے دربارِ رسالتؐ میں قدم رنجہ فرمایا اور عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپؐ کو چاند دیکھے تو شرما جائے۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے سچ کہا۔

پوچھا گیا۔ یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے دونوں کو سچّا فرمایا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس حرکت میں آئی، ارشاد فرمایا: المؤمن مرآۃ المؤمن: چوں کہ ابوجہل وہ ہے اور میں آئینہ ہوں جب اس نے دیکھا تو کہا: تم قبیح ہو۔ اور صدیقِ اکبرؓ نے دیکھا تو میں چاند نظر آیا۔ ہر مومن مومن کا آئینہ ہے، خود پھول ہوتا ہے دوسروں کو بھی گل ہی کہتا ہے۔ صفاتِ گل ہی انکساری، نزاکت، شرمیلا پن خوشبو پیدا

کرو۔ مخاطب بھی وہی نظر آئے گا۔ دل کو آئینہ بناؤ کہ جمالِ الٰہی منعکس ہو۔ ۵

ہر کہ آئینہ باشد پیش رُو   زشت و خوب خویش را بیند درُو

حضرت ساجد ابن الخورشید رحمۃ اللہ علیہ نے اخلاقِ جواہر پاروں کی مثال بڑی عمدگی اور نفاست سے دی ہے۔ رقم طراز ہیں: کہ

"سقراط ۴۶۹ سال قبلِ مسیح پیدا ہوا تھا۔ نہایت محنتی، جفاکش اور صابر ہونے کے علاوہ سادہ و غریبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ تحقیقِ حق اور علمِ اخلاق کی وعظ گوئی میں تمام عمر بسر کی۔ غور و فکر میں اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتا کہ کسی مسئلہ کے سوچنے کے لیے گھنٹوں پہروں ایک ہی جگہ کھڑے دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہو جاتا اور فنِ طب کا موجد اور امام سمجھا جاتا ہے۔ اس نے جڑی، بوٹیوں کی خاصیتیں تجربات کتابوں میں مرتب و مدون کی ہیں۔

ایک دن صبح تا شام تحقیق و تفتیش میں سرگرداں رہ کر بوقت شام شہر کی سمت آیا۔ تھکا ماندہ تھا سڑک کے کنارے کرسی پہ آرام کے لیے بیٹھا۔ نیند نے غلبہ حاصل کیا اور آنکھ لگ گئی۔ اور اس کے پیر سڑک پہ لٹک گئے۔ بادشاہِ وقت کی سواری اتفاق سے ادھر کو آ گزری۔ چوب دار، نقیب حضرات نے ہٹو ہٹو کی صدائیں دیں۔ مگر سقراط کی کانوں میں آواز نہ آئی۔ گہری نیند میں تھا بیچارہ۔ تھکا ہارا بھی جو تھا۔

بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ بادشاہِ وقت بھی کچھ شریف نہ تھا۔ اس کو غصّہ آ گیا اور سواری سے اُتر کر اس نے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ: او احمق اٹھتا کیوں نہیں؟

سقراط آنکھیں ملتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور گھور کر دیکھنے لگا...... بادشاہ نے کہا تو جانتا نہیں میں کون ہوں؟ . . . . .   آنکھیں ملنے ہی کی حالت میں سقراط نے کہا کہ جی ہاں! غور تو کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں اور اب تک تو اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ شاید آپ کسی جنگل کے درندہ ہیں اس لیے کہ درندوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ زمین پر اس طرح نیچے کو پیر مارتے ہیں گرد و غبار اڑانے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چوں کہ ٹھوکر ماری اس لیے میں یہ سمجھا کہ درندہ آ گیا ہے۔ بادشاہ غصّہ سے تلملا گیا۔ اور کہا کہ اے جاھل! تو نہیں جانتا میں بادشاہِ وقت ہوں۔ شاہی تاج میرے سر پہ ہے۔ لباسِ فاخرہ میں ملبوس ہوں اور اتنی سواریاں پس و پیش چلتی ہیں۔ اتنے ملک کے خزانے میرے قبضہ میں ہیں۔ اس طرح اس نے اپنی نعمتیں گنوائیں۔ سقراط نے کہا: یہ سب چیزیں اپنی ذات سے اچھی ہیں۔ اس سے تجھ کو کیا شرف اور بزرگی ملی۔ وہ خوبی بتا جو تیری ذات میں ہو۔ معلوم ہوا کہ تجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ اور آدمی کو اپنے ذاتی کمالات سے رفعت و شرافت ملتی ہے۔ نہ کہ جمالات سے ---!

حضرت ساجد ابن الخوئیث یدؒ نے عمدہ خصائل پر اور اوقات پہ بیان کی ہوئی نصیحتیں قلم بند فرمائے ہیں، جو سقراط کی بیان کردہ ہیں۔

اے عزیز نیک خو ہونا تمام حکمت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ اسی سے امن وسلامتی محبت و الفت ایک دوسرے سے اُنسیت پیدا ہوتی ہے۔

خوبی اور نیکی دولت سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ دولت خوبی اور نیکی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ یاد رکھو فتح طاقت کی نہیں بلکہ انسانی جواہر اخلاقِ حسنہ کی ہوتی ہے۔

نیک خو انسان کو حین حیات یا بعد الموت کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ غرض وہ جواھر انسانی اخلاقِ حسنہ عمدہ خصائل ہیں جو کسی کی آسمانِ صحافت پر پہنچاتے ہیں اور یہی اوصافِ رذیلہ ہیں جو تحت الثریٰ کو پہنچا دیتی ہے۔ جو اونچا ہے اس کو زمین پر پٹخ دیا جاتا ہے اور نیچا ہے اُسے بلندی پر لے جایا جاتا ہے۔ مضمون کے ہم خیال شاعر کا ہم مفہوم شعر ہے: ۔

پستی سے سربلند ہوا، سرکشی سے پست		اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

ابنِ عبدالبرؒ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کانو یتعلمون الھدیٰ کما کانو یتعلمون العلم کہ سلف صالحین کی شان یہ تھی کہ جیسے علم کو سیکھا کرتے ویسے ہی علم اخلاق بھی۔ مطلب یہ ہے کہ بڑی کاوش کے بعد غوّاص (غوطہ زن) کو وہ صدف ہاتھ آتی ہے جس میں گہر ہوتا ہے۔ تیراک کو صدف نہیں ملا کرتے ہو بہو یہ جواھر اور کمالات کاوش ہی سے اور اپنی ساخت ہی سے وجود میں آتے ہیں نہ کہ کسی کے عطیہ اور تحفہ سے۔

خدا ہر مومن کو غوّاصِ علم ودینِ شریعت اور اخلاق اعلیٰ کا حامل وہ راہِ ھدایتِ عالی کا رھرو بنائے۔ آمین! ثم آمین !!

وما علینا الا البلاغ ••

- اگر ایک سال کا منصوبہ ہو تو کھیتی کرو۔
  اگر دس سال کا منصوبہ ہو تو درخت اگاؤ۔
  اگر سو سال کا منصوبہ ہو تو عوام کو تعلیم دو۔ (چین کا محاورہ)
- ایک عاقل کے ساتھ تھوڑی دیر کلام کرنا دس سال کتابوں کے مطالعہ بہتر ہے۔ (لانگ فیلو)
- علم خوش حالی کے وقت گوہر ہے اور تنگ دستی میں پناہ ہے۔ (ارسطو)

مولوی ابوالحسن محمد رمضان القادری کلیان پوری مدرس دارالعلوم لطیفیہ ویلور

دو مغائر چیزوں کے مابین ربط پیدا ہو جانے کو نسبت کہتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی جگہ بڑی اہمیت و عظمت کا حامل ہے۔ نسبت و تعلق کبھی اچھوں سے ہوا کرتی ہے اور کبھی بروں سے۔ اچھوں سے ہو جائے تو الحمد للہ لیکن بُروں سے ہو جائے تو ہمارے نزدیک اس کا کوئی مقام نہیں..... اس مختصر سے مقالہ میں فقط محبوبانِ خدا سے نسبت کا ذکر کیا جا رہا ہے...... یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے کہ جس چیز کا نسبت و تعلق محبوبانِ خدا کی ذات گرامی سے ہو جائے، اگرچہ وہ چیز کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو مگر اس کا مرتبہ و مرتبہ اس قدر عظمت اور بلندی والا ہو جاتا ہے کہ ہماری ناقص و کوتاہ عقل اس کی رفعت و بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ یقین فرما لیجیے کہ جس طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور دوسرے بزرگانِ دین، حضرت حق جل مجدہٗ کے محبوب ہیں اسی طرح جن جن چیزوں کو آپ حضرات سے نسبت و تعلق ہے وہ چیزیں بھی بارگاہِ ربّ العزت میں اتنی محبوب ہو جاتی کہ ان سے محبت رکھنے والا بھی محبوبیتِ خدا کی منزل پر فائز ہو جاتا ہے۔ چند اشارات پیشِ خدمت ہیں۔

قرآنِ شریف میں ہے: وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى: یعنی: اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ۔ (کنز الایمان)

مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت اللہ کی تعمیر فرما رہے تھے۔ ایک روایت

میں ہے کہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہو جاتا تھا اور نیچے اُترنے کے وقت نیچا ہو جاتا تھا، اس پتھر کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے قدم مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے ظاہر ہے کہ ایک بے حِس و بے شعور پتھر میں یہ ادراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہو جائے اور یہ تاثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قدموں کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے یہ سب آیاتِ قدرت ہیں جو بیت کے اعلیٰ فضیلت ہی سے متعلق ہیں۔ قرآن شریف میں ہے کہ: واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم: یعنی جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام بیت اللہ کی دیواروں کو تعمیر کر رہے تھے تو یہ دعا مانگتے تھے کہ اے پروردگار تو ہماری اس خدمت کو قبول فرما لے۔ بے شک تو ہماری دعاؤں کا سننے والا ہے اور ہماری نیتوں کا جاننے والا ہے۔ ..... یہ آپؑ کا معجزہ ہے کہ پتھر موم کی طرح نرم ہو گیا اور آپؑ کا نقش قدم اس پر پیوست ہو گیا۔ اور آپؑ کے اس نقشِ قدم کی وجہ سے یہ پتھر "مقام ابراہیم" کہلانے لگا اور اس کو اس نسبت کی وجہ سے ایسی عزّت و کرامت حاصل ہوئی کہ قرآنِ عظیم نے دو جگہ اس کی عظمت کا تذکرہ کیا۔ ایک جگہ فیہ اٰیٰتٌ بینٰتٌ مقام ابراھیم: یعنی کعبۂ معظمہ میں ربّ البیت کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ نیز انھیں نشانیوں میں سے ایک نشانی "مقامِ ابراہیمؑ" بھی ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ: واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّٰی: یعنی: اے مسلمانو! تم طوافِ کعبہ کے بعد نماز تو خدا کے لیے پڑھو، سجدہ خدا کا کرو۔ مگر تم اپنی پیشانیاں اس پتھر کے پاس زمین پر رکھ کر سجدہ کرو۔ جس پر ایک اللہ والے کے قدموں کا نشان بنا ہوا ہے۔

ایک پتھر کو ایک اللہ والے سے اتنا تعلق پیدا ہو گیا کہ اس کے قدموں کا اس پر نشان بن گیا نیز اس پتھر کی محبوبیت کا یہ عالم کہ قرآن اس کی مدحت کا خطیب بن گیا۔ اور یہ پتھر تمام حجاجِ بیت اللہ کی سجدہ گاہِ عجیب بن گیا۔ ..... حضرت ابراھیم علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کے پیارے ہیں تو ان کے نشانِ قدم کو اپنے سینے پر اٹھانے والا پتھر بھی خدا کے نزدیک اتنا پیارا ہو گیا کہ اس پتھر کے پاس پیشانی رکھ کر جو سجدہ کیا جائے وہ سجدہ بھی خدا کا پیارا ہو جاتا ہے۔ ..... اس پتھر کو یہ امتیاز حاصل ہوا محض ایک نبی کے نشانِ قدم کی نسبت و تعلق سے۔

اصحابِ کہف کے کتّے کی ایک مثال

حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتّا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہونے اور بخاری شریف کی ایک حدیث بروایتِ ابن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ جو شکاری کتے یا جانوروں کے محافظ کتے کے علاوہ کتا پالتا ہے تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط گھٹ جاتے ہیں۔ کتوں کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس کی وجہ سے ثواب میں کمی آتی ہے اور برکت ختم ہوجاتی ہے۔

ان روایاتِ حدیث کی بناء پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگ اللہ والوں نے کتا اپنے ساتھ کیوں لیا؟ یا یہ کہ یہ کتا خود ساتھ ہولیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم کتا پالنے کی ممانعت شریعتِ محمدیہ کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ دینِ مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو، یہ قرینِ قیاس بھی ہے کہ یہ لوگ صاحبِ جائداد اور صاحبِ مویشی تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے کتا پالا ہو اور جیسا کہ کتے کی وفاشعاری آج بھی معروف و مشہور ہے۔ یہ حضرات جب شہر سے چلے ہوں گے تو وہ بھی ساتھ لگ گیا ہو۔ ابنِ عطیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے اس کی نیکی کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے۔ دیکھو اصحابِ کہف کے کتے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ شریف میں ذکر فرمایا:۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ جب ایک کتا صلحاء اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پا سکتا ہے تو آپ قیاس کرلیں کہ مومنین، موحدین جو اولیاء اللہ اور صالحینِ کرام سے الفت و محبت رکھیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا..... بلکہ اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لیے تسلی اور بشارت ہے۔ جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اس کتے کو جو بزرگی اور عزت ملی وہ صرف اس لیے کہ اس نے اپنا تعلق اللہ والوں سے پیدا کیا جن کا تذکرہ قرآنِ شریف میں سورۂ کہف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

یہ کتا ماسوا کتوں سے ممتاز و مشرف ہوا۔

یہ تو خدا کے محبوبوں کا حال ہے کہ جن چیزوں کو آپ سے نسبت و تعلق ہوجائے وہ بھی بلندی کی منزل پہ پہنچ جاتی ہیں۔

ذرا آپ اندازہ لگائیں کہ جن چیزوں کا نسبت و تعلق ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوجائے اس کا مقام کتنا بلند و بالا ہوگا۔

دیکھیے قرآنِ عظیم میں رب العزت جل جلالہٗ ارشاد فرماتا ہے:

لا اقسمُ بھٰذا البلدِ وَ انت حلٌّ بھٰذا البلد۔ (ترجمہ) مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔

مکہ میں مقامِ ابراہیم ہے، چاہِ زمزم ہے، صفا و مروہ ہے غرض سینکڑوں عظمتیں اور ہزاروں بزرگیاں اس مقدس شہر کی گود میں جلوہ فگن ہیں۔ اس کے باوجود پروردگارِ عالم اس شہر کی قسم

کا ذکر فرماتا ہے تو یوں فرماتا ہے کہ مجھے شہر مکہ کی اس لیے اور اس بنا پر قسم ہے کہ اے محبوب یہ شہر تمہارا مسکن ہے ۔ معلوم ہوا کہ مکۃ المکرمہ اپنی بے شمار سابقہ عظمتوں کے باوجود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ وسلم کی نسبت کی وجہ سے اتنا مکرم و محترم ہو گیا کہ پروردگارِ عالم اس کی عظمت کی قسم بیان فرماتا ہے ۔ مرزا غالب نے کہا ہے کہ :

ہر کس قسم بآں کہ عزیز است می خورد سوگند کردگار بجانِ محمدؐ است

ہر شخص کو جو چیز پیاری ہوتی ہے اس چیز کی وہ قسم کھاتا ہے ۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیبؐ کی جان سب سے پیاری ہے اس لیے خداوند عالم کبھی اپنے محبوب کے کلام کی، کبھی ان کی زندگی کی، کبھی ان کی زلفِ مبارک کی اور کبھی اُن کے شہر مقدس کی قسم کا ذکر فرماتا ہے ۔

جیسا کہ درجِ ذیل اشعار میں ایک عاشقِ صادق، مداحِ رسولؐ نے اس مفہوم کو واضح فرمایا ہے

ہے کلامِ الٰہی میں شمس الضحیٰ ترے چہرۂ نور فزا کی قسم
قسمِ شبِ تار میں راز یہ تھا کہ حبیبؐ کی زلفِ دوتا کی قسم

ترے خُلق کو حق نے عظیم کہا تری خِلق کو حق نے جمیل کہا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہو گا شہا ترے خالقِ حسن و ادا کی قسم

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا ترے شہر و کلام و بقا کی قسم

جیسا کہ یہ آیتِ کریمہ ہے : لَعَمرُكَ اِنَّھُمْ لَفِی سَكرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ : یعنی اے محبوب! تمہاری جان کی قسم بے شک وہ اپنے نشے میں بھٹک رہے ہیں ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی جان کی قسم کا ذکر فرما رہا ہے ۔ نیز مخلوقِ الٰہی میں سے کوئی بارگاہِ الٰہی میں آپؐ کی جان پاک کی طرح عزت و حرمت نہیں رکھتی اور اللہ تعالیٰ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے سوا کسی کی عمر وحیات کی قسم نہیں فرمائی ۔ یہ مرتبہ صرف حضورؐ ہی کا ہے ۔ (تفسیر نعیمی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق کی بات آئی تو ایک دو اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں ۔

حجرِ اسود اور حجاجِ کرام

پتھر تو بہت سارے ہیں، لیکن پتھر پتھر میں فرق ہے ۔ بعض وہ ہے جس سے زمین کا فرش تیار کیا جاتا ہے بعض وہ ہے جو بول و براز کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے ۔ لیکن قربان جائیے اس پتھر پہ جس پتھر کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لبہائے مقدس سے بوسہ دے کر اس کی عظمت و عزت میں چار چاند

لگا دیا۔

چناں چہ ایک مرتبہ سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حجر اسود کے روبرو کھڑے ہو کر یہ عرض کرتے ہیں: انك حجرٌ لا تنفع ولا تضر: بے شک تو ایک پتھر ہے نہ نفع بخش سکتا ہے نہ نقصان۔ میں تجھے بوسہ اس لیے دے رہا ہوں کہ یہ سنّت ہمارے نبی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ انھوں نے اپنے لب ہائے مقدسہ سے بوسہ دیا ہے۔ اس پتھر کو تمام پتھروں میں نسبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ممتاز ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اسی طرح تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مدینۂ منورہ کا نام "یثرب" تھا۔ یہ شہر وباؤں کا مرکز اور بیماریوں کا گھر تھا۔ مگر رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم جب اس شہر یثرب میں تشریف فرما ہوئے تو آپ کے قدم مبارک کی نسبت وتعلق سے یہ مدینۃ الرسول کہلانے لگا۔ نسبت رسول ﷺ ہونے کی وجہ سے یہ شرف حاصل ہوا۔ پہلے یہ بیماریوں کا گھر تھا، لیکن اب "دار الشفاء" اور تمام روحانی اور جسمانی امراض کا شفا خانہ بن گیا۔ چناں چہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ:

تربة ارضنا بريقة بعضنا يشفى سقيمنا باذن ربنا۔ یعنی مدینہ شریف کی مٹی لعابِ دہن میں لگا کر جس مریض کو بھی استعمال کرائی جائے اس کو خدا کے حکم سے شفا حاصل ہوگی۔ سچ کہا ہے مولانا حسنؔ بریلوی علیہ الرحمہ نے ؎

نہ ہو آرام جس بیمار کو سارے زمانے سے اٹھا لے جائے خاک تھوڑی ان کے آستانے سے

امّتِ محمدیہ سابقہ امتوں کی عمریں دراز ہوا کرتی تھیں، ان کے اعمال بھی بہت ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امت محمدیہ کی عمریں بہت کم، اعمال بھی اسی طرح لیکن فضیلت ومرتبہ میں سابقہ امتوں سے بہت بلند۔ چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے کہ كنتم خير امةٍ أخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر: یعنی اے امت محمد ﷺ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم بہتر امت ہو۔ ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اس آیتِ کریمہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ یہودیوں میں سے مالک بن صیف اور وھب ابن یہودا نے حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تم سے افضل ہیں اور ہمارا دین تمہارے دین سے بہتر ہے۔ جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ..... ترمذی شریف

میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا دستِ رحمت جماعت پر ہے۔ جو جماعت سے جدا ہوا وہ دوزخ میں گیا۔ غرض کہ اس اُمّت کو جو مقام و مرتبہ اور خیر الامم ہونے کا شرف حاصل ہے محض وہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق قائم ہونے کی وجہ سے .....

دار العلوم لطیفیہ مرکزی علمی، دینی اور روحانی درس گاہ محتاج تعارف نہیں۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ مدارس و مراکز تو بہت ہیں لیکن اسے جو شرف و بزرگی حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ صدیوں سے تشنۂ علمِ دین کو سیراب کر رہا ہے۔ چوں کہ اسے خصوصیت کے ساتھ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے نسبت و تعلق ہے اور سرکار کے حسبِ ارشاد اس کی بنیاد پڑی وہ اس طرح سے کہ

اعلیٰ حضرت مولانا مولوی سید شاہ عبد اللطیف قادری علیہ الرحمۃ والرضوان وطنِ مالوف بیجا پور کو خیر باد کہہ کر جُدا ہوئے تو دورانِ سفر چند مقامات پر قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں مقامات میں سے ایک مقام اور آخری مقام سرزمینِ ویلور (ریاستِ تامل ناڈو) میں ایک مخصوص جگہ قیام پذیر ہوئے (مرضئ مولیٰ ہمہ از ہمہ اولیٰ لموجب) حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شرفِ بشارت سے نوازتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے فرزند! اس مقام سے تم علمِ دین پھیلاؤ ... یہاں مدرسہ بناؤ، یہاں مسجد بناؤ اور یہاں خانقاہ بناؤ۔ جب آپ صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو بعینہٖ مدرسہ، مسجد اور خانقاہ کی بنیاد کے اشارات کو موجود پایا۔ آپ حسبِ ارشادِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم مدرسہ اور مسجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور علم دین کا روحانی قلعہ ایسا تیار کر دیا کہ آج تک اس کی کرنوں سے نکلی ہوئی شعاعیں پورے جنوبی ہندوستان کو روشن و منوّر کر رہی ہیں۔ اس کے فیوض و برکات کا سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔ اور ان شاء اللہ العزیز جب تک مرضئ مولیٰ ہو۔

آج کے دور میں مدارس کی کمی نہیں۔ لیکن اس ادارے کو جو بزرگی اور ام المدارس ہونے کا شرف حاصل ہے وہ صرف اسی سبب سے کہ اسے حضور سیّدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ وسلم سے نسبت و تعلق ہے اور آپ[۴] کے حسبِ ارشاد ادارے کی بنیاد پڑی ..... گویا ..... [۵]

جنگل تھا یہاں علم کا گھر دیکھ رہے ہیں

حاصلِ کلام!

اللہ والوں کی ذات سے نسبت و تعلق ہو جائے تو وہ چیز اپنے ماسوا چیزوں سے ممتاز ہو جایا کرتی

(بقیہ صـ 151 پر)

مولوی محمد عبد اللہ خان مجاہد لطیفی ۔ مدرس دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ، ویلور

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت، تدبر اور فتوحات سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔ مصر کی فتح سراسر ان ہی کے تدبر و قیادت کا نتیجہ تھی۔ خلافتِ اموی کے قیام میں ان ہی کی سیاست کارفرما تھی۔ اپنے عہد کے سیاست میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مورخین نے اتفاق کیا ہے کہ عرب کی سیاست تین سروں میں جمع ہوگئی تھی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ، زیاد بن ربیعہ رضی اللہ عنہ۔ اتفاق سے یہ تینوں سر مل کر ایک ہوگئے۔ انھوں نے سیاسی حکمت عملی سے اسلامی سیاست کا دھارا اس طرف پھیر دیا جدھر وہ پھیرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست نے شکست نہیں دی تھی۔ اس میں سب سے کارفرما دماغ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تھا۔ ایک ایسے سیاسی مدبر نے موت کا کس طرح خیر مقدم کیا ذیل کی سطروں میں اس کی وضاحت ملے گی۔

جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کرلی اور عرب کے اس دانش مند کو زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی فوجِ خاصہ کے افسر اور سپاہی طلب کئے اور لیٹے لیٹے اُن سے سوال کیا:

"میں تمہارا کیسا ساتھی تھا؟"

"سبحان اللہ! آپ نہایت ہی مہربان آقا تھے۔ دل کھول کر دیتے تھے۔ ہمیں خوش رکھتے تھے۔ یہ کرتے تھے وہ کرتے تھے۔" وہ بڑی سرگرمی سے جواب دینے لگے۔

ابنِ عاصؓ نے یہ سن کر بڑی سنجیدگی سے کہا :

"میں یہ سب کچھ صرف اس لیے کرتا تھا کہ تم مجھے موت کے منہ سے بچاؤ گے کیوں کہ تم سپاہی ہو اور میدانِ جنگ میں اپنے سردار کے لیے سپر تھے، لیکن یہ دیکھو! موت میرے سامنے کھڑی ہے اور میرا کام تمام کر دینا چاہتی ہے۔ آگے بڑھو اور اسے مجھ سے دور کر دو۔"

سب ایک دوسرے کا حیرت سے منہ تکنے لگے۔ سب پریشان تھے کہ کیا جواب دیں۔

"اے ابوعبداللہؓ" ۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے کہا: "واللہ ہم آپؓ کی زبان سے ایسی فضول باتیں سننے کے ہرگز متوقع نہ تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ موت کے مقابلہ میں ہم آپؓ کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔"

انھوں نے آہ بھری "واللہ یہ حقیقت میں خوب جانتا ہوں۔" انھوں نے حسرت سے کہا۔ "واقعی تم مجھے موت سے نہیں بچا سکتے۔ لیکن اے کاش! یہ بات میں پہلے سے سوچ لیتا۔ اے کاش! میں نے تم میں سے کوئی ایک آدمی بھی اپنی حفاظت کے لیے نہ رکھا ہوتا۔ ابنِ ابی طالب (حضرت علیؓ) کا بھلا ہو کیا ہی خوب کہا تھا۔ "آدمی کی سب سے بڑی محافظ اس کی موت ہے۔" (طبقاتِ ابنِ سعد)

راوی کہتا ہے "ہم عمرو بن العاصؓ کی عیادت کو حاضر ہوئے۔ وہ موت کی سختیوں میں مبتلا تھے۔ اچانک دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اُن کے بیٹے عبداللہؓ نے کہا کہ آپ روتے کیوں ہو! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ آپ کو یہ بشارتیں نہیں دے چکے ہیں۔" اور پھر انھوں نے بشارتیں سنائی۔" لیکن ابنِ عاصؓ نے روتے ہوئے سر سے اشارہ کیا پھر ہماری طرف منہ پھیرا اور کہنے لگے :

"میرے پاس سب سے افضل دولت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ہے اور مجھ پر تین حالتیں گزری ہیں :

ایک وقت وہ تھا کہ رسول اللہ سے زیادہ میں کسی کی اپنے دل میں دشمنی نہیں رکھتا تھا۔ میری سب سے بڑی تمنّا یہ تھی کہ کسی طرح قابو پا کر آپؐ کو قتل کر دوں۔ اگر اس حالت میں مر جاتا تو یقیناً جہنمی ہو کر مرتا۔

پھر ایک وقت آیا جب خدا نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا۔ میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا: عرض کیا: یا رسولؐ اللہ ہاتھ بڑھایئے میں بیعت کرتا ہوں۔ آپؐ نے دستِ مبارک دراز کیا۔ مگر میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپؐ نے فرمایا: عمرو تجھ کو کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: یہ شرط کہ میری بخشش ہو جائے۔ اس پر ارشاد ہوا: اے عمرو کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسلام اپنے پہلے تمام گناہ مٹا دیتا ہے۔ ہجرت بھی مٹا دیتی ہے۔ حج بھی مٹا دیتا ہے۔"

ابنؓ العاص کی مشہور روایت ہے جسے شیخین نے بھی روایت کیا ہے۔

اس وقت میں نے اپنا یہ حال دیکھا ہے کہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے دوسرا انسان محبوب تھا اور

نہ رسول اللہ سے زیادہ کسی کی عزت میری نگاہ میں تھی۔ میں سچ کہتا ہوں اگر مجھ سے آپؐ کا حلیہ پوچھے تو میں بتا نہیں سکتا کیوں کہ انتہائی عظمت وہیبت کی وجہ سے میں آپؐ کو نظر بھر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر میں اس حالت میں مرجاتا تو میرے جنتی ہونے کی پوری اُمید تھی۔"

پھر ایک زمانہ آیا جس میں ہم نے بہت سے اونچ نیچ کام کئے۔ میں نہیں جانتا اب میرا کیا حال ہوگا۔ جب میں مروں تو میرے ساتھ رونے والیاں نہ جائیں، نہ آگ جائے۔ دفن کے وقت مجھ پر مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا۔ میری قبر سے فارغ ہو کر اس وقت میرے قریب رہنا جب تک جانور ذبح کر کے ان کا گوشت تقسیم نہ ہو جائے۔ کیوں کہ تمہاری موجودگی سے مجھے انس حاصل ہوگا۔ پھر میں جان لوں گا کہ اپنے پروردگار کو کیا جواب دوں۔" (طبقات ابن سعد)

ہوش وحواس آخری وقت تک قائم تھے۔ معاویہ بن خدیج عیادت کو گئے تو دیکھا کہ نزع کی حالت ہے۔ پوچھا، "کیا حال ہے؟" آپؓ نے جواب دیا: "پگھل رہا ہوں۔ بگڑتا زیادہ ہوں بنتا کم ہوں۔ اس صورت میں بوڑھے کا بچنا کیوں کر ممکن ہے۔" (ابن سعد)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ عیادت کو آئے، سلام کیا، طبیعت پوچھی۔ کہنے لگے:

"میں نے دنیا کم بنائی مگر دین زیادہ بگاڑ لیا۔ اگر میں نے اس کو بگاڑا ہوتا جسے سنوارا ہے اور سنوارا ہوتا جسے بگاڑا ہے تو یقیناً بازی لے جاتا۔ اگر مجھے اختیار ملے تو ضرور اسی کی آرزو کروں اور بھاگنے سے بچ سکوں تو ضرور بھاگ جاؤں۔ اس وقت تو میں منجنیق کی طرح آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہو رہا ہوں۔ نہ اپنے ہاتھوں کے زور سے اوپر چڑھ سکتا ہوں نہ پیروں کی قوت سے نیچے اتر سکتا ہوں۔ اے میرے بھتیجے! مجھے کوئی ایسی نصیحت کر جس سے فائدہ اٹھاؤں۔"

ابن عباسؓ نے جواب دیا:

"اے ابو عبداللہ! اب وقت کہاں؟ آپ کا بھتیجا تو خود بوڑھا ہو کر آپ کا بھائی بن گیا ہے۔ اگر آپ رونے کے لئے کہیں تو میں حاضر ہوں۔ جو مقیم ہے وہ سفر کا کیوں کر یقین کر سکتا ہے؟"

عمرو بن العاصؓ یہ جواب سن کر بہت افسردہ ہوئے اور کہنے لگے: "کیسی سخت گھڑی ہے۔ کچھ اوپر اسّی برس کا سن۔ اے ابن عباسؓ! تو مجھے پروردگار کی رحمت سے ناامید کرتا ہے۔ الٰہی تو مجھے خوب تکلیف دے، یہاں تک کہ تیرا غصہ دور ہو جائے اور تیری رضامندی لوٹ آئے۔"

ابن عباسؓ نے کہا: "ابو عبداللہ! آپ نے جو چیز لی تھی وہ تو نئی تھی اور اب جو چیز دے رہے ہو وہ چیز پرانی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

اس پر وہ آزردہ خاطر ہو گئے۔ "ابن عباسؓ! مجھے کیوں پریشان کرتا ہے! جو بات کرتا ہوں اُسے کاٹ دیتا ہے۔"

عمرو بن العاصؓ اکثر زندگی میں کہا کرتے تھے۔ "مجھے اُن لوگوں پر تعجب ہے جن کے موت کے وقت حواس درست ہوتے ہیں مگر موت کی حقیقت بیان نہیں کرتے۔"

لوگوں کو یہ بات یاد تھی جب وہ خود اس منزل پر پہونچے تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے یہ مقولہ یاد دلایا۔ ایک روایت میں ہے کہ خود اُن کے بیٹے نے سوال کیا تھا۔ عمرو بن العاص نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا:

"جانِ من! موت کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔ موت ناقابلِ بیان ہے لیکن میں اس وقت صرف ایک اشارہ کر سکتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان زمین پر ٹوٹ پڑا ہے اور میں دونوں کے درمیان پڑ گیا ہوں۔"
(الکامل: جلد اول)

"گویا میری گردن پر رضوی پہاڑ رکھا ہے۔ گویا میرے پیٹ میں کھجور کے کانٹے بھر گئے ہیں۔ گویا میری سانس سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے۔" (ابن سعد)

اسی حال میں انھوں نے ایک صندوق کی طرف اشارہ کرکے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا:

"اسے لے لے۔" آپ کے بیٹے عبداللہ کا زہد مشہور ہے۔ انھوں نے کہا:

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" عمروؓ نے کہا: "اس میں دولت ہے۔" عبداللہ نے پھر انکار کیا۔ اس پر ہاتھ مل کر کہنے لگے: "کاش! اس میں سونے کی بجائے بکری کی مینگنیاں ہوتیں!" (الکامل: جلد اول)

جب بالکل آخری وقت آ گیا تو انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دئے، مٹھیاں کس لیں اور دعا کے لیے یہ کلمات زبان پر تھے۔

"الٰہی تُو نے حکم دیا اور ہم نے حکم عدولی کی۔ الٰہی تو نے منع کیا اور ہم نے نافرمانی کی۔ الٰہی میں بےقصور نہیں ہوں کہ معذرت کروں۔ طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آ جاؤں۔ اگر تیری رحمت شاملِ حال نہ ہوگی تو ہلاک ہو جاؤں گا۔"
(ابن سعد الکامل)

اس کے بعد تین مرتبہ کہا: "لا الٰہ الا اللہ۔" اور جان بحق ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ●●

عورت آئینۂ اسلام میں

مولوی سیّد ریاض الدین لطیفی (کڈلوری) مدرس دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ سراسر خیر و رحمت اور عدل و انصاف کا دین ہے۔ اسلام وہ تعلیم کا رائج ہے کہ آج تک نہ کسی مذہب نے ایسی تعلیم دی ہے اور نہ ہی اس کی مثال پیش کر سکتا ہے۔

دین اسلام نے عورت کو بڑا اونچا لائق و مساوی مقام دیا اور یہ مقام عورت کو کسی مذہب نے نہیں دیا۔

قرآن کہتا ہے: اِنَّ المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات ٥ مرد اور عورت کو مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ عبادات، اخلاق و معاملات یکساں ہیں تو مبدا رفیاض سے فرق نہیں۔ عقل نقل اس کو جھٹلاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو اہتمام تعلیم اخلاق زیادہ ہے۔ حدیث میں ہے: محسن انسانیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگو! میری وحی کا آدھا علم صحابہ کرام سے حاصل کرو اور تنہا ادھا علم عائشہ رضؓ سے۔ گویا ام المؤمنین اتنی بڑی عالِم کہ نبوت کا آدھا علم ان کے پاس ہے۔ حضرت عائشہ ایک عورت ہی تو ہیں اللہ نے آپ کا رتبہ اتنا بلند کر دیا کہ وحی کا آدھا علم سے سرفراز فرمایا اور آدھا علم سارے صحابہ میں تقسیم کر دیا۔ وہ رتبہ ملا کہ ہزاروں صحابہ کو پیچھے کر دیا۔ عورت جب ترقی پہ آتی ہے یوں آسمان صحافت کو چھو جاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے عورت کی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔ دین میں ہو کہ دنیا میں، علم و فضل میں برابری کر سکتی ہے دنیاوی امور میں پیش پیش رہ سکتی ہے۔ مگر اس سے حدودِ شرعیہ ٹوٹتے نہ ہوں اور احکامات کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو جیسے کہ بعض عقل سے پیدل لوگ فیشن، غلط راہ روی سیر و سیاحت کو مقام و ترقی تصوّر کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ عورت کی ترقی نہیں بلکہ تنزلی ہے۔ ہر عورت کو مساوی رتبہ مل سکتا ہے مگر وہ دین و شریعت

کی راہ سے آئے تو سہی ؟

بیوی اپنے شوہر کی ہمدرد اور غم خوار ہوتی ہے اور رحم دل بیوی نعمتِ غیر مترقبہ ہوتی ہے منجانب اللہ ! حدیث میں آتا ہے : حضرت جابرؓ کا لڑکا سخت بیمار تھا ۔ جانکنی کا عالم تھا اور آپؓ کو ایک ضروری سفر درپیش تھا ۔ آپؓ نے دوا دارو کا حکم دیا اور سفر پہ روانہ ہوئے ۔ واپسی تک لڑکے کا انتقال ہو گیا ۔ جب آپؓ تشریف لائے تو دانش مند بیوی نے اپنے آپ کو سنبھال کر ایسا چہرہ بنایا جیسے کوئی غم لاحق ہوا ہی نہ تھا ۔ استقبال کیا اور ہاتھ چومے ۔ آپؓ نے خیریت پوچھی فرمایا تو کہا الحمد للہ ! بعافیۃ و خیر اور دسترخوان پر بٹھایا اور عرض کیا میں آپؓ سے ایک مسئلہ حل کرنا چاہتی ہوں ۔ آپؓ نے فرمایا : پوچھو ! تو عرض کیا کسی نے کوئی چیز کسی کے پاس امانت رکھی اور جب وہ امانت کی واپسی چاہے تو بغیر کسی غم کے دیدینا چاہیئے کہ نہیں ؟

آپؓ نے فرمایا : ہاں ! واپس کرتے ہوئے کوئی غم نہیں ہونا چاہیئے تو مؤدب اور مہذب طرز میں عرض کیا : کہ میرے سرتاج ہمارا بیٹا خدا کی امانت تھا اللہ نے وہ امانت لے لیا ۔

حضرت جابرؓ نے بجائے غم کے خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا جزاک اللہ خیرًا ۔ یہ خدا کا عطیہ ہے کہ اللہ نے غیر معمولی صلاحیت واستطاعت عورت میں ودیعت کر رکھی ہے ۔ اس طرح کی بیسیوں مثال تاریخ میں ملیں گی ۔ !

تاریخ شاہد ہے ، تاریخ اسلام نے بڑی عظیم عورتیں پیدا کی ہیں ۔ جو علماء ، اتقیاء اصفیاء کی ہم پلہ رہی ہیں ۔

حضرت امام جعفر کی ایک تصنیف طحاوی ہے ۔ حدیث کی اونچی کتاب ہے ۔ مدارس عربیہ میں داخل نصاب بھی ہے ۔ باپ حضرت جعفرؒ بیٹھ کر حدیثیں سنایا کرتے اور ان کی بیٹی حدیثوں کو لکھا کرتیں ۔ اور ترتیب و تزئین میں مصروف رہتی اس طرح طحاوی شریف مرتب ہوی ۔ اور عالمی شہرت پائی ۔

عورت ایک بہترین مہذب مربی ہے تربیت میں مثال نہیں رکھتی اسی لیے کہا گیا کہ ماں کی گود بچّہ کا پہلا مدرسہ ہے ۔ والدین کا بچہ نقال ہوتا ہے ۔ جیسے ماں باپ ہوں گے ویسی ہی اولاد ہوگی ، جیسا درخت شاخیں ہوں گی ویسے پھل آئیں گے ۔

حضرت حسن بصری مشہور بزرگ گزرے ہیں اس دور کی ولیہ حضرت رابعہ عدویہ خاتون تھیں ۔ حضرت رابعہ نے حضرت حسن بصری کو پانی پہ مصلّی بچھا کر نماز پڑھتے دیکھا تو آپ نے ہوا میں اپنا مصلّی معلق

کر دیا۔ اور عبادت کرنے لگیں۔ جب حسن بصری نے دیکھا تو مصلّی لپیٹ لیا دونوں کی ملاقات ہوی تو رابعہ عدویہ نے دو جملے ارشاد فرمائیں جو فارسی کے شاعر نے قلم بند کیا ہے:

"بر آب روی خسے باشی و بر ہوا بری مگسے باشی دل بدست آر کہ کسے باشی"

"اے حسن اگر آپ نے پانی پہ تیر لیا تو کوڑا کباڑ بھی تیرتا ہے۔ اگر رابعہ ہوا میں اڑ گئی تو مکھیاں بھی اڑتی ہیں یہ تو کوئی کمال نہ ہوا بلکہ کمال تو یہ ہے کہ نفس پہ قابو پاؤ۔ بندۂ خدا معنیٔ حقیقی میں بنو۔"

حضرت حسن نے فرمایا: کہ رابعہ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔

یہ بھی تو عورتیں ہیں۔ کوئی وجہ نہیں امام طحاوی کی بیٹی ہی محدث بنے اور رابعہ کی کوئی اور مثال پیدا نہ ہو۔ وہی علم، وہی دین، وہی نسل آج بھی موجود ہے۔ صرف توجہ اور بے توجہی کا فرق ہے۔ آج کی عورتیں اس طرف مائل نہیں ہوتیں۔ کمال نہیں پیدا ہوتا ....

اگر ایسا ہی نمونہ ہے تو امام بخاری، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، بابا فرید گنجشکر نظام الدین اولیاء جیسی ہستیاں وجود میں آسکتی ہیں۔

عورت تو وہ ہے جس کی بنیاد پہ اجڑا گھر آباد ہو جائے۔ کنبہ، خاندان کا ماحول دین و شریعت سے سرشار ہو جائے۔ رتبہ مقام تو اس سے ہے۔ عورت کو چاہیے کہ اپنے آپ کو آئینۂ اسلام سے پہچانے۔

وما علینا الا البلاغ ••

اقطابِ ویلور رحمۃ اللہ علیہم کی علمی و دینی خدمات

ڈاکٹر پی نثار احمد صاحب۔ ریڈر و انچارج صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو۔ مدراس یونیورسٹی

حضرت مکان ویلور کی تاریخ مسلمانان جنوبی ہند اور خاص کر تامل ناڈ کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف معروف ہے بلکہ قابل قدر بھی۔ آج بھی حضرت مکان اسی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ماضی میں مسلمان اور غیر مسلم اس مقام بزرگ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہاں کے علماء نے اپنی دینی خدمات سے اس پورے خطّے کو ہدایت کی روشنی سے منوّر کیا تھا۔ حضرت مکان کے قیام سے پہلے کوئی خاص مرکز علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے لیے اس علاقہ میں نہیں تھا۔ ممکن ہے کہیں کہیں مساجد وغیرہ میں تعلیم و تدریس کا انتظام رہا ہو۔ لیکن تاریخ کے اوراق ان درس گاہوں کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں۔

زوالِ سلطنتِ بیجاپور کے بعد سیاسی حالات کے پیشِ نظر اس خاندان کے بزرگوں نے بیجاپور سے ہجرت کی یہاں پہنچے اور اسی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ مسجد بنائی، خانقاہ کا قیام عمل میں آیا اور دھیرے دھیرے ایک مدرسہ بھی وجود میں آیا۔ جہاں سے علم کی روشنی پھیلی اور اس روشنی نے مزید کئی ایک شمع جلائی جس میں مدرسۂ باقیات الصالحات بھی شامل ہے، جس کے مؤسس مولانا عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی پہلے پہل مدرسۂ لطیفہ ہی سے سیراب ہوئے تھے۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ یہاں کے بزرگوں نے صرف خانقاہی مزاج کو عام کیا تھا۔ یہ تصوّر حقائق کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں کے علماء نہ صرف یہ کہ تصوّف و معرفت کے مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ انھوں نے عوام الناس کی ہدایت کے لیے شریعت کے احکام کی بھی تبلیغ کی علاوہ ازیں انھوں نے غیر مسلموں تک

دعوتِ توحید بھی پہنچائی۔ یہاں تک کہ حضرت قطب ویلور نے برطانوی حکم رانوں کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ نتیجتاً حضرت کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال یہاں کے بزرگ اسلام کی مکمل دعوت عوام و خواص کے سامنے پیش کرتے رہے اور ذاتی طور پر ان کے مزاج پر تصوف کا رنگ غالب رہا۔

اس خاندان کے بزرگوں میں حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی، حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی اور حضرت مولوی سید شاہ عبداللطیف، قطبِ ویلور بہت مشہور ہیں، جن کی دینی اور علمی خدمات نے کئی صدیوں سے اس علاقہ کے مسلمانوں کو راہِ اسلام پر گامزن رکھا ہے۔ ان بزرگوں کے حالات مختصراً حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی

حضرت کا اصل نام رکن الدین محمد تھا، لیکن سید ابوالحسن قربی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بتاریخ ۱۴ر شعبان المعظم ۱۱۱۸ھ بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ حضرت کے خاندان کا رشتہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم سے منسوب ہے جو خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بغداد، اصفہان، نجف وغیرہ جیسے مقامات پر سکونت اختیار کی اور پھر ہندوستان کا رُخ کیا۔ یہاں بھی شمالی علاقوں سے گزرتے ہوئے بیجاپور میں رہائش اختیار کی اور نوابانِ کرناٹک کے دور میں ویلور پہنچے اور اسی کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا۔ حضرت قربی کے ذوقِ علم اور ان کی صوفیانہ طرزِ حیات اور علمی خدمات کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب "مطلع النور" میں کہتے ہیں : ؎

سندِ اہلِ علم و فن و کلام	حجۃ الصوفیۃ بلند مقام
اور تھا یوں علوم میں فاخر	عالم علم باطن و ظاہر
اور تھا عقل و نقل کا جامع	نور ہر علم اس سے تھا لامع

ابنِ عربی کی "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" اور حضرت شیخ عبدالکریم کی "الانسان الکامل" کے مطالعے سے حضرت کے مزاج کے اندر تصوف و معرفت کا رنگ گہرا ہوا۔ "تحفۃ الاحسن فی مناقب السید ابی الحسن" میں حضرت باقر آگاہ رقمطراز ہیں :

"در چند روز از تدریس نسخ مختصر عربیہ نیز فراغت حاصل کردند فصار فی اقل الزمان ممتازاً بین الاماثل والاقران۔"

شیخ مخدوم عبدالحق ساوی حضرت کے استاد بھی تھے اور حضرت قربی نے ان سے بیعت بھی کی اور شیخ ساوی کی تعلیم و تربیت سے حضرت قربی کے علوم و مدارج میں ترقی ہوئی۔ خود حضرت قربی ایسے استاد محترم شیخ ساوی کی بزرگی اور ان کے مقام بلند اور ان سے استفادے کا ذکر بصورتِ شعر اپنے قصیدے میں کیا ہے۔ یہ قصیدہ "جواہر الاسرار" کے عنوان سے مشہور ہے۔ حضرت کہتے ہیں : ؎

از نفس حیاتر سم مخدوم زتو مستم	شد عشق خدا درسم مخدوم زتو مستم
تا تو نظرے کردی ایں مس چوزرے کردی	بس خوش ہنرے کردی مخدوم زتو مستم
تا کردہ ام از نو دق من معرفت مطلق	گشتم زتو حق الحق مخدوم زتو مستم
ہر ذرہ کہ می بینم از وجہ تو گل چینم	زاں صاحب تمکینم مخدوم زتو مستم

اس طرح ہم دیکھتے ہیں حضرت قربی نے اپنے دور کے نہایت ہی بزرگ علماء و اولیاء کرام سے استفادہ کیا اور عوام و خواص کے درمیان علم و معرفت کی شمع کو جلائے رکھا۔

حضرت کی مشہور و معروف تصانیف حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ رسالۂ اثباتِ وجودِ حقیقی
(۲) رسالۂ حق الحق
۳۔ رسالۂ بحر الاسرار
۴۔ رسالۂ برہانِ قاطع فی بیانِ توحید الجامع
۵۔ الدلیل المحکم فی توحید الاقوم
۶۔ عین الاعیان
۷۔ خق المعرفت
۸۔ حق المعرفت
۹۔ تحفۃ الذاکرین
۱۰ تقویۃ الایمان
۱۱۔ منہج التحقیق فی افضلیۃ الصدیق۔

ان کتابوں کے علاوہ بھی اور مزید تقریباً ۱۴ کتابیں حضرت نے تصنیف فرمائیں جن میں بزبانِ فارسی ان کا دیوان جو "دیوانِ قربی" کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں حضرت نے علوم و اسرار کے مختلف نکات کو بہترین اسلوب کے اندر بیان کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اسی دیوان سے منقول ہیں : ۵

اے آہ برق پیرم بگذر زہر زہ گردی	از حال دل خبر دہ یک بار جان ما را
شاہی و ملک شاہی قربی جوئے نہ سنجد	در ملک فقر دستی بالا است بوریا را
بحمد اللہ سعادت دارد امشب	کہ مہمان شد بت عیارم امشب

۵

موقوف قیامت شدہ است دیدن نادیدن	در دیدۂ عشاق تجلی دوام است
قربی چہ کنی فکرت نزدیکی و دوری	خوش باش رہ وصل دل آرام دو گام است

حضرت قربی کے بعد ان کے فرزند بزرگ سید شاہ عبد اللطیف ذوقی نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین و علم کی خدمت کی اور عوام الناس کو علوم نبوئیہ کے نور سے منور کرتے رہے۔ حضرت ذوقی ۱۱۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ پہلے پہل فارسی کی تعلیم حاصل کی لیکن حضرت ذوقی نے ابتدائی تعلیم کے دوران زیادہ دلچسپی

نہیں دکھائی۔ لہٰذا ان کے والدِ محترم حضرتِ قربی انھیں شیخ ناصر کے پاس لے گئے تاکہ وہاں وہ منبع العلوم سے شاداب ہوں۔ پھر اسی طرح حافظ شیخ محمد حسین سے عربی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں بھی حضرت ذوقی نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی لہٰذا خود حضرت قربی فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ پھر شیخ نظامی گنجاوی کے پاس پہنچے۔ یہاں یکسوئی کے ساتھ حضرت ذوقی نے ذوقِ تلمذ کو کمال تک پہنچایا۔ خود ذوقی تعلیم کے مختلف مراحل کے متعلق کہتے ہیں : ؎

من آنم کز زمان طفلی آہنگ	ندارم جز براہ علم و فرہنگ
بہ ہفتم سال قرآن کردم آغاز	شد از وی دیدہ عرفان من باز
چو شد سال دہم با من برابر	بگل گشتِ گلستاں برزدم برابر
بسوے بوستاں پس کردم آہنگ	گلہ بگرفت از ہم آب و ہم رنگ
بہ نحو و صرف کردم آن زمانِ رو	نہ شد بر طبع من حل مشکل او
دوران مدّت سوادم بود کمتر	بہ پیچیدم ز درش آں زمان بسر
چو گشتم یا نزدہ سالہ ز تقدیر	نہادم رو بعلم کشتی و تیر
بہ بند کشتی او فتادم	بہر بند از کشایش باز دادم
دراں مدت لشبی در خواب دیدم	ز بخت خویش دولت یاب بودم
بخواب آمد برمن نام دارے	خردمندے عزیزے باوقارے
بگفتا در فلاں جا شیخ نامی	شہنشاہ سخن گویان نظامی

اس قصیدہ کے آخری اشعار کے اندر حضرتِ ذوقی شیخ نظامی کی تربیت کے فیوضِ علمی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں : ؎

کنون در روز و شب در بند آنم	کہ شمعِ علم افروز دبجا نم
شکر گفتاریم از جہد خود نیست	کہ زینسان شعر گفتن جز مدد نیست
بود یاری اگر من شیخ پیوست	بادہ باب سخن را نم زبردست

اس طرح حضرت ذوقی نے علوم کو تکمیل کی۔ پہلے فارسی میں عبور حاصل کیا، پھر عربی کے اندر بھی مہارت حاصل کی اور اس مہارت کو اپنی کوششوں کے نتیجے کی بجائے اس کو فضلِ الٰہی کا اثر سمجھا۔ یہی اللہ والوں کی صفت کی دلیل ہوتی ہے کہ اپنے ہر عمل کو اللہ ہی کے فضل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یہی چیز آج ہمارے اندر مفقود ہے۔

"انشاء لطفِ الٰہی میں رقم طراز ہیں :

" ایں قدر علم فقیر را اعانتِ نمودہ بجائے رسانیدہ کہ از گفتن و نوشتن بیرون است و ایں ہمہ تحصیل در عربی در بست و دو سالگی بود و ہمدراں ایام فقیر چہار کتب خمسہ تصنیف کردہ" **فی الجملہ فقیر را قوت استنباط من عنداللہ است نہ از مواد ظاہر**" اس طرح حضرت ذوقی بھی اپنے خاندان کے بزرگوں کی راہوں پر چلنے لگے اور ۱۱۸۲ھ میں حضرت قربی کی وفات کے بعد ان کی مسند پر رونق افروز ہوئے اور عوام الناس کی ہدایت کے لیے سلسلۂ مواعظ شروع کیا۔ ترسیلِ علم کے ساتھ غرباء و فقراء کی خدمت بھی کرتے تھے۔ کوئی سائل اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ ضمیمہ " جواہر السلوک" میں خود حضرت کے پوتے لکھتے ہیں:

" از امراُ و اغنیاء نہایت بے پروا بود و در جود و کرم بے ہمتا سائل را محروم نمی نمود و زیادہ از دو لک روپیہ بہ سائلاں عنایت فرمود و ہر روز در لنگر خود یک صد و بست سیر برنج بہ مستحقان تقسیم می نمود"

نوابانِ آرکاٹ بھی حضرت سے استفادہ کرتے رہے تھے۔ نواب محمد علی والاجاہ نے تنجاور کی فتح سے پہلے حضرت سے اجازت چاہی۔ حضرت نے دعا کی اور نواب محمد علی والاجاہ فتح یاب ہوئے اور خوش ہو کر جاگیر عطا کی لیکن شیخ نے پروانۂ جاگیر کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس لیے کہ وہ " از امراء و اغنیاء نہایت بے پروا بود" اور متوکلاً علی اللہ ان کی زندگی کے روز و شب ہوتے تھے۔

حضرتِ ذوقی نے " تفسیر لطیفی" کے نام سے قرآنِ مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ یہ تفسیر بزبانِ فارسی لکھی تھی اور اس کا ایک نسخہ جس میں ابتدا سے سورۃ الاعراف تک کی تفسیر ہے۔ حضرت مکان کی لائبریری میں موجود ہے۔

" لطائف لطیفی" تصوف کے موضوع پر حضرت کی ایک اہم کتاب ہے۔ " انشائے عقائدِ ذوقی" حضرت کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں عقائد کی اصلاح کے مسائل قلم بند کئے گئے ہیں۔ یہ خطوط حضرت ذوقی نے عوام کے استفسار پر جواباً تحریر کئے تھے۔ اسی طرح " انشائے لطف اللٰہی" " انشائے قادری" اور " انشائے باقری" وغیرہ حضرت کے خطوط کے مجموعے ہیں جو حضرت نے مختلف لوگوں کے نام لکھے تھے اور پھر خود جمع کر کے کتابی شکل دے دی۔ " رکنِ رکین" فی ترجمہ جنہ حصنِ حصین" جو علامہ جزری کی عربی تالیف " حصنِ حصین" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضرت اس عربی کتاب کا ترجمہ صرف تین دن میں مکمل کیا۔ خود حضرت اپنے ذوقِ علم و عمل کے متعلق کہتے ہیں:

" چوں بسیاری از اخوان تعلیم" جنہ حصن حصین " شوق تمام داشتند و دریافت مطالب آں بسبب استعدادِ عربی متعسر می انگاشتند فقیر عبادت آں را بفارسی ترجمہ نمود و ایں کتاب را مسمی بہ رکن رکین فی ترجمہ" جنہ حصن حصین" گردانید"

علاوہ ازیں اور بھی گراں قدر کتابیں علم و ادب کے موضوع پر حضرت ذوقیؔ نے تصنیف کیں۔
جن میں مندرجۂ ذیل کتابیں بہت مشہور ہیں:۔
(۱) قصائد ذوقی۔ (2) دیوانِ قدیم۔ (3) مجموعۂ رباعیات۔ (4) ہدیۂ اخبار (۵) عشق نامہ۔ (6) چمن محبت۔ (7) چہار فصل۔ (8) معجز مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سیرت النبیؐ (منظوم)
اس کے علاوہ اور متعدد کتابیں حضرت ذوقیؔ نے تحریر فرمائیں اور اس طرح علوم نبویہ اور ادبِ اسلامی کے خزانوں میں اضافہ کیا اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک بے بہا دولت چھوڑ گئے۔ جس سے آج بھی فیض یاب ہوا جا سکتا ہے۔ اگر کچھ اہلِ قلم حضرات اس کی طرف توجہ دیں۔

حضرت قطبؒ ویلور

حضرت سید شاہ عبد اللطیف حضرت ذوقیؔ کے پوتے اور سید شاہ ابو الحسن محویؔ کے فرزند تھے۔ حضرت بمقامِ ویلور ۵ ار جمادی الآخر سنہ ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ بزرگانِ حضرت مکان میں حضرت کا مقام بہت اونچا سمجھا جاتا ہے۔ حضرت نے ابتدائی تعلیم ویلور ہی میں حاصل کی۔ کم عمری ہی میں عربی و فارسی پر دسترس حاصل کر کے علومِ متداولہ پر عبور حاصل کیا۔ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کی "تحفۂ اثنائے عشریہ" کے مطالعہ سے حضرت بے حد متاثر ہوئے اور چاہتے تھے کہ دہلی جا کر حضرت شاہ عبد العزیز سے راست علم حاصل کریں۔ لیکن والدۂ ماجدہ کے مشورہ پر رُک گئے۔ پھر مدراس پہنچے اور مدرسۂ کلاں میں ملک العلماء مولانا علاؤ الدین احمد اور دیگر علماء سے مختلف علوم سیکھے۔ حضرت نے انگریزی بھی سیکھی تا کہ ملک پر قابض انگریزوں کی اسلام کے خلاف سازشوں کا جواب دے سکے۔ پھر ۱۲۴۲ھ میں ویلور واپس ہوئے۔ اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حضرت مکان کو پھر ایک بار مرکزِ رشد و ہدایت بنایا۔ ہزاروں طالبانِ علم یہاں سے فیض یاب ہونے لگے۔ حضرت کے جمعہ کے خطبے عوام و خواص سب کے لیے راہِ ہدایت کے سبب بنے۔ حضرت عالم بھی تھے صوفی منش بھی۔ اسی طرح اچھے خطیب بھی تھے اور انگریزی زبان کی معلومات سے حضرت کی خدمات کو ایک نئی جہت ملی۔ یعنی انھوں نے انگریزوں سے بھی علمی بنیادوں پر رابطہ قائم کیا۔ پادریوں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور بھی کیا اور خود عیسائی حکمرانوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دینے لگے۔ اور ملکۂ وکٹوریہ کو اسلام کا پیغام بھیجا۔ نتیجتاً بغاوت کے الزام میں پچاس دن مقیّد کئے گئے۔ لیکن اپنے کام کو برابر جاری رکھا۔ ملک کے غیر مسلم راجہ، مہاراجوں کو بھی اسلام کی دعوت پیش کی اور خود مسلمان حکمرانوں کی اصلاح بھی کرتے رہے۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت صرف خانقاہی مزاج کے بزرگ نہیں تھے

بلکہ وہ تبلیغ اور نفاذِ شریعت کے لیے بھی کوشاں رہے۔ حضرت نے دو مرتبہ حج کیا۔ پہلی بار سنہ ۱۲۶۱ھ میں زیارتِ حرمین شریفین کی پھر ۱۲۹۲ھ میں واپس ہوئے۔ دوسرا حج سنہ ۱۲۸۸ھ میں کیا اور اسی حج کے بعد مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

حضرت کا شمار اقطابِ عالم میں ہوتا ہے اور قطبِ ویلور کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح حضرت نے علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ جو آج بھی قابلِ قدر ہیں۔ جن کے مطالعہ سے آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو جِلا ئے روحانی مل سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کوشش تو کی جائے پھر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

حضرت کی تمام کتابوں میں "جواہر السلوک" نہ صرف یہ کہ بہت مشہور ہے بلکہ موضوع تصوّف پر ایک اہم دستاویز بھی ہے۔ "جواہر الحقائق" بھی اسی موضوع کے دیگر پہلوؤں پر لکھی ہوی حضرت کی ایک اور مشہور کتاب ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال پیدا کرنے کے لیے بھی حضرت نے کوشش کی اور اس سلسلہ میں ایک کتاب "فصل الخطاب بین الخطاء والصواب" تحریر فرمائی۔ ازالۂ بدعات کے لیے "تنبیہ الجاھلین" لکھی۔

تبلیغ توحید و سُنّت کے لیے "احیاء التوحید" اور "احیاء السنّۃ" کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں۔ علاوہ ازیں ایک اور کتاب "صراط المومنین" کے نام سے لکھی۔ علاوہ ازیں مندرجۂ ذیل کتابیں لکھیں جو اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کے ادراک کے لیے نہایت ضروری ہے۔

(۱) رسالہ بذکر الف مقام۔　(2) خود شناسی۔　(3) خدا شناسی۔
(۴) دنیا شناسی　(5) آخرت شناسی　(6) مکتوباتِ لطیفی۔

"جواھر السلوک" حضرت کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے جسے حضرت نے نواب والاجاہ کی بہن کے نواسے تقی حسین خان کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا۔ تقی حسین خان کو علوم اسلامیہ سے بہت دلچسپی تھی۔ لہذا انھوں نے حضرت سے استدعا کی کہ اسلام کے روحانی نظام و احوال پر ایک کتاب تحریر فرمائیں۔ اور اس طرح حضرت نے "جواھر السلوک" تصنیف کی۔ خود حضرت غایتِ تالیف کے متعلق کہتے ہیں۔ ؎

شد باعث نظم ایں رسالہ　　نوابِ زماں امیر دولہ
مشغول حصول علم رالیش　　ناظم مشغول در دُعالیش
حق حافظ حال آن یگانہ　　بادا ز نوائب زمانہ
از قیدِ خودی دہد رہائی!　　واطلاق خودیش آشنائی

این است حیات جاودانی — تولید ولادت است ثانی
از لطف تو شاد کن مرا و رہا — انسان مراد کن مرا و رہا
در خورد و بزرگ شاد و خرم — با خوردی خود بزرگ عالم
تا علم بنا مدہا است مسطور — نامش معلوم باد مشہور
سال رقمم رسالہ ظاہر — گردید باسم پاک غافر
خواہم ز عطائے رب غفار — غفرانِ گنہ من گنہگار ۱۲۵۸ھ
صلوات و سلام رب رحمان — بر جان جہان مراد اکوان

اس طرح ان بزرگوں نے باصطلاحات علوم تصوف "سعادت ابدیۃ" کے حصول کے لیے کوشش کرتے رہے اور غیبی نظام نے انھیں ان علاقوں میں جس مقصد کے لیے روانہ کیا تھا اُسے معراج کمال تک پہنچانے میں ہر دم کوشاں رہے۔ اور آیندہ نسلوں کے لیے علم کا خزانہ چھوڑ گئے۔

جزاءھم اللہ احسن الجزاء وھو علی کل شئی قدیر ●●

(بقیہ مضمون "نسبت سے نسبتے ممتاز ہوتی ہے" ص 138 کا بقیہ)

ہیں۔ اور اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھتا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اللہ والوں سے اپنا لگاؤ اور نسبت و تعلق برقرار رکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے نسبت و تعلق برقرار رہ کر اس کا قرب حاصل ہو۔ جیسے کہ مذکورہ اشارات سے واضح اور متشرح ہوا۔ وما علینا الا البلاغ المبین ●●

("سید شاہ مرتضیٰ قادری" بقیہ ص 157 کا مضمون)

زیب لحد کیے گئے۔

مرحوم کی ہستی نادر روزگار ہستی تھی۔ اپنے وقت کے زبردست عالم اور عمدہ ادیب و صحافی تھے۔ آپ کی عظمت کے تعین کے لیے صرف "جریدۂ روزگار" کی فائلیں بھی کافی ہوسکتی ہیں۔ ان میں مطبوعہ مضامین سے جو علمیت، جو بصیرت اور جو ذہانت ٹپکتی ہے اسی سے آپ کے وقار، تدبر علمی کا ثبوت ملتا ہے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی اس طرف توجہ دے اور اس علمی سرمایہ کا گہرا مطالعہ کرکے اس کی عظمت کو منظر عام پر لائے۔ ●●

خانوادۂ قطبِ ویلور کے ایک مایہ ناز سپوت

ڈاکٹر سید صفی اللہ، ایم اے، ایم لٹ، ریڈر شعبۂ عربی، اردو، فارسی و سینیٹ ممبر، یونیورسٹی آف مدراس

آج مجھے قبلہ حضرت پیر صاحبؒ۔ مرحوم سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ و برادرِ صغیر قبلہ اعلیٰ حضرت صاحب بہت یاد آرہے ہیں۔ موصوف کو اس طرح کے مضامین بہت پسند تھے۔ بہت پہلے "اللطیف" کے حضرت مخدوم ثانی عبدالغفار مسکینؒ پر ایک مضمون قلم بند کرکے روانہ کیا تھا۔ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت مکان سے حضرت مسکینؒ کے روحانی تعلق پر پہلی بار اس مضمون کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی تھی۔ مضمون اتنا پسند فرمایا کہ مجھے لکھا: آپ نے اسے اتنی جلدی کیوں ختم کر دیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ مضمون ختم ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ ختم ہوگیا تو میں بے چین ہو اٹھا۔

اگلے سال کے لیے مسکینؒ کے علمی مرتبہ پر ایک اور مضمون کا وعدہ تھا۔ مرحوم کو میرے اس مضمون کا بڑی بے چینی سے انتظار رہا۔ اگلے سال کے شمارے کی کتابت کے دوران کچھ صفحات اس کے لیے خالی رکھ چھوڑے تھے۔ آخری وقت تک آپ کو اس مضمون کا انتظار رہا۔ کاش میں نے انھیں مایوس نہ کیا ہوتا! ان کی خواہش پوری کر دی ہوتی!! آج بھی جب یہ بات یاد آجاتی ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔

آج وہ ہوتے تو اس مضمون سے بھی بہت خوش ہوتے کیوں کہ اس کے ذریعہ پہلی بار ایک ایسی ہستی منظرِ عام پر آرہی ہے جو خود خانوادۂ حضرت قطبِ ویلور کے بزرگ ارکان کی یادوں کو تازہ کر دے گی۔ اس امید پر یہ مضمون شائع کرا رہا ہوں کہ کم از کم اس کے ذریعہ مرحوم کی روح کو تسکین پہنچا سکوں۔ امید ہے کہ قبلہ حضرت پیر صاحب مرحوم کی روح ضرور اس تذکرہ سے خوش ہوگی۔

سید صفی اللہ

حضرت سید شاہ مرتضیٰ قادری عرف ویلوری بادشاہ خانوادۂ حضرت قطبؒ ویلور کے ایک مایہ ناز سپوت ہیں جنہیں بعد زمانہ نے بالکل بھلا دیا۔ آپ کا تعلق اس خانوادہ سے یوں ہے کہ آپ کے والدِ بزرگوار حکیم حاجی سید شاہ محی الدین قادری نبیرۂ حضرت قطبؒ ویلور تھے اور سید محمد صاحب قادری خلیفہ و دامادِ حضرت قطبؒ ویلور مرحوم کے برادرِ بزرگ۔ ویلور میں موصوف کے دو ہمشیرگان اور حقیقی برادر زادہ سید اسمٰعیل قادری بھی موجود تھے۔ خود آپ کے والد کا مولد ویلور تھا۔

حضرت سید شاہ مرتضیٰ قادری سادات حسینی سے تھے اور قادری سلسلہ سے نسبت رکھتے تھے۔ حضرت تاج الدین سید عبدالرزاق صاحب زادۂ حضرت محبوب سبحانی کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے جدِّ اعلیٰ حاجی الحرمین مولانا سید یوسف قادری حضرت محبوب سبحانی کے بر سلسلہ چھٹے پوتے تھے۔

محمد شاہ بہمنی کے عہد میں نجف اشرف سے گلبرگہ تشریف لائے تھے۔ شاہانِ بہمنیہ کے روحانی استاد تھے آپ کا مزار بجامع مسجدِ قلعہ کی جانبِ مشرق مسجد سے ملحق ہے۔ آپ کے سلسلہ کے تین اور بزرگ حضرت سید شرف جہانگیر قادری و اشرف جہانگیر قادری اور سید یونس ثانی قادری شہر مذکور میں مدفون ہیں۔ 1904ء میں مطبوعہ "جریدۂ روزگار" مدراس[1] کے ایک شمارہ کے مطابق، اس وقت تک بھی قلعہ کے اندر ان بزرگوں کی چوکنڈیاں موجود تھیں اور سرکار کی جانب سے ان کے عرس ہوا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اب بھی یہ عرس جاری ہیں یا نہیں! اس سلسلہ کے مزید تین بزرگ محمد آباد بیدر میں اور چار بزرگ بیجاپور میں مدفون ہیں۔ ان میں حضرت شاہ ابوالحسن کلاں بیجاپوری مشہور ہیں۔

حضرت سید شاہ مرتضیٰ کی تاریخ پیدائش کہیں مرقوم نہیں ہے۔ لیکن سنِ وفات اور وفات کے وقت آپ کے سن سے آپ کا سالِ پیدائش 1838ء حاصل ہوتا ہے۔ موصوف کی ولادت بمقام ویلور ہوئی تھی لیکن عنفوانِ شباب ہی میں مدراس آ گئے تھے۔ نواب صمصام الدولہ ناظم جنگ مرحوم کے مصاحب خاص و موردِ الطاف رہے نوابانِ کرناٹک کے دربار میں آپ کو خاص وقار حاصل تھا۔ مدراس گورنمنٹ کا بھی آپ پر اعزاز خاص تھا۔ عمائدینِ شہر میں شمار ہوتے تھے۔ نواب فیروز حسن خاں بہادر ایجنٹ بیگم صاحبہ مدراس کے رفیقِ خاص تھے۔ اور یہ دوستانہ اس قدر مضبوط تھا کہ آپ کے انتقال نے حضرتِ ممدوح کو برداشتہ خاطر کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے مدراس چھوڑ دیا اور حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں اپنے برادر زادوں مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری اور مولوی سید احمد صاحب قادری مددگار صدر محاسب سرکارِ عالی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہاں بھی دیوڑھی دربار میں آپ کو عزت حاصل رہی۔

آپ کا مسلک صلح کل تھا، جگت دوست تھے، کریم النفس، خلق مجسّم، مہمان نواز، غریب پرور اور ہمدرد

---

1. "جریدۂ روزگار" مدراس: جلد 30: شمارہ 43: مورخہ 19 / نومبر 1904ء

قوم تھے۔ خدمتِ خلق آپ کی اطاعت تھی۔ جس کی وجہ سے وہ خاص وعام میں ہر دل عزیز تھے۔ "جریدۂ روزگار" رقم طراز ہے کہ چھوٹے بڑے کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ خاکساری خمیر میں تھی، مہمانوں کے لیے باورچی خانہ ہمیشہ سلگا ہوا رہتا تھا۔ فقراء سے کمال درجہ عقیدت تھی۔ ہمیشہ دوست احباب کے مجمع میں گھرے رہتے تھے۔ فقیر مشرب و خوش طبع تھے۔ لباس فاخرانہ مگر مزاج فقیرانہ، عاشقِ رسولؐ و فدائے اہلِ بیت تھے۔ "دلائل الخیرات" و "جذب المجر" کی روزانہ تلاوت آپ کی خصوصیات میں سے تھی جو آخر دم تک ناغہ نہ ہوئی۔ اخبار کا بیان ہے کہ "حالت نزع میں بھی تا دمِ واپسیں نعرۂ اللہ اللہ تھا۔ لبوں پہ جان آگئی مگر کیا دیکھا کہ تبسم فرما رہے ہیں۔ حالتِ مرض میں بول و براز ہوتا رہا مگر حیرت ہے کہ بُو نہ رہی۔"

مدراس کے پندرہ سالہ قیام میں آپ نے قوم وملت اور دین ومذہب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں اخبار "جریدۂ روزگار" اور "سبیلِ حیدری" آپ کی یادگار ہیں۔ "جریدۂ روزگار" میں مختلف موضوعات پر آپ کے معرکہ آرا مضامین ملتے ہیں۔ بعض نوٹوں سے آپ کی بے باکی ظاہر ہوتی ہے۔

1875ء میں پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد کی یادگار کے طور پر "جریدۂ روزگار" کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ موصوف نے پندرہ سال تک بذاتِ خود اس کی نگرانی کرتے رہے۔ اس کی شہرت دُور دُور تک تھی۔ ہندوستان کے مختلف اخبارات اس سے خبریں نقل کیا کرتے تھے۔ یہ اُن گنے چنے اخباروں میں سے ہے جنہوں نے طویل عمر پائی۔ جریدۂ روزگا 1939ء تک بھی جاری رہا۔ یہ اخبار حیدرآباد میں بہت زیادہ مقبول تھا اور سلطنت آصفیہ کے تعلق سے اس کی پالیسی تعمیری رخ رکھتی تھی۔ موصوف خود بھی دولتِ نظام کے دلی خیرخواہ اور جاں نثار تھے۔

روس اور ترک کی جنگ میں اس نے ترکوں کی کھل کر حمایت کی تھی۔ اس کی تائید میں بڑے زوردار مضامین لکھے اور اس کے لیے چندے کی پُرزور اپیلیں بھی کیں۔ اخبار میں موصوف کے نام کے ساتھ "آفندی" کا لفظ بھی چھپتا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار کی شکل میں جاری ہوا تھا لیکن آگے چل کر اس کے وقفۂ اشاعت میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ کبھی یہ ہر دوسرے روز شائع ہونے لگتا تو کبھی روزانہ بن جاتا تھا۔ اس کی 43 ویں جلد روزانہ اخبار کی ہی ملتی ہے۔ 48 ویں جلد تک بھی یہ غالباً روزانہ ہی رہا۔ اس کے بعد پھر ہفتہ وار ہوگیا۔

مرحوم جب تک مدراس میں رہے بذاتِ خود اس کی نگرانی کرتے رہے۔ لیکن حیدرآباد کو روانگی کے بعد اس کی نگرانی منتظمانِ مطبع کے حوالے ہوگئی۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران یہ حیدرآباد سے بھی چھپنے لگا تھا۔ حیدرآباد میں آپ کے برادرزادے سید احمد قادری کے اہتمام میں یہ چھپا کرتا تھا۔ ان کا مکان کوچۂ داوے صاحب (احاطہ کپتان رگھوناتھم) میں تھا۔ یہیں ان کا ایک

مطبع تھا اسی مطبع میں یہ اخبار چھپتا تھا[1]۔ اخبار کو خود حیدرآباد میں چھاپ لینے کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کی تازہ تازہ خبریں اپنی "مشتریوں" کو جلد سے جلد پہنچائی جائیں۔

حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد موصوف کی دلچسپی اخبار سے قدرے ہٹ گئی۔ اب آپ کی ساری توجہ دین وملت کی خدمت پر مرکوز ہوگئی تھی۔ انجمن تبلیغ اسلام کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور آٹھ دس سالوں میں پندرہ سولہ سو افراد کو مشرف بہ اسلام کرڈالا اور ہر ممکن طرح سے ان کی امداد فرمائی۔ مسجد محبوب شاہی کی تعمیر میں تو اپنے آپ کو وقف کردیا تھا۔ بطور چندہ حاصل کیا ہوا تقریباً پندرہ ہزار روپیہ اس میں صرف کردیا تھا لیکن تعمیر نصف سے زیادہ نہ بڑھ پائی اخبار "جریدۂ روزگار" کے مطابق "مرحوم کی کمال آرزو یہی تھی کہ اپنی زندگی میں اس کی تعمیر پوری ہوتی ہوئی دیکھیں۔ موصوف اسے ملک شام کی مساجد کے نمونہ پر تعمیر کرنا چاہتے تھے[2] قبہ، مینار اور حوض کی تعمیر ہنوز باقی تھی کہ آپ کو اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا"۔

آپ کا انتقال اواخر 1904ء میں ہوا تھا۔ انتقال سے ڈیڑھ سال پہلے سے طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اکثر بخار آتا رہتا تھا۔ اسہال کی بھی شکایت رہتی تھی۔ سرفہ کی شکایت ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے ضعف و ناتوانی میں اضافہ ہوگیا تھا آخری دنوں میں بخار چڑھا تو پھر کم نہ ہوا۔

۴ رمضان المبارک روز شنبہ کے سہ پہر کو بخار آیا اور اس کے ساتھ ہی کھانسی شروع ہوی۔ چھ روز تک ڈاکٹر کا علاج ہوتا رہا۔ مرض کچھ ایسا مہلک نظر نہیں آتا تھا۔ خود ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ نمونیہ کا اثر ہے۔ افاقہ ہو جائے گا۔ لیکن شب جمعہ مرض میں اچانک شدت ہوی۔ تنفس شروع ہوا۔ کرب و بے قراری بڑھ گئی۔ حاذق ڈاکٹر بلائے گئے۔ علاج دمبدم ہوتا رہا۔ مگر حالت تھی کہ لحہ بہ لحہ نازک ہوتی جارہی تھی۔ آخر دوسرے دن ۱۰ رمضان کو بوقت نماز جمعہ ٹھیک ایک بج کر ۳۵ منٹ پر طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت آپ کی عمر 67 سال تھی۔ مرحوم نے شادی ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ بعد نماز مغرب اٹھایا گیا۔ اور مسجد محبوب شاہی میں ہی نماز پڑھائی گئی۔ لوگوں کا مجمع اس قدر ہوگیا تھا کہ مغرب اور عشاء کے درمیان تین مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی گئی اور نماز تراویح سے قبل مسجد کے صحن میں ایک طرف

[بقیہ صد153 پر دیکھیے]

---

1. ڈاکٹر محمد غوث صاحب مرحوم، دیوان صاحب باغ، مدراس کے بیان کے مطابق جو خود بھی اس زمانہ میں اسی محلہ میں رہتے تھے۔

2. آج یہ مسجد "مسجد مالاکنڈہ" کے نام سے مشہور ہے اور معظم جاہی مارکیٹ کے مقابل پولیس اسٹیشن کے پیچھے ہے۔ اس سے متصل ایک قبرستان بھی موجود ہے۔

عہدِ سلطنتِ خداداد [1213 - 1175ھ مطابق 1799 - 1761ء] اپنے انتشار، جنگ و جدال اور نامساعد حالات کے باوجود مختلف جدید علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور تہذیب و تمدن کی نشوونما کے اعتبار سے حیرت انگیز طور پر انتہائی روشن اور تابناک رہا ہے۔ یہ اڑتیس ۳۸ سال پر مشتمل مختصر دورِ حکومت (نواب حیدر علی خاں ۲۱ سال اور حضرت ٹیپو سلطان کے ۱۷ سال) جو جدید سائنسی اور تکنیکی علوم و فنون سے مالامال نظر آتا ہے۔

نواب حیدر علی خان اگرچہ کہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، مگر علم و فضل کے غیر معمولی طور پر قدر دان تھے۔ اسی لیے آپ نے اپنے دارالخلافہ سرنگاپٹن (ظفر آباد) کو علم و ہنر کا مرکز بنانے کے لیے سلطنت کے دُور دراز علاقوں سے قابل علماء اور جیّد فضلا کو دعوت دے کر اپنے یہاں جمع کیا۔ اسی حضرت ٹیپو سلطان نے جو خود بھی علاّمۂ وقت سے کم نہیں تھے، اپنے دورِ حکومت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند، ایران، افغانستان اور حجاز وغیرہ سے بھی اہلِ علم و دانش کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ چناں چہ ایران کا ایک شہزادہ ٹیپو سلطان کے دربار میں دو سال تک مہمان رہا۔ باپ اور بیٹے دونوں کے درباروں میں ملک الشعراء کا تقرر ہوتا تھا اور شعراء خاص خاص تاریخی موقعوں پر قصیدے بھی پیش کرتے تھے اور یہ قصیدے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔ دونوں کو نادر و نایاب کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ سلطان کی شہادت کے بعد جب اُن کا کتب خانہ انگریزوں کے ہاتھ لگا تو وہ حیران رہ گئے کہ وہ حکمران جس کو تختِ شاہی پر فرصت سے بیٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی اور جو ہر وقت جنگ و جہاد کے لیے کمربستہ رہتا تھا وہ کیسے علم کا شیدائی بنا اور کیسے اس نے ہزاروں نایاب مخطوطات جمع کیے۔ انگریزوں نے اپنے ساتھ مالِ غنیمت کے طور پر اس دولتِ نایاب

کو بھی لوٹ کر لندن پہنچا دیا۔ جہاں اس کی وضاحتی فہرست چارلس اسٹیوارٹ [Charles Steward] نے مرتب کر کے شائع کی۔ ٹیپو سلطان کی علم دوستی اور قدردانی نے ملک اور بیرونِ ملک کے اہلِ علم و اہلِ قلم کے قافلے کو سلطنتِ خداداد کی طرف کشاں کشاں لے آیا۔

بہرحال یہاں ہم عہدِ سلطنتِ خداداد کی فارسی اور اردو خدمات پر روشنی ڈالیں گے تاکہ اس عہد کے علمی ادبی اور لسانی خدمات کے ساتھ ساتھ تہذیبی اقدار و معیار کا بھی صحیح نقشہ ابھر کر قارئین کے سامنے آئے۔

عہدِ سلطنتِ خداداد میں بول چال کی زبان دکنی تھی اور فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ دفتر کا کاروبار، خطوط نویسی، فرامین کی اجرائی اور تحریری اسناد اکثر و بیشتر اوقات زبانِ فارسی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ سلطنت نے بذاتِ خود جو کتابیں لکھیں یا لکھوائیں وہ تمام کی تمام فارسی میں تھیں البتہ دو ایک کتابیں عوام کی دینی ضروریات کی خاطر سلطنت نے دکنی زبان میں لکھوائی تھیں۔ چنانچہ دربارِ سلطانی کے ملک الشعراء حسن علی عزت نے "فتح نامہ"[1] دکنی زبان میں تحریر کیا۔ عزت نے سلطان کے حکم پر فنِ موسیقی میں "مفرح القلوب"[2] نامی کتاب تحریر کیا۔ جس کی عبارتیں اور بیانات فارسی میں ہیں مگر رقص کے لیے گائی جانے والی غزلیں دکنی زبان میں ہیں۔

۱۔ حضرت سید شاہ محمد حسینی

ملقب بہ حسینی حضرت شاہ جمال الدین بخاری جمالؔ راجوٹی (المتوفی ۱۱۶۲ھ) کے فرزندِ کلاں اور حضرت مخدوم جہانیانِ جہاں گشت بخاری (المتوفی ۷۸۵ھ) کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ میر عالم و فاضل اور صوفی کامل بزرگ تھے۔ آپ کی وفات ۳ رجمادی الاول ۱۱۸۶ھ کو ہوی۔ مزار شریف تل پول (نزد کدری) آندھرا میں ہے۔ آپ کو نواب حیدر علی خان نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ مگر آپ نے خود جانے کی بجائے اپنے برادرِ خورد حضرت شاہ کمال کو شری رنگا سری رنگا پٹن روانہ کر دیا تھا۔ آپ نے فارسی اور اردو میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا اور دونوں زبانوں میں شاعری بھی کی۔ آپ کی تصنیفات میں "انتباہ الطالبین"، "رسالہ قادریہ"، "عقائدِ صوفیا"، "اسرارِ توحید" "رسالہ عینیت و غیریت"، "مدحِ میراں"، "دیوانِ شاہ میر"، "رسالہ نوریہ"، "ضیاء العیون"، "بطونِ چشتیہ" قابلِ ذکر ہیں۔

۲۔ حضرت سید شاہ نور اللہ قادری نورؔ

آپ حضرت شاہ میر کے برادرِ حقیقی تھے آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد شاہ جمال کے زیرِ نگرانی ہوی اور تکمیل علومِ باطنی

---

[1] اس کتاب کو ڈاکٹر صبغۃ اللہ نے مرتب کر کے ۱۹۹۵ء میں بنگلور سے شائع کیا ہے۔

[2] اس کتاب کو ڈاکٹر نور محمد سعید صدر شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی ترتیب دے رہے ہیں۔

بڑے بھائی حضرت شاہ میر کے ظلِّ عاطفت میں ہوئی۔ جیسا کہ آپ نے اپنی فارسی غزل میں فرمایا: ۵

شہ میر کہ مرشد است و پیرم ؛ او ساختہ مرشدم ہمیشہ (تجلیات نورانی)

آپ نے بھی اپنے بھائی کی طرح فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کی۔ اور کئی ایک کتابیں لکھیں۔ آپ کی تصنیف "تجلّی انوار معروف بہ "تجلیاتِ نورانی" بزبان فارسی تصوّف کے اعلیٰ وارفع مسائل کی حامل ہے۔ اس کا ایک نسخہ (Oriental Manuscript Library) کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں موجود ہے۔

۶۔ حضرت سید شاہ کمال الدین بخاری قادری

آپ شاہ میر کے سب سے چھوٹے بھائی اور خلیفہ ہیں حضرت شاہ کمال اپنے وقت کے مانے ہوئے بزرگ، باکمال شاعر اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ آپ کے عقیدت مندوں میں سلطان ٹیپو شہید بھی تھے۔ سلطان نے آپ کو سری رنگاپٹن خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ اور آپ سے خوب استفادہ بھی کیا تھا۔ بقول راہی فدائی آپ سے حسنِ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ:

> "جب انگریزوں نے سلطان کی خدمت میں ایک مراسلہ روانہ کیا کہ جس میں جنگ اور صلح میں کسی ایک کو اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو سلطان نے فوراً اپنا ایک ایلچی شاہ کمال کی خدمت میں روانہ کیا اور آپ سے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت آپ اتفاقاً ذکر میں مشغول تھے۔ آپ نے موقع کی نزاکت کے مدِ نظر ایلچی سے فرمایا کہ "در صلح خیر" (صلح میں بھلائی ہے) مگر چوں کہ سلطان کا نمائندہ غدّار تھا۔ اس نے کاغذ پر "درسلحہ خیر" (یعنی اسلحہ اٹھانے اور جنگ کرنے میں بہتری ہے) لکھ کر سلطان کے حوالے کردیا۔ سلطان نے چٹھی دیکھ کر سمجھا کہ شاہ کمال جنگ کا مشورہ دے رہے ہیں۔ بعد ازاں گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں سلطان نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس طرح تقدیر غالب آگئی۔"
>
> (کڑپہ میں اردو، ص 67: مطبوعہ 1992ء)

حضرت شاہ کمال نے فارسی زبان میں ایک ضخیم کتاب "کلماتِ کمالیہ" کے نام سے تصنیف کی جس کا ایک نادر مخطوطہ مولانا راہی فدائی کے شخصی کتب خانے میں موجود ہے۔ جسے راقم الحروف کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ نثری کتاب تصوف کے معرکۃ الآرا مضامین پر مشتمل ہے۔ "کلماتِ کمالیہ" عہدِ ٹیپو سلطان کی یادگار تصنیف ہے جو ہنوز زیورِ طباعت کی منتظر ہے۔ حضرت شاہ کمال کی دکنی کتابیں بھی ملتی ہیں جن میں "دیوانِ مخزن العرفان" متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ آپ کی دیگر فارسی کتابوں میں "دیوانِ فارسی"، "کمال المعرفت منظوم"، "کلام کمال فارسی"، "حسن السوال وحسن الجواب" بہت مشہور ہیں۔

۴۔ لالہ مہتاب رائے سبقتؔ

آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پہ دسترس رکھتے تھے اور دربار سلطنتِ خداداد کے نامور ادیب و شاعر تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے آپ کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ "مہتاب سخن" (فارسی) کے نام سے ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد سے شائع کیا۔ جناب سبقت نے اپنا کلام اور خطوط خود ہی "شمع مجلسِ اردو" (۱۱۹۱ھ) کے نام سے ترتیب دیا تھا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا خاندان شمالی ہندو کالستھ سے ہے اور یہ خاندان شمالی ہندوستان سے آکر نواب حیدر علی کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ سبقت نواب حیدر علی خان کے سکریٹری اور محرّر (کاتب) کی حیثیت سے اُن کے ہمراہ رہتے تھے۔ بقول ڈاکٹر حبیب النساء میسوری 1174ھ مطابق 1761ء میں ہوسکوٹہ (Hos-kotta) کی فتح پر انھوں نے ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا اور ٹیپو سلطان کی تخت نشینی کے موقع پہ ایک قصیدہ تہنیت بھی پیش کیا ہے۔

۵۔ احمد خان شیرانی

آپ کولار کے متوطن تھے۔ نواب حیدر علی خان کے زمانے میں اس کی کافی شہرت مقبولیت تھی۔ آپ "چہار کرسی کلاں" بزبانِ اردو مطبوعہ 1195ھ کے مصنف ہیں اور یہ وہ کتاب ہے جو سارے کرناٹک میں بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے مفید اور کار آمد سمجھی جاتی ہے۔

۶۔ میر زین العابدین شوستری

آپ ٹیپو سلطان کے میر منشی تھے۔ آپ نے سلطان کی نگرانی میں مشہور و معروف کتابیں "فتح المجاہدین"، "موید المجاہدین" اور "خطباتِ جمعہ" لکھی ہیں۔

۷۔ محمد اسحاق بیجاپوری

آپ نے 1184ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار عہد ٹیپو سلطان کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ نے 1206ھ میں "ریاض العارفین" نامی کتاب نظم کی تھی۔ جس میں حمد و نعت اور مناجات کے بعد اخلاقِ حمیدہ کی تلقین بھی ملتی ہے۔ یہ کتاب 1276ھ میں منصۂ شہود پہ آئی۔ جس کا قطعۂ تاریخ مدراس کے مشہور و معروف شاعر صادق الحسینی شریف مدراسی نے لکھا۔

۸۔ حسن علی عزتؔ

آپ حضرت ٹیپو سلطان کے نہ صرف درباری شاعر تھے بلکہ ملک الشعراء کے خطاب سے بھی جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ آپ نے "مفرح القلوب" نامی کتاب دکنی زبان میں لکھی جو اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی ٹیپو سلطان کے حکم پہ لکھی گئی جس میں علم موسیقی کے قواعد و ضوابط وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔ Charles Stewart اپنی فہرست کتب میں لکھتا ہے

"" مفرح القلوب" غزلیات اور دوسری نظموں کا مجموعہ فارسی اور دکنی زبان میں ہے جس کو حسن علی عزت درباری شاعر نے لکھ کر سلطان کے نام سے منسوب کیا ہے" ۱

عزت کی ایک اور تصنیف "اضراب سلطانی" ۱۲۰۰ھ م 1785ء کے نام سے مشہور ہے جو ٹیپو سلطان کی جنگی حالات کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ یہ جنگ سلطان نے نظام دکن اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کے مقابلے میں کی تھی جس میں سلطان کو فتح مبین حاصل ہوئی تھی اور یہ کتاب دکنی زبان میں سلطان کے حکم پر لکھی گئی تھی۔

"اضرابِ سلطانی" کو ڈاکٹر صبغۃ اللہ نے مرتب کر کے ۱۹۹۰ء میں بنگلور سے شائع کیا ہے۔

۹۔ قاضی غلام احمد آپ عہدِ سلطانی میں سری رنگا پٹن کے مسندِ قضاوت پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے یکتا ئے روزگار عالم مانے جاتے تھے۔ آپ کی تصنیف کردہ فارسی کتابوں میں "زاد المجاہدین" اور "جواہر القرآن" مشہور ہیں۔ آپ نے "خلاصۂ سلطانی" (احکام النساء) دکنی نثر میں مرتب کی تھی۔ جس میں خواتین کے فقہی مسائل کی وضاحتیں موجود ہیں ۲

۱۰۔ شیخ میاں فضل اللہ فقیر آپ گنجام کے باشندے تھے۔ فقیر تخلص سے مشہور تھے۔ آپ نے "چہار کرسئی طریقت" بزبانِ دکنی کے مصنف ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد میں محفوظ ہے۔

۱۱۔ میر حسن علی کرمانی آپ عربی اور فارسی زبان کے جید عالم تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید عبدالقادر کرمانی تھا۔ آپ بھی گنجام کے متوطن تھے کرمانی نواب حیدر علی خان کی ملازمت میں داخل ہوئے اور میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حضرت ٹیپو سلطان نے آپ کو اپنے دورِ حکومت میں اپنا مصاحب بنایا تھا۔ آپ نے نواب حیدر علی خان اور ٹیپو سلطان کے تفصیلی حالات "نشانِ حیدری" کے نام سے بزبانِ فارسی قلم بند کیے۔ یہ کتاب سلطنتِ خداداد کی تاریخ کے لیے ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے نواب حیدر علی اور سلطان شہید کے عہد کے کارناموں اور فتوحات وغیرہ کے متعلق کوئی اور کتاب موجود نہیں تھی۔ کرمانی کی دیگر فارسی کتابوں میں "تذکرۃ البلاد والحکام"، "سوانح بابا فخر الدین" اور "بدیع المعانی" قابلِ ذکر ہیں۔ "تذکرۂ البلاد

---

۱ اس کتاب کے نو (۹) نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔

۲ اس کے دو نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں: یورپ میں دکنی مخطوطات: ص 414 مؤلف نصیر الدین ہاشمی۔

"تذکرۃ البلاد والحکام" کے مخطوطے کتب خانۂ سالار جنگ (شعبۂ مخطوطات) حیدرآباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن کی زینت ہیں۔

"سوانح بابا فخرالدین" اور "بدیع المعانی" کا تا حال کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔ صرف سی اے اسٹوری نے اپنی کتاب "پرشین لٹریچر" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جناب سلیم تمنائی نے اطلاع دی ہے کہ کرمانی کی مزید دو کتابیں "بحرِ فطرت" اور "تجنیس اللغات" اپنے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا سنِ تحریر 1221ھ ہے[1]۔ کرمانی کی مذکورہ بالا کتابوں کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری میں حاکم تخلص کرتے تھے۔ حالاں کہ جناب اکرام کاوش نے "تذکرۃ البلاد والحکام" پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "سالار" کے ادبی ایڈیشن میں لکھا ہے کہ کرمانی کا تخلص حاکم کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ علاوہ ازیں مولوی محمد خان نے اپنے مقالہ بعنوان "میسور میں اردو" میں کرمانی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ٹیپو سلطان شہید کی شہادت پر لکھا گیا مرثیہ نقل کیا ہے جس میں کرمانی کا تخلص حاکم درج ہے اور اس مرثیہ کا آخری شعر مندرجۂ ذیل ہے :

بس اے حاکم نو اس الم کے طفیل سینہ و لیشوں میں نام آور ہے

کرمانی کی رحلتِ سلطان پر کہی ہوئی فارسی تاریخیں آج بھی گنبدِ شہید کی سنگین دیواروں پر کندہ ہیں۔

۱۲۔ سیّد عارف اللہ شاہ قادری آپ کے والد کا نام سید محمد بن سید حافظ تھا۔ آپ کے آباء و اجداد بیجاپور کے متوطن تھے۔ آپ نے سیّد صدرالدین قادری نل منگلی ابن میراں شاہ ولی اللہ آرکاٹ کے خلیفہ تھے۔ انھیں کے خاندان کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی ہوئی۔ عارف شاہ نے 1224ھ میں مثنوی "حقوق المسلمین" اور 1230ھ میں "مطلوب المریدین" تصنیف کی۔ آپ کی دیگر مثنویوں میں "عقائد نامہ"، "مسیلادنامہ"، "وفات نامہ" قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی نثر میں آپ نے "انشائے زاد المبتدی" تحریر کی جو مکاتیب پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ نصیب اللہ شاہ قادری عرف محمد شریف آپ اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ کا تخلص خادم تھا۔ شہر گنجام کے متوطن تھے۔

۱۴۔ حسین بن قادر آپ سلطان کے عہد کے نامور شاعر تھے۔ آپ کے مرشد کا اسم گرامی حضرت سید حسن تھا۔ انھوں نے مذہبی عقائد پر مشتمل فارسی کتاب کا اردو میں ترجمہ

---

[1] قومی یکجہتی اور دکن دلیس : ص 117 : مطبوعہ 1980ء

کیا اور اس کو حضرت ٹیپو سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس کو حضرت ٹیپو سلطان نے قبول کرتے ہوئے اس پر اپنے دستخط مع تاریخ ثبت کر دئے۔ یہ ۱۱ محرم ۱۱۵۵ھ کا واقعہ ہے۔

۱۵۔ محمد علی مہکری خانہ زاد

آپ محمد سعید عاصی نل منگلی کے فرزندِ کلاں تھے۔ سلطنتِ خداداد میں آپ بحیثیت گورنر آپ کا تقرر بلوہ محل، کالی کوٹ، گوکھی بنگلور وغیرہ علاقوں میں ہوا تھا۔ حضرت ٹیپو سلطان نے آپ کو فلک تشکوہ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ آپ اس دور کے بہترین شعراء میں سے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں آپ کے کلام کا مجموعہ "گنج شائیگاں" چھپ چکا ہے۔ آپ کی وفات بھی اسی سن میں ہوئی اور آپ کا مزار مبارک ٹمکور میں ہے۔[1]

۱۶۔ منشی غلام حسین منجم

آپ دربار سلطان شہید کے نام ور منجم اور شاعر تھے۔ آپ کا تخلص عاصی تھا۔ علم ریاضی، علم الحساب، علم نجوم، علم مناظر، علم جبر و مقابلہ، علم جر ثقل، علم طب، علم انشاء اور علم قانون میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ فارسی کے ایسے محقق تھے کہ اہل زبان کو بھی آپ کا لوہا ماننا پڑتا تھا۔ بڑے طباع تھے۔ اُن کے رقعات فارسی زبان میں موجود ہیں۔ ان رقعات کی عبارت مسجع و مقفیٰ اور فصیح و بلیغ ہے۔ آپ کا وصال 1280ء میں میسور میں ہوا۔ آپ کی دیگر کتابوں میں "استیفا" اور "تکمیل الصرف" کا پتہ چلتا ہے۔

۱۷۔ مرزا زین العابدین عابد

آپ مرزا عسکر کے فرزند تھے۔ جو عہدِ ٹیپو سلطان میں منصب صدوری پر فائز تھے۔ آپ کی ولادت ۱۷۸۰ء میں ہوئی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے وقت آپ کی عمر انیس سال تھی۔ سلطان نے آپ کو غنی کچہری کا بخشی مقرر کیا تھا اس کمسنی میں آپ کا تقرر آپ کی بہترین صلاحیتوں کا غماز تھا۔ آپ کی مثنویوں میں "نقشِ مراد" ۱۸۰۵ء، مثنوی "جوش و خروش" ۱۸۳۰ء بے حد مشہور ہیں۔ آپ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ آپ کی وفات ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔

سلطنتِ خداداد کا عہد جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا ہے بہت زیادہ طویل نہیں تھا۔ لیکن اڑتیس 38 سال کے مختصر عرصے میں اس سلطنت کے حکم رانوں کو کبھی چین کے لمحے نصیب نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ایک سلطنتِ مغلیہ موت کی آخری سانسیں لے رہی تھی تو دوسری طرف انگریز، فرانسیسی، پرتگالی اور ڈچ اقوام کے غیر ملکی تاجر اپنے قدم ہندوستان کے مختلف مقامات میں جمانے شروع کر دئے تھے۔ سلطنتِ خداداد کے

---

[1] محمد علی مہکری کی حیات اور کارناموں پر گلبرگہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر لاہی قریشی کی نگرانی میں ایک مقالہ لکھا گیا۔

حکم رانوں کا مسئلہ یہ تھا کہ انھیں نہ صرف مادرِ وطن کی حفاظت کا فرض نبھانا تھا۔ بلکہ ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں کوئی بھی غیر ملکی اپنا تسلّط قائم کرنے کی کوشش اور اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کی جد و جہد تیز کرنے لگتا تو ان حکم رانوں کی غیرت کے کان کھڑے ہو جاتے، مستقبل کی دور دور کی راہوں کو وہ دیکھ لیتے، دشمنوں کی سازشوں کا پتہ بآسانی لگا لیتے اور کسی بھی مکر و فریب کاری کی شناخت کر لیتے کی خوبی بدرجۂ اتم ہندوستان بھر کے کسی بھی حکم راں میں موجود نہیں تھی۔ لہٰذا سلطنتِ خداداد کے جواں ہمت، جواں سال حکمراں سلطان ٹیپو کی ذمہ داری ہو جاتی تھی کہ وہ ان تمام آنے والی فتنہ سامانیوں کو پوری طرح فرو کر دے۔ چوں کہ سلطنتِ خداداد کے اطراف و اکناف کی ریاستیں دور اندیش نہ تھیں کہ انھیں یہ غلط فہمی ہونے لگی کہ خدانخواستہ ضرب ٹیپو سے ان کی ساکھ ختم نہ ہو جائے اور راکھ بھی باقی نہ رہے اسی لیے انھوں نے ٹیپو سلطان کا ساتھ دینے کی بجائے غیروں کے اشاروں پہ کام کرنے کو مصلحتِ وقت سمجھ لیا اور قدم قدم پر (اولوالعزم) حکم راں کی راہوں میں کانٹے بچھانے لگے۔ یہی وہ تاریخی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کو ایک لمحے کے لیے ذہنی طمانیت و یکسوئی نصیب نہ ہوئی۔ باوجود ان تمام موانعات و مشکلات کے ٹیپو سلطان نے اپنے عہد میں اتنا سب کچھ کر دکھایا کہ زمانے کی عقل حیران رہ گئی تھی۔ اس عہد میں سلطنت کی رعایا نے جتنی خوشحالی دیکھی شاید ہی کسی وقت اتنی خوش نصیبی کا موقع انھیں ملا ہو۔ صنعت و زراعت، تعلیم و تربیت اور زندگی کے ہر شعبہ میں ٹیپو سلطان نے نہ صرف اپنی باخبری کا ثبوت دیا بلکہ اس کی ترقی و ترویج کے لیے حتی المقدور جان توڑ کوشش کی۔ ان تمام شعبوں میں علم و ادب کا شعبہ بہت ہی نمایاں اور انتہائی روشن نظر آتا ہے۔ حالاں کہ سلطنت کی زبان فارسی تھی لیکن عوامی زبان اردو ہونے کی وجہ سے دونوں زبانوں کو برابر کے حقوق دیتے ہوئے ٹیپو سلطان نے ہر طرح سے ان کی اشاعت اور ترویج کے مواقع فراہم کیے۔ کیا ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند سے بھی ماہرِ تعلیم اور اہلِ قلم حضرات کو دعوت دے کر بلایا گیا اور ان کی صلاحیت اور بہترین مشوروں سے کماحقہٗ فائدہ اٹھایا گیا۔ جگہ جگہ مدارس اور جامعات کا بھی قیام عمل میں آیا۔ عوام کی نہ صرف دنیاوی ضروریات بلکہ دینی تقاضوں کو بھی مدّنظر رکھ کر اُن کی اشاعت اور عوام کو غلط رسوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بالخصوص عورتوں کی تعلیم اور تربیت اور اُن کے غلط اعتقادات کو سدھارنے کے لیے ماہر علماء کی ایک کمیٹی قائم کی جنھوں نے فقہ محمدی اور احکام النکاح جیسی کتابیں ترتیب دیں جس میں عوام کی نفسیات اور اصلاحی اقدام دونوں کا بھرپور لحاظ رکھا گیا۔

بہرحال سلطنت خداداد کا یہ مختصر مگر درخشاں دور کئی صدیوں پہ بھاری ہے اور تاریخ کا ایک یادگار اور زرّیں عہد ہے اور جس کے عظیم الشان اور ناقابلِ فراموش کارنامے دیارِ ٹیپو سلطان شہید کا شناخت نامہ ہیں۔ ●●

ڈاکٹر سید سجاد حسین
شعبۂ عربی، فارسی و اُردو ۔ مدراس یونیورسٹی مدراس

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اردو زبان وادب کی تبلیغ و ترسیل کا کام شعراء وادباء اور سلاطین کے علاوہ صوفیائے کرام نے بھی انجام دیا۔ صوفیائے کرام نے جس نہج سے اردو زبان کو پروان چڑھایا اس کی نوعیت اگرچہ شعوری تو نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان بزرگوں نے دین و مذہب کے پرچار میں اردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ اس لیے کہ اس وقت اردو زبان ہی پیغامِ محبت اور اعلیٰ مقصد کی ترسیل کا سہولت بخش ذریعہ تھی۔ دہلی کے حضرت امیر خسرو ہوں یا گلبرگہ کے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ویلور کے حضرت سید شاہ ابوالحسن قربیؔ ہوں یا مدراس کے حضرت شیخ محمد مخدوم عبدالحق ساوؔی، ہر صوفی نے اپنے اپنے طور پر اسلام کی تبلیغ کو اپنا فرض سمجھا اور اس مقصد کے لیے انہوں نے شعر و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔ مذہبی رسالے اور شاعری کے بیش بہا نمونے جو صوفیائے کرام کے نوکِ قلم سے ظاہر ہوئے وہ آج بھی اردو ادب کی تاریخ کے صفحات سے منسلک ہیں اور انہیں ابتدائی ادب پاروں کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے ان صوفیائے کرام میں بہت سے شاعر بھی ہوئے، جنہوں نے اپنے روحانی تجربات و مشاہدات کے اظہار کے لیے اردو شاعری کو گلے سے لگایا۔ ان کی شعری تخلیقات میں صوفیانہ خیالات کا اظہار شرح و بسط کے ساتھ ملتا ہے اور ساتھ ہی شعری تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیتے وقت صوفیائے کرام کے نثری و شعری کارناموں کو ادب کے زمرے میں رکھ کر ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔

حضرات شاہ تراب چشتیؒ ریاستِ تامل ناڈو کے جلیل القدر صوفی، جیّد عالمِ دین اور صاحبِ طرز شاعر گزرے ہیں۔ بارھویں صدی کے اس صاحبِ علم وعرفان بزرگ کے ذکر سے اردو کے تمام تذکرے خالی پڑے ہیں اس لیے حضرت تراب کی تاریخ ولادت کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بعض معتبر ذریعوں سے ان کا سال پیدائش ۱۱۳۰ھ [1] متعین کیا ہے۔ جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ تراب دکنی اردو، فارسی وعربی کے ایک جیّد عالم تھے۔ ان کا شمار نہ صرف بارھویں صدی کے مشاہیر علماء بلکہ اہل اللہ میں بھی ہوتا ہے۔ آپ اگرچہ حضرت قربی ویلوری، مولانا باقر آگاہ اور حضرت ذوقی کے ہم عصر تھے۔ لیکن ادبی مرکز سے دور ضلع شمالی آرکاٹ کے موضع ترونا ملے میں خلوت گزیں ہو جانے کے سبب ایک عرصے تک آپ کی علمی وادبی خدمات کا کماحقہٗ اعتراف نہ ہو سکا۔ ترونا ملے مدراس سے تقریباً ۱۷۵ کلومیٹر کی دوری پر واقع ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جو وہاں کے ایک پہاڑ پر موجود مندر کے سبب مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول میں شاہ تراب کے حوالے سے اس شہر کا نام ترنامل لکھا ہے۔ ملے خالص تامل زبان کا لفظ ہے جس کے معنے پہاڑ کے ہیں تامل میں اس مقام کو ترونا ملے سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ وہاں ترونا کا پہاڑ واقع ہے۔ دکنی زبان میں ترنامل بولنے کا رواج عام ہو چلا ہے اس لیے عوام الناس اسے ترنامل کے نام ہی سے جانتے اور پہچانتے ہیں

شاہ تراب علی جب اپنا مدعا سنانے کے لیے نقل، دیول، ناجل اور عمل کے قافیے باندھ رہے تھے تو انھوں نے ترونا ملے کے نام سے فائدہ اٹھا کر ترنامل بطورِ قافیہ استعمال کیا ہوگا۔ شاعر کے مندرجہ اشعار سے اس بیان کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ [2]

مل مشہور جس کا ہے دیول — اور دیول کے نانوں ار ناجل
اے یارو طرفہ سنو نقل — ہے کرناٹک میں ترنامل
ادس ارناجل کوں مار کھندل — وہ بخشا واں کا میتے عمل [2]

حضرت شاہ تراب چشتی کے والدِ بزرگوار مولانا عبداللطیف خان ایک درویش صفت اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کی بزرگی بے مثال اور زندگی اطیعواللہ واطیعوالرسول کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ حضرت شاہ تراب حضرت پیر بادشاہ حسینی کے مرید خاص تھے۔ آپ کی علمیت واہلیت اور صدق واخلاص کے اعتراف

---

[1] تاریخ ادب اردو: جلد دوم: حصہ اول: ص 312 : ڈاکٹر جمیل جالبی: مطبوعہ 1984ء۔
[2] تاریخ ادب اردو: جلد دوم: حصہ اول: ص 315 : ڈاکٹر جمیل جالبی۔

ہیں ان کے پیرو مرشد حضرت سید بابا شاہ حسینی عرف پیر بادشاہ حسینی نے سنہ ۱۱۱۵ھ[1] انہیں گنج الاسرار کے لقب سے ملقب کر کے خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ حضرت شاہ تراب نے اپنی مثنوی "ظہور کلی" کے باب انیس[19] میں نہایت خلوص واحترام کے ساتھ کیا ہے۔

او ولیٔ عصر مرشد نام دار — درسن پنجدہ و یک صد و یک ہزار

روز جمعہ ماہ رجب وقت شام — دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام[2]

حضرت شاہ تراب نے روایت کے مطابق ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والدین سے حاصل کی اور بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتوں سے عربی وفارسی میں دستگاہ پیدا کرلی۔ نیز علوم متداولہ سے بھی اپنی رضا ورغبت کا بھرپور ثبوت دیتے رہے۔ اسلامی تصوّف اور فلسفے کی بیشتر کتابیں بھی آپ کے مطالعے میں آئیں۔ شاہ تراب کے روحانی مرتبے کا اندازہ اُس خرقۂ خلافت سے ہوتا ہے جو آپ کے پیرومرشد حضرت بادشاہ حسینی نے عطا کیا تھا۔ سلوک ومعرفت کی اس خلافت کا شجرہ اپنے پیرومرشد سے لے کر حضرت امین الدین اعلیٰ بیجاپوری، حضرت برہان الدین جانم، حضرت میراں جی شمس العشاق، حضرت غوث پاکؒ اور حضور اکرمؐ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شاہ تراب کی درویشانہ شانِ بے نیازی اور آپ کے روحانی مرتبے کا اندازہ درجِ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

نہ کوئی اہلِ دل مجھ پاس آتا — نہیں کہیں پاس جا شیخی جگاتا

نہ قدر و منزلت کس پاس چنداں — نہ ہے داد و دہش کی آس چنداں

بہر صورت گزر جائے اوقات — ایس قسمت او پر شاکر ہوں دن رات

نہ میرے علم کا کوئی قدرداں — نہیں پھرتا ہوں سرگرداں وحیراں

اگرچہ اہلِ دنیا خیر صفت ہے — اُس عارف ستے کیا معرفت ہے[3]

حضرت شاہ تراب کا شمار بارھویں صدی کے اُن برگزیدہ صوفی شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے صوفیانہ مسائل اور فلسفیانہ خیالات کو شرح وبسط کے ساتھ منظوم صورت بخشی۔ آپ کی شعری تخلیقات میں متعدد مثنویاں، غزلیں، قطعات اور قصائد شامل ہیں۔ یہاں صرف ان کے مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

[1] بحوالہ: تامل ناڈو کے اردو صوفی شعراء: مقالہ برائے پی ایچ ڈی؛ زیب النساء: ص 156۔ غیر مطبوعہ

[2] بحوالہ معارف: جولائی 1971ء: "گلزار وحدت از تراب چشتی: ص 319

[3] بحوالہ تامل ناڈو کے اردو صوفی شعراء: مقالہ برائے پی ایچ ڈی؛ زیب النساء: ص   غیر مطبوعہ

۱۔ **ظہورِ کلّی** یہ ایک دلچسپ منظوم تخلیق ہے۔ جس میں ہندی اصطلاحات کی توضیحات خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کی گئی ہیں۔ نیز اس میں شاہ تراب نے اپنے مرشدِ خاص کی نوازشات الطاف و عنایات کا تذکرہ نہایت عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہے۔ ۱۱۷۱ھ میں تصنیف شدہ اس نظم کا تاریخی قطعہ ملاحظہ ہو: ؎

سالِ تاریخ کتاب منجلی گفت ظہورِ کلّی مولانا علی

اور مقرر پھر کیا نام کتاب جب ہوا میرے پو فضل تراب

۲۔ **گیان سروپ** سنسکرت الفاظ سے بھرپار یہ ترجیع بند نظم جملہ ۵۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے شاہ تراب اس طرح گویا ہوتے ہیں: ؎

لے گیان سروپ سب ہوا تمام بل گیا سروپ اس راکھا نام

ست گروسوں دیکھو اسے مدام ترلوک کا سارا کہا مقام

ہیں عینِ علی کا صحیح غلام سنج رات ہور دن سب یہی کام

۳۔ **گنج الاسرار** حضرت شاہ تراب چشتی کو علم و ادب اور سلوک و معرفت کے علاوہ علم رمل اور نجوم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ ان علوم پر اپنی قدرتِ کاملہ کا ثبوت آپ نے ایک طویل نظم گنج الاسرار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ علم رمل کے اہم نکات اور پر اسرار رموز سے مشرف یہ نظم ۱۱۷۹ھ[له] میں لکھی گئی۔ اس نظم کا قطعہ تاریخ سے اس کی وجہ تسمیہ کا سراغ لگتا ہے ؎

بھی اس کا نام رکھ تو گنج الاسرار گویا سچ نام سوں ہوئے گا اظہار

بحسب حکم آں شاہ نکو کار رکھیا نام اس رسالے کا گنج الاسرار

خرد تاریخ نظم انتخابی بگفتا گنج الاسرار ترابی

۴۔ **آئینہ کثرت:** حضرت شاہ تراب چشتی کے حالات زندگی کی تصویر کشی اور صوفیانہ اصطلاحات کی توضیحات پر مشتمل یہ مثنوی ۱۱۸۷ھ میں قلم بند ہوئی۔ اس میں فلسفۂ حیات اور تصوّف کے سربستہ رازوں کو اشعار کے روپ میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثنوی کا اندازِ بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اس طویل مثنوی میں کل ۱۹۸۰ اشعار ہیں۔ شاہ تراب کی دیگر شعری تخلیقات میں آپ کی عشقیہ مثنوی "مہ جبین و ملّا"، "ایدلشِ حسینی"، "نظم خاندانِ چشتیہ" اور "اسرارِ امینہ"

له بحوالہ: تامل ناڈو کے اردو صوفی شعراء: زیب النساء: ص 157 غیر مطبوعہ: مقالہ برائے پی ایچ، ڈی؛

کے علاوہ سوال و جواب کی صورت میں غزلیں اور قصائد بھی شامل ہیں۔ غزلوں کی تعداد تقریباً 30 تک پہنچتی ہے۔ آپ کی غزل کا انداز دکن کی شعری روایات سے میل کھاتا ہے۔ غزلیں مترنم بحروں میں کہی گئی ہیں۔ لیکن غزلوں میں زیادہ تر مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔ تصوّف و معرفت کی ترجمانی بھی جابجا آپ کی غزلوں میں ملتی ہے۔ غزلوں کی طرح آپ کی قصیدہ گوئی بھی کم و بیش مذہبی اثرات سے معمور ہے۔ وہ کسی بادشاہ یا امیر کی مدح سرائی کے قائل نہ تھے۔ اس لیے اُن کے بیشتر قصائد مولائے مشکل کشا حضرت علیؓ سے منسوب ہیں۔ ان کی غزل اور قصیدے سے ماخوذ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

غزل کے اشعار :

رہتا ہوں صبح و شام گرفتار کیف میں
حیرت زدہ ہوں صورتِ دیوار کیف میں

اے زاہد نہ پوچھ مجھے ہور صلوٰۃ !
کیا صوم ہور صلوٰہ درکار کیف میں

جب جائیں گے تمام نمازی بروزِ حشر
میں جاوں گا بحالت سرشار کیف میں

قصیدے کے اشعار :

در پردہ کن گنج نہاں تھا سو علی تھا
پرکار خط مرکز جاں تھا سو علی تھا

جب وحی محمدؐ پو ہوئی حق ستے نازل
جبرئیل کوں امداد لیا تھا سو علی تھا

یا اللہ کہ تراب نجف ہے زینتِ تبریز
از بس کہ مجھے امن و اماں تھا سو علی تھا

۵۔ گلزارِ وحدت

حضرت شاہ تراب چشتی کی منظوم تخلیقات میں "گلزارِ وحدت" ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس مثنوی میں فلسفۂ ویدانت اور ہندو اسطور و تلمیحات سے متعلق جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۱۷۳ھ ہے اور اس میں کُل 598 اشعار ہیں۔ مثنوی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ تراب نے اسے حضرت شیخ محمد شبستریؒ کی "گلشن راز" سے متاثر ہو کر تصنیف کیا تھا۔ اسی لیے "گلشن راز" اور "گلشنِ وحدت" میں نام کی مناسبت ملحوظ ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ [۵]

یہاں بولے ہیں صاحبِ گلشنِ راز
ہوئے جو معرفت کے فن میں ممتاز

رسد چوں نقطہ آخر بادل
در انجانی ملک گنبد مرسل

تراب بلبل باغ الٰہی!
کلام گلشن راز ہے گواہی[۱]

---

[۱] ماخوذ از "گلزارِ وحدت" : شاہ تراب حسینی

گلزارِ وحدت کا موضوع اگرچہ متصوفانہ ہے تاہم اسلوب بیان شُستہ اور شگفتہ ہے۔ کلام میں دلچسپی کی خاطر خوب صورت استعارے اور نادر تشبیہوں کا استعمال شاعر کی فنّی دسترس کا ضامن ہے۔ اس مثنوی میں جابجا شاہ تراب نے پیرِ طریقت حضرت شاہ امین الدین اعلی بیجاپوری اور اپنے پیرو مرشد حضرت سید بابا شاہ حسینی سے عقیدت مندی کا اظہار بصد احترام کیا ہے۔ ؎

جب سوں بابا شاہ حسینی مرشدِ کامل ملا	دل میرا ہر دو جہاں سوں بسکہ بے پروا ہوا
پیرانِ پیر شاہ علی پیر رہنما	مرشد میرا حسینی جو ثانی امین ہوا
جس گھر سوں فیض پایا تمام ہند ہور دکن	اوس گھر کا میں خلیفہ روئے زمیں ہوا

مثنوی میں اسرارِ حقیقت اور رموزِ حیات کے اہم نکات کی نشان دہی جابجا کی گئی ہے۔ وجودِ بشر کی اہمیت اور اس کے اوصافِ خاص کی طرف لطیف اشارے بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے شاہ تراب کے نزدیک باخبر دل متاعِ حیات ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں : ؎

ہے آدم او جسے دل کی خبر ہے	خبر دل سوں رکھا سو او بشر ہے
نہیں او دل جو رکھتے سب بہائم	رہے او دل کہ جس تے عرش قائم
وجود ہے ذاتِ واجب یعنی اصفات	وجود کا وصفِ خاص ہے اعتبارات
وجود و علم و نور و ہم شعور ہے	یو وصفِ خاص اور واجب وجود ہے
سمجھ تو بشر میں یوں خُدا ہے	نہیں جوں حرف سوں معنی جُدا ہے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی قاری شاہ تراب کو ایک عارفِ کامل، عالمِ باعمل اور صوفی شاعر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ہمہ اوست کے نظریے کے تحت بھی اس مثنوی میں بے شمار اشعار ملتے ہیں جو شاہ تراب کی وسعت علمی اور صوفیانہ مزاج کی گواہی دیتے ہیں۔ اس میں جابجا راہِ سلوک کے متوالوں کے لیے ذوق و تسکین کے سامان بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ میدانِ سلوک و معرفت کا یہ شہسوار اس مثنوی میں اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ آفاقی ہے۔ عارفِ کامل کا دل درگاہِ الٰہی سے کم نہیں۔ آپ کے نزدیک حق شناسی کے لیے صرف عقل کی رہنمائی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے جذبۂ عشق میں سرشاری بھی چاہیے۔ چناں چہ حضرت شاہ تراب قربِ الٰہی پانے کے لیے ایک مرشدِ صادق کی دستگیری اور اس سے وابستگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حضرت قربی ویلوری کے قول سے بھی اس کی صداقت واضح ہوجاتی ہے۔

”عام لوگوں کے لیے اسرارِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کا ادراک ایک مشکل امر ہے لہذا

بیعت کرنے سے ان پر ایک طرح کی پابندی لگ جاتی ہے اور وہ شریعت مطہرہ پر عمل پیرا ہوجاتے ہیں۔ اور شرک و بدعات سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔"[1]

شاہ تراب کی شاعرانہ انفرادیت وعظمت کا راز تصوّف و سلوک کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا اسرارِ معرفت اور مسائلِ تصوّف کو حکایات کے پیرایہ میں بیان کرنا شاہ تراب کی تخلیقی قوت اور فنّی بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔ آپ کے فکری وفنّی جوہر کی ضو پاشی اور رنگِ سخن کی انفرادیت سے بہت جلد شاعری کے باب میں ایک نئے طرز و اسلوب کا اضافہ ہوگیا۔ آپ کی شاعری کا شہرہ اور عظمتِ کلام کو دیکھ کر شعرائے دکن بھی آپ سے خوشہ چینی پر اُتر آئے۔

شاہ تراب کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ آپ کا کلام فکری وفنّی لحاظ سے معتبر و معزز ہے تو انہوں نے شاعرانہ تعلّی سے سرشار ہوکر میدانِ شاعری میں خود کو وَلیِ عصر اور وَلیِ ثانی ہونے کا اعلان کردیا۔ ذیل کے اشعار سے آپ کے اس اعلان کی تصدیق ہوتی ہے۔

گر سُنیں فردوسیاں سوں یو غزل میرا وَلی ۔۔۔ پھر سمندِ طبع شاید اوس جولاں ہوئے گا

پروانہ جل تراب ہوا سو عجب ہے کیا ۔۔۔ روشن سراج دل سوں وَلی کا سخن ہوا

میرے شعرائے دکن خوشہ چیں ہیں! ۔۔۔ وَلیِ عصر خوش تقریر ہوں میں

دیکھ دلبر تجھے کہا ہے تراب ۔۔۔ جگ میں بے شک وَلیِ ثانی ہے

دردؔ دہلوی، وَلیؔ دکنی، سراجؔ اورنگ آبادی، قربیؔ ویلوری اور باقر آگاہ کے ہم عصر اس عظیم شاعرِ تامل ناڈو کا تذکرہ نہ مورخینِ اردو ادب نے کیا اور نہ ہی تذکرہ نگاروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ البتہ نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں ضمناً اس بزرگ صوفی شاعر سے متعلق چند جملے سپردِ قلم کئے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقی کاوشوں نے حضرت شاہ تراب اور ان کے کارناموں کو منصۂ شہود پر لایا تو ان کے کلام کی قدر و قیمت ظاہر ہوئی۔

شاہ تراب بنیادی طور پر صوفی شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں کہیں بھی ابتذال اور رکاکت نہیں ہے بلکہ ہر جگہ پاکیزگی اور نفاست کی مہک آتی ہے۔ حضرت تراب کی شاعری ہماری قدیم روایات کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ آپ کے کلام کے مطالعہ سے روحانی فرحت حاصل ہوتی ہے اور ایمانی بصیرت کو تقویت ملتی ہے۔ تامل ناڈو میں اردو شاعری کی روایت کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے والوں میں شاہ تراب چشتی کا نام زندہ جاوید رہے گا۔ ●●

---

[1] خانوادہ قربیؔ کی اردو خدمات: ص 93 : ذکرہ اُمّ شہلا: غیر مطبوعہ: مقالہ برائے پی ایچ ڈی؛

ڈاکٹر محمد مصطفےٰ شریف
استاذ شعبۂ عربی، فارسی اور اردو، مدراس یونیورسٹی

زجاجۃ المصابیح

ایک اجمالی تعارف

فقہائے احناف پر جہاں اور بہت سے غلط الزامات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ احناف اہل الرأے ہیں، بلکہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلے ہیں قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احناف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شریعت پر عمل پیرا نہیں ہیں بلکہ وہ تو نعمان بن ثابت الکوفی یعنی امام ابو حنیفہ کی شریعت پر عمل پیرا ہیں۔ جب کہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ امام اعظم فرماتے ہیں:۔

"ما جاءَ عَنْ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلی الرأسِ والعین بابی واُمّی ولیس لنا مخالفۃ وما جاء عن الصحابۃ تخیرنا وما جاء عن غیرھم فھم رِجال ونحن رجال"[1]
(کتاب المیزان للامام الشعرانی)

فقہ کے ساتھ ساتھ امام ابو حنیفہ حدیث، اصولِ حدیث و رجال الحدیث میں ید علیا رکھتے تھے۔ رئیس المحدثین وشیخ الاسلام حضرت سفیان رح بن عیینۃ فرماتے ہیں:۔

"اوّل مَنْ اَقْعَدَنی للحدیث، وفی روایۃ اول من صیّرنی مُحدّثا ابوحنیفۃ"[2]

ابن خلدون کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ رح علم حدیث میں ایک بڑے مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ذھبی رح نے بھی "تذکرۃ الحفاظ" میں امام حنیفہ رح کے فنِ حدیث میں مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ امام شافعی رح فرماتے ہیں:
النّاسُ عیال فی الفقہ علی ابی حنیفۃ"[3] حافظ ابن عبد البر المالکی امام حنیفہ کا تفقہ فی الدین اور ان کے تقویٰ و ورع کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لاتتکلّم فی ابی حنیفۃ بِسُوءٍ ولا تصدقن احدا یسیئ القول فیہ فانّی واللہِ ما رأیت اَفْضَل وَلا اَوْرَعَ ولا افقہ منہ"[4] علامہ شامی رح جو حافظ سیوطی کے شاگرد ہیں فرماتے ہیں کہ حدیث ثریا میں رجلٌ من فارس یا من ابناء فارس سے مراد حضرت ابو حنیفہ ہی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اہلِ فارس میں کسی کا مبلغ علم امام ابو حنیفہ سے اونچا نہیں ہے۔ علامہ ابن حجر

اور دوسرے علماء بھی اس سے متفق ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "فقیر گفت امام ابوحنیفہ دریں حکم داخل است۔" (کلمات طیبات: ص: ۱۶۸)

اس تحقیق میں امام ابوحنیفہ پر یہ الزام ہے کہ وہ اہل الرائے میں ہے۔ ایک عالم محقق حضرت محمد انوار اللہ کشمیری فرماتے ہیں کہ "ہم نے اپنی عمر کے تیس[۳] سال اس مقصد کے لیے صرف کردے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کیا جائے۔ سو الحمد للہ اپنی تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد اس بارے میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے۔" (حیات انور: ص: ۱۴۲)

زیر نظر کتاب "زجاجۃ المصابیح" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں احناف پر کئے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات ہیں۔ اس کتاب میں مشکوٰۃ شریف کے طرز پر ان تمام احادیث کو جمع کیا گیا ہے جن سے فقہ حنفی کی تائید ہوتی ہے۔ تمام احادیث سند و متن کے اعتبار سے نہایت قوی اور سلسلہ رواۃ سلسلۃ الذھب ہے۔ احادیث متفق علیہ اور علی شرط الشیخین ہے۔ حواشی میں حضرت ممدوح نے اقوال حنفیہ، فقہائے احناف کے اقوال، عقائد کے مسائل، کلام کے مباحث، معارف القرآن و معارف الحدیث کو تفصیل سے پیش کر کے اس کو ایک بے نظیر کتاب کا درجہ دے دیا۔

خصوصیات

"زجاجۃ المصابیح" کی خوبیوں کو سمجھے بغیر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ اس کی چند اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ مشکوٰۃ شریف میں فقہ شافعی کی رعایت رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں فقہ حنفی کی رعایت ملحوظ ہے اگرچہ ترتیب و تبویب مشکوٰۃ ہی کے نہج پر ہے۔

(حاشیہ صـ کا): [۱] سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے وہ سر آنکھوں پر ہے۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہمیں آپ کی مخالفت کا حق نہیں ہے۔ جو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے منقول ہو ہم ایک دوسرے پر ترجیح دیں گے۔ اور تابعین سے جو منقول ہو اُن کے ہم پابند نہیں کہ وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی۔ (المیزان الکبریٰ ۱/۱۵ و کتاب المیزان الشعرانی)

[۲] مجھ کو حدیث کی تعلیم کے لیے سب سے پہلے حضرت ابوحنیفہ نے ہی بٹھایا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مجھ کو ابوحنیفہ نے محدث بنایا۔

[۳] لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال ہیں۔

[۴] حضرت ابوحنیفہ کے بارے میں برا بھلا مت کہو اور نہ کسی ایسے شخص کے قول کی تصدیق کرو جو اُن کے بارے میں برا بھلا کہے۔ کیوں کہ قسم اللہ کی کہ میں نے ان سے زیادہ افضل و اورع و فقیہ کسی کو نہیں دیکھا۔

[۵] لوکان العلم بالثریا لتناولہ الناس من ابناء فارس (مسند احمد: ج ۲: ص ۴۲۲)

۲۔ مشکوٰۃ میں ہر باب کے متعلق احادیث بحیثیت روایت تین فصلوں پر جمع کی گئی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی ترتیب میں مسائل کا بیک نظر تلاش کرنا مشکل ہے۔ اس لیے زجاجۃ میں احادیث کی ترتیب اس طرح ہے کہ اول قول مفتی بہ نقل کیا گیا ہے۔ ثانیاً اس کے موافق حدیث درج کی گئی ہے۔ ثالثاً اس حدیث کی صحت پر بحث کی گئی ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوی تنقیدِ رواۃ بھی شامل کر لی گئی ہے۔ رابعاً ہر مسئلہ کے تحت، احادیث کے علاوہ اقوال و آثار صحابہ و تابعین کو شامل کیا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ امام صاحب کا قول علاوہ حدیث کے کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کے قول سے ماخوذ ہے۔

۳۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حاشیہ پر فقہ حنفی پر اعتراض کے مدلل جوابات اور حنفی مقاصد کی وضاحت اور بعض مقامات پر فقہ حنفی اور فقہ شافعی کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔

۴۔ بخاری شریف کی طرح ہر باب کے آغاز میں آیاتِ قرآنیہ کو پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ زجاجۃ مذہبِ حنفی کے ماخذوں اور مؤیدات کا ایک زبردست خزانہ ہے۔ کیوں کہ نصابِ مدارس میں مروجہ کتب احادیث اکثر و بیشتر شوافع کی تالیفات ہیں۔ جن میں مذہبِ شافعی کا مؤید ذخیرہ تو کافی مل جاتا ہے لیکن حنفی مسلک کی تائید کا مواد خاطر خواہ دستیاب نہیں ہوتا، جس سے طلبا اور مستفسرین تو مذہب حنفی کے بارے میں تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اور مخالفین مذہبِ حنفیہ کے دل و دماغ پر یہ اثر پڑتا ہے کہ مذہبِ حنفیہ حدیث کے لحاظ سے بے مایہ اور مفلس ہے، یا اس کی مؤید روایتوں کا وجود ہی نہیں یا ہے تو وہ ضعف اور کمزور قسم کی روایات ہیں۔ جو محدثین کے نزدیک کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں درحالیکہ معاملہ برعکس ہے۔ حنفیہ کے یہاں قبولِ حدیث کا معیار محض سند اور روایت نہیں بلکہ اس کے علاوہ درایت و تفقہ کے دوسرے اصولی معیار بھی ہیں، جن کی رو سے حدیثیں ان کے یہاں قبول کی جاتی ہیں۔ الغرض زجاجۃ فقہ حنفی کی زبردست مؤید ہے۔

زجاجۃ پر تقاریظ و تبصرے

علوم حدیث اور فقہ حنفی میں زجاجۃ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کی قدر و منزلت کا اندازہ علمائے کرام کی آراء سے لگتا ہے۔ جنھوں نے اس کو کافی سراہا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے چند علماء کے تقاریظ و تبصرے پیش ہیں:-

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مدیر "صدقِ جدید" لکھنؤ کی تقریظ:- محرم الحرام ۱۳۷۳ھ ہجری مطابق اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوی۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"خطیب تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینی داروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مستند اور کارآمد اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے اور عوام و خواص سب کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے۔ لیکن صاحبِ مشکوٰۃ باوجود اپنی اسی جلالتِ

قدر کے بہر حال حنفی المذہب نہ تھے، شافعی تھے۔ اس لیے شافعی مذہب کی رعایت ان کی کتاب میں جا بجا آجانا بالکل قدرتی تھا اور اس لیے علمائے حنفیہ ایک اس قسم کے دوسرے مجموعۂ احادیث کی ضرورت مدتوں سے محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت ان کے مشرب و مسلک کی ہو۔

صدیوں کے بعد اس ضرورت کو عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصے میں آئی ہے۔ کتاب کا نام تو مشکوٰۃ کے جوڑ پر "زجاجۃ" ہی ہے۔ مضامین کی ترتیب بھی اس متاخر نے اپنے اسی پیشرو کے مطابق رکھی ہے۔ دیباچہ میں مؤلفِ "زجاجۃ المصابیح" اپنے ایک رویائے صادقہ اور بشارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے۔ "ہر کتاب" میں ابواب کے تحتانی عنوانات مشکوٰۃ کے مطابق ہی ہیں، سوائے اس کے جہاں جہاں مؤلف کو ضروری معلوم ہوا ہے تقویت مذہبِ امام اعظمؒ کے لیے متن کتاب میں یا حاشیہ پر مضامین کا اضافہ کر دیا ہے۔ چناں چہ کتاب العلم کے تحت مناقب کی ایسی روایتیں درج کر دی ہیں جن کا اشارہ ان کے خیال میں ابو حنیفہ کی طرف نکلتا ہے۔ اسی طرح باب قیام رمضان کے تحت تراویح کی تاکید اور اس کی تعدادِ رکعات وغیرہ پر حاشیہ اور متن میں اقوال و مباحث درج کئے ہیں۔ علیٰ ہذا باب عیادۃ المریض کے تحت، زمانہ طاعون میں آبادی چھوڑ کر باہر نکل جانے پر، "وقس علی ھذا" اور حواشی میں تو کثرت سے مسائل حنفی کی تائید میں دلائل اجمالاً یا تفصیلاً دے دیے ہیں۔ مشکوٰۃ سے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر عنوان باب کو تین تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اس میں فصلوں کی یہ تقسیم اٹھا دی گئی ہے۔

مضمون کتاب کی اصل قدر و قیمت کو پہچاننا اور احادیث مندرجہ کو پرکھنا تو اہلِ فن ہی کا کام ہے۔ باقی عام ایک ناظر کے نقطۂ نظر سے تو فاضل مؤلف نے ایک اہم دینی خدمت انجام دی ہے اور احناف کی ذمہ جو قرض صدیوں سے چلا آرہا تھا اسے ادا کرنے کی سعادت انھیں حاصل ہوگئی ہے۔ قابلِ رشک ہیں ایسی ہستیاں جو اس دور میں بھی کساد بازاری اور کسمپرسی کے ہر پہلو کو آنکھیں بند کئے ہوئے خدمتِ دین کی دھن میں لگی ہوئی ہیں۔"

مولانا یوسف الھروی (افغانستان) اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں:

"کتاب" زجاجۃ المصابیح" میں نے اپنے قرابتداروں کو پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید تھی کہ پہلی دونوں جلدوں کے اختتام سے پہلے آخری دونوں جلدیں یا ان میں سے ایک مجھ کو وصول ہو جائے گی۔ ہر پہلی دو جلدوں کا درس ختم ہو چکا ہے۔ میں نے متن اور اس کے حاشیہ کا مطالعہ کیا ہے اس کتاب کو بہت فائدہ مند اور فقہ و حدیث کی جامع پایا۔ یہ کتاب زجاجۃ المصابیح بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔"

تبصرہ: ماہنامہ "معارف" برائے ماہ اپریل ۱۹۵۵ء میں اس کتاب پر اس طرح تبصرہ کیا گیا ہے: کہ

"حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کی فقہ پر یہ بہت پرانا اعتراض ہے کہ امام صاحب احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے تھے اور فقہ حنفی کی بنیاد حدیث و سنّت سے زیادہ قیاس پر ہے مگر ہر زمانہ میں اس کے اتنے جوابات دئیے جا چکے ہیں کہ اب اعتراض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

مولانا سید عبداللہ شاہ صاحب، نے جو عالم دین ہونے کے ساتھ ایک صاحب باطن بزرگ بھی ہیں، اسی نقطۂ نظر سے "مشکوٰۃ المصابیح" کے طرز پر "زجاجۃ المصابیح" پانچ جلدوں میں تالیف فرمائی ہے۔ اسی لیے ابواب کی ترتیب فقہی ہے اور ہر باب سے متعلق حنفی مسائل کی تائید میں احادیث و سنن اور اقوال و آثارِ صحابہ و تابعین کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان مسائل کے متعلق حاشیہ میں آیاتِ قرآنی بھی لکھ دی گئی ہیں۔ جن مسائل میں ائمۂ احناف کے اقوال مختلف ہیں ان میں مفتیٰ بہ قول اختیار کیا گیا ہے۔ اور اس کی مؤید احادیث نقل کر دی گئی ہیں۔ فقہ حنفی کے جن مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے اور ان سے متعلق احادیث کے مفہوم کی توضیح اور تعین کر کے حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی ہے اور حسبِ ضرورت حنفی کتابوں کے حوالہ سے مسائل کا بھی جا بجا اندراج کیا گیا ہے۔ اور ان سے متعلق حدیثیں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور خصوصیات بھی ہیں۔ جن کا اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ ان خصوصیات کے وس کتاب کا افادہ اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ حضرت مؤلف نے یہ کتاب مرتب کر کے فقہ حنفی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

آخر میں دار العلوم دیوبند کی رائے کو مجملاً پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مشکوٰۃ کے ساتھ ساتھ یا مشکوٰۃ کی جگہ "زجاجۃ" کو مدارس دینیہ اپنے نصاب میں داخل کر لیں۔

"مؤلفِ کتاب حضرت مولانا سید عبداللہ شاہ صاحب خلف حضرت مولانا سید مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اتقیاء دکن میں سے ہیں، جامع شریعت و طریقت عالم ہیں اور مخلوق کو آپ کی ذات سے علمی و عملی فوائد و برکات حاصل ہو رہے ہیں، یہ کتاب آپ کی علمی خدمت کا شاہ کار ہے اس لیے "زجاجۃ المصابیح" اپنے موضوع کی خوبی کے ساتھ ساتھ اپنی نسبت کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر اور لائقِ استفادہ ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مدارس دینیہ میں مشکوٰۃ المصابیح، کے ساتھ ساتھ یا اس کی جگہ "زجاجۃ المصابیح" بھی رائج ہو جائے تاکہ طلبا کے سامنے مذہب حنفی کے حدیثی مسلک ہونے کی شہادتیں نفسِ کتاب و نصاب سے بھی مہیا ہو سکیں۔ واللہ الموفق"۔

میلاد نامہ اس کتاب میں "کن فیکون" سے پہلے کی حقیقتوں کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ نیز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "نور" سے "ظہور" میں آنے تک کی تفصیلات کا دلکش مرقع پیش کیا ہے۔

یوسف نامہ قرآنِ مجید میں سورہ یوسف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کو "احسن القصص" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی تفسیر میں بڑے بڑے علماء سے لغزش ہوی لیکن حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بصیرت سے اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔ جس میں معرفت وحقیقت ہے۔ چناں چہ حضرت ممدوحؒ نے اس کا نام "گلدستۂ طریقت" بھی تجویز فرمایا ہے۔

نورالمصابیح کے نام سے "زجاجۃ المصابیح" کا اردو ترجمہ زیرِ تکمیل ہے۔ اب تک اردو زبان میں "نورالمصابیح" آٹھ جلدیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں اور یہ کام حضرتِ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ اور استاذ الاساتذہ پروفیسر حضرت مولانا محمد عبدالستار خان صاحب زید مجدہٗ، سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی نگرانی میں جاری وساری ہے اور جن کی تبحرِ علمی اور دیرینہ تجربہ کی وجہ سے نورالمصابیح کو چار چاند لگ گئے ہیں پیچیدہ فقہی مسائل کو عام فہم بنانے کی غرض سے آپ نے جگہ جگہ (ف) کا اضافہ فرماکر مسائل کو سمجھایا ہے۔ برسبیلِ مثال زجاجۃ المصابیح میں طہارت اور دعا میں حد سے بڑھنے کے متعلق ایک حدیث کا اردو ترجمہ اور پھر (ف) کے تحت اس کی تشریح ہدیۂ قارئین ہے:

"حدیثِ شریف:۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے لڑکے کو کہتے ہوئے سُنا کہ الٰہی میں تجھ سے جنّت کے دائیں جانب کے قصرِ ابیض (یعنی سفید محل) کی درخواست کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہٗ نے اس سے کہا کہ اے لڑکے اللہ سے جنّت کا سوال کر اور دوزخ سے پناہ مانگ۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ عنقریب اس اُمّت میں ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے"

(اس کی روایت امام احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ نے کی ہے۔)

(ف) "طہارت میں حد سے بڑھنا یہ ہے کہ تین بار سے زیادہ اعضاء دھوئے اور پانی زیادہ خرچ کرے۔ اور دھونے میں اس قدر مبالغہ کرے کہ حدِ وسواس کو پہنچ جائے اور دعا میں حد سے بڑھنا یہ ہے کہ بے ادبی کرے اور مطلب کے مانگنے میں قید لگائے۔ یا ایسی چیز کا سوال کرے جو امکان اور عادت سے باہر ہو۔"

(نورالمصابیح: حصہ اول: ص: ۲۲۳)

نورالمصابیح بغیر عربی متن کے شائع ہوی ہے لیکن آج کل پاکستان میں اس کا انگریزی ترجمہ ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ انگریزی ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع ہوگا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے مال و دولت

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی۔ استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

زندگی کی تعمیر و ترقی، صلاح و فلاح اور بہتری و بہبودی کے باب میں مال و دولت کی ضرورت و اہمیت اور افادیت کو نظر انداز اور فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے مال و دولت سے متعلق جو حکیمانہ منصفانہ اور معتدلانہ موقف پیش کیا ہے وہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ اقوام عالم کے لیے بھی ایک زرین اصول اور ایک بہترین ضابطہ ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر سارے انسان پُر مسرت اور پُر سکون زندگی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر اسلام کی اولین ہدایت یہ ہے کہ مال و زر اور دولت و ثروت زندگی کا مقصد اور نصب العین نہیں ہے بلکہ وہ تو زندگی گزارنے کے لئے ایک ذریعہ اور واسطہ ہے اور اصل مقصد تو ایمان طاعت، عبادت اور انسانیت ہے۔ آدمی مال و دولت تو حاصل کرے لیکن اپنے دل میں اس کی پوجا و پرستش نہ کرے۔

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں: دولت کی مثال ایک سمندر جیسی ہے اور آدمی کا قلب کشتی کے مانند ہے۔ پانی کشتی سے باہر رہے تو وہ تیرتی اور رواں دواں رہے گی اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہوگیا تو کشتی اور صاحبِ سفینہ دونوں غرق ہوجائیں گے۔

عارفِ رومی کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ دولت کا مقام مومن کا قلب نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ خارجِ قلب ہے۔ یعنی دولت کمائے اور اس کو صحیح اور جائز محل اور مفید و کارآمد مصرف میں خرچ کرے اور اس سے قلبی محبت نہ رکھے۔ قلبی محبت اور روحی الفت تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رکھنی چاہیے۔ اسی حقیقت کو کسی صوفی بزرگ نے بہت ہی مختصر اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ "دست بکار و دل بیار"۔ ہاتھ کام میں رہے اور دل یار کے ساتھ جڑا رہے۔ وحیٔ محمدی کی زبان میں: اموال اِقترفتموھا" جو اموال تم نے کمایا ہے اس کی محبت اللہ کی محبت کے مقابلہ میں غالب آجائے تو یہی چیز تمہارے حق میں ہدایتِ ربانی سے محرومی اور مصائب و فتن کے نزول کا موجب بن جائے گی۔

اسی لیے اہلِ دل حضرات نے کبھی دولت کو اپنے قلب میں جگہ نہ دی۔ ایک مرتبہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ اولیاء نے اپنے مریدوں سے سوال کیا کہ بتاؤ اگر کوئی شخص یہ وصیت کر جائے کہ میری دولت میرے بعد دنیا کے سب سے اچھے آدمی کو دے دی جائے تو تم وہ دولت کس شخص کو دو گے؟

اس سوال کا ہر شخص نے مختلف جواب دیا۔ آخر میں حضرت نے فرمایا: دنیا کا سب سے اچھا آدمی وہ ہے جس نے دنیا ترک کر دیا ہو۔ یہ سُن کر سارے مریدین حیران رہ گئے۔ اور ایک شخص نے پوچھا کہ حضور! جب وہ شخص تارک دنیا ہوگا تو وہ اس دولت کو قبول ہی کیوں کرے گا؟

حضرت نے فرمایا: تارک دنیا اس کو نہیں کہتے جس کے پاس خرچ کرنے کو کچھ موجود ہی نہ ہو اور وہ مفلس و کنگال ہو۔ بلکہ دنیا کو ترک کرنے والا وہ ہے جو جمع کر کے نہ رکھتا ہو اور اپنی آمدنی جائز طریقے سے خرچ کرتا ہو۔ یہی وہ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کی ذاتِ گرامی ہے جن کے اصطبل میں گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے تھے۔ بادشاہِ وقت نے اعتراض کیا کہ یہ کیسی درویشی ہے؟ تو آپ نے یہ جواب دیا: "کجا اند اختم در دل نگرا نداختم در گل"۔ میں نے سونے کی میخوں کو اپنے دل میں نہیں گاڑا ہے، مٹی میں گاڑا ہے جس پہ گھوڑے پیشاب کرتے ہیں۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ ایک عظیم سلسلۂ تصوف کے بانی، روحانی پیشوا، دینی مقتدا اور عالم و فاضل ہونے کے باوجود ایک بہت بڑے دولت مند اور ایک عظیم تاجر تھے۔ جن کی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں آپ کو خبر دی گئی کہ جو جہاز آپ کا اسبابِ تجارت لے کر گیا تھا وہ غرق ہوگیا اور سارا مال تباہ و برباد ہوگیا۔ آپ اس خبر کو سُن کر فرماتے ہیں الحمد للہ۔ اس کے بعد جب دوبارہ آپ کو خبر دی گئی کہ پہلی اطلاع غلط تھی اب معلوم ہوا کہ آپ کا جہاز صحیح و سالم اور خوب منافع لے کر واپس ہوا ہے تو یہ خبر سن کر بھی آپ فرماتے ہیں: الحمد للہ۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا: حضور! غم کی خبر سُن کر آپ نے الحمد للہ فرمایا: اس پر آپ نے کہا: غم کی خبر سُن کر میں نے اپنے قلب کا جائزہ لیا کہ اس پر نقصان و خسران کا اثر کیا واقع ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس پہ کوئی اثر نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت میں غرق ہے۔ جب خوشی کی خبر ملی تو میں نے پھر اپنے قلب کا جائزہ لیا۔ اس پہ بھی خوشی و مسرت کا اثر کیا واقع ہوا ہے معلوم ہوا کہ اس پہ کوئی اثر نہیں ہے بلکہ وہ بدستور اللہ کی یاد اور محبت میں غرق ہے۔ غم و خوشی کی خبروں سے بے نیاز رہنے اور اللہ کی یاد میں مشغول رہنے پر میں نے الحمد للہ کہا۔

اس واقعہ سے "دست بکار و دل بیار" کی حقیقت نمایاں ہوگئی کہ دولت دل سے باہر تھی اس کے لیے قلب میں جگہ نہ تھی۔

مال وزر، دولت وثروت اور سرمایہ سے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس کی تحصیل اور اکتساب تو ہو لیکن اس پر بھروسہ و تکیہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل ہو اور اس کے حصول و یافت میں افراط اور انتہا نہ ہو بلکہ اتنی مقدار پر اکتفا اور قناعت کیا جائے جس سے زندگی کی جائز ضروریات اور حاجات کی تکمیل ہو سکے۔ اس سلسلہ میں صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ کا یہ کردار لائق ستائش اور قابلِ عمل ہے۔

ایک مرتبہ شام کے گورنر حبیب ابن سلمہؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں تین سو دینار بھیجا اور عرض کیا کہ وہ اس کو اپنی ضروریاتِ زندگی میں خرچ کرے۔ حضرت ابوذرؓ نے واپس کرتے ہوئے فرمایا: اتنی بڑی رقم میرے پاس رکھنا اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا ہے۔ مجھے صرف ایک مکان کافی ہے جس میں رہائش پذیر رہوں اور تین بکریاں جن کے دودھ سے ہم سب گزارا کرسکیں اور ایک خادم جو ہماری خدمت کرسکے۔ اس سے زائد جو بھی ہو اس کے اندر مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے۔

اصحابِ بصیرت کا رزقِ مطلق پر یقین کا یہ عالم بھی رہا کہ انہوں نے اسباب و وسائل کو بھی اپنے ذہن و قلب سے محو کر دیا۔ اسلام کی تاریخ نے ایسے نقوش کو محفوظ کر دیا جو آیندہ کی نسلوں کے لیے سامانِ عبرت فراہم کرسکے۔ خانوادۂ حضرت قطبِ ویلورؒ کی مایہ ناز علمی و عرفانی شخصیت حضرت غلام محی الدین سید شاہ عبداللطیف ذوقیؔ قادری علیہ الرحمہ کے پاس ایک مرتبہ نواب والاجاہ جاگیر کا پروانہ لیے ہوئے حاضر ہوئے اور آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ رات کا وقت تھا۔ چراغ جل رہا تھا۔ آپ نے جاگیر کا پروانہ لیا اور شمع پر رکھ دیا۔ جس سے وہ جل گیا۔ نواب صاحب یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے اور عرض کیا: حضرت! میں نے یہ جاگیر کا پروانہ آپ کی اولاد کے لیے پیش کیا تھا اور آپ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا: فرمانے لگے: پروانہ تھا، شمع کے نثار ہوگیا۔ میری اولاد کی پرورش و کفالت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے۔

ایک طرف حضرت ذوقیؔ کے استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف سخاوت و فیاضی کا یہ عالم تھا کہ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کے لنگرخانہ سے روزانہ ایک سو بیس سیر چاول تقسیم ہوتے تھے اور کوئی سائل آپ کے در سے محروم اور خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔

"از امرا و اغنیا نہایت بے پروا بود و در جود و کرم بے ہمتا۔ سائل را محروم نمی نمود و ہر روز در لنگر خود یک صد و بیست سیر برنج بہ مستحقاں تقسیم می نمود۔"

اسلام نے مال و دولت کی کثرت اور وسعت کو بھی مذموم اور قبیح نہیں قرار دیا جب کہ

صاحبِ مال و دولت سے متعلق عاید ہونے والے حقوق و فرائض، واجبات و مستحبات اور جائز و مستحسن تقاضوں کو امانت و دیانت کے ساتھ پورا کردے جیسا کہ دین کے اولین علم بردار حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور دیگر متمول و مال دار صحابۂ کرامؓ نے اپنی دولت کے حقوق و فرائض بحسن وخوبی ادا کیا اور اپنے پیچھے قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا۔ مال کی وسعت و کثرت اگر غیر محمود اور نا مسعود ہوتی تو زبانِ نبوتؐ سے بعض صحابۂ کرامؓ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت میں برکت کے لیے اور حضرت انسؓ کے مال و اولاد میں زیادتی و کثرت کے لیے دعائیہ کلمات صادر نہ ہوتے۔ اَللّٰھُمَّ اکثرمالہ وولدہ وبارك له فیما اعطیتہ۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ صاحبِ مال اگر نیک اور صالح ہو تو وہ دولت کے حقوق و فرائض اور تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس کی دولت بھی نیک ہوتی ہے اور نیک مصارف ہی میں صرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ نبویؐ میں بھی یہ اشارہ موجود ہے: نعم المال الصالح للرجل الصالح صاحبِ مال اگر نیک اور صالح نہ ہو تو وہ دولت کے حقوق و فرائض کو بھی ادا نہیں کرتا اور اس کی دولت بھی نیک نہیں ہوتی ہے اور بُرے مصارف ہی میں صرف ہوتی ہے اور پھر یہی دولت اس کے لیے دنیاوی و اخروی نقصان و خسران کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

چناں چہ قرآنِ کریم نے اس نوع کے ایک کردار کو محفوظ رکھا ہے کہ قارون اپنی باطنی خباثت اور قلبی گندگی کے باعث دولت و ثروت کی کثرت و وسعت سے غرور و پندار اور فخر و تکبّر اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔ اور مال و دولت کے حقوق و فرائض اور اس کے تقاضوں کو فراموش کردیا۔ اس پر لوگوں نے احسن کما احسن اللّٰہ الیك (اللہ نے تیرے ساتھ دولت کے ذریعہ احسان کیا ہے، تو بھی انسانوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کر) کے عبرت خیز الفاظ کے ذریعہ اس کو پند و نصیحت کی۔ لیکن اس نے اعراض کیا۔ آخر کار عقوبتِ خداوندی میں گرفتار ہو چلا اور اپنے پہل خانہ گنج کے ساتھ زمین میں دھنسا چلا گیا۔

اسلام نے اس حقیقت کو بھی کھول دیا ہے کہ قلبِ سلیم سے محروم صاحبِ دولت نے اپنی پونجی کو فسق و فجور اور ظلم و ستم اور گناہ و معصیت میں خرچ کردی تو یہی دولت آخرت میں وبال اور نکبت کا موجب بن جائے گی: یوم لا ینفع مال

اس کے برعکس قلبِ سلیم کے مالک نے اپنی پونجی کو فی سبیل اللہ اور صدقاتِ جاریہ میں خرچ کردی اور سلامتیٔ دل کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا تو یہی دولت ایسے شخص کے لیے دنیا

اور آخرت میں نافع اور مفید ہوگی۔ جیسا کہ ان احادیث سے یہ مطالب اور مفاہیم سمجھ میں آرہے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر روز جب لوگ صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ اور یہ دعا کرتے ہیں: اللھم اعط منفقاً خلفاً: اے اللہ! مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ اور عوض عطا فرما۔

اذا مات الانسان انقطع عملہ الامن ثلث صدقۃ جاریہ او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعولہ: آدمی انتقال کر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کے ذریعہ اس کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ صدقۂ جاریہ، علمِ نافع اور صالح بیٹا جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہے۔

اسلام نے مال و دولت کو مطلق شجرِ ممنوعہ نہیں قرار دیا ہے۔ اور نہ ہی مطلق مال کو جمع کرنا حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔ اور یہ سارے احکام و مسائل جن کی ہدایات ہیں ان پر عمل دولت کے بغیر کیوں کر ممکن ہے۔ مثلاً زکوٰۃ، حج، انفاق فی سبیل اللہ، قربانی، صدقات، وراثت، وصیّت، فدیہ، کفارہ، دیت، خون بہا، جہاد، نیکی کے کام، سائل، محروم اور مالی قرض کے ماسوا دیگر امور میں خرچ اور صرف کرنا، دولت کو اچھے مقاصد میں صرف کرنے کے لیے اور اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لیے اور اپنے اہل و عیال کی زندگی بہتر بنانے کے لیے اور اپنے آپ کو فقر و مسکنت اور سوال کی ذلّت سے محفوظ رکھنے کے لیے جمع کرنا محمود اور پسندیدہ اقدام ہے۔ اس سلسلہ میں ذیل کی احادیث اور آثار ملاحظہ کیجیے۔

حضرت مقدام بن معدی کرب ایک صحابیٔ رسولؐ ہیں۔ جن کی خادمہ اُن کے جانوروں کا دودھ بیچا کرتی تھی اور حضرت مقدام اس کی قیمت لیا کرتے تھے۔ کسی صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے ازراہِ تعجب پوچھا: آپ دودھ فروخت کر کے اس کی قیمت لیتے ہیں؟ ان کا مطلب یہ تھا۔ دودھ تو بلا قیمت احباب و متعلقین میں تقسیم کرنے کی چیز ہے۔

اس پر حضرت مقدام نے فرمایا: مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح کرنے میں کوئی قباحت اور حرج نہیں ہے۔ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ عنقریب لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ درہم و دینار کے سوا ان کو کوئی چیز نفع نہ دے گی اور یہی درہم و دینار اُن کو حرام میں واقع ہونے اور لوگوں کے اموال میں طمع کرنے سے بچائیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کادالفقران یکون کفرا : قریب ہے کہ فقر و افلاس اور تنگ دستی آدمی کو کفر و معصیت کی طرف لے جائے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی فقر و افلاس اور تنگ دستی اور سخت تکلیف اور مصیبت کے وقت کفر کے ارتکاب پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی۔ (بخاری) بہترین صدقہ وہ ہے کہ غنا کو باقی رکھا جائے۔ یعنی اہل و عیال کی ضروریات اور اخراجات کے مطابق رکھ لے اور اس کے بعد زائد کو صدقہ کر دے۔

بخاری کی ایک مشہور اور طویل حدیث ہے جس میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنی بیماری میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے انھیں منع فرمایا اور ایک تہائی مال کی وصیت کرنے کی اجازت دیتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔

انك ان تذر ورثتك اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس۔

تم اپنے اہل و عیال کو غنا کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے چلے جاؤ۔ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تم انہیں محتاجی کی حالت میں چھوڑ جاؤ کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں۔

امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس مال ہو تو چاہیے کہ اس کو فروغ اور ترقی دے۔ اس لیے کہ یہ ایسا دور ہے اگر کوئی شخص محتاج ہو جائے تو وہ اپنے دین کو دنیا کے بدلہ ہاتھ سے دے دے گا۔ اور حلال مال میں اسراف نہیں کرنا چاہیے اور اس کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ اور احتیاط سے خرچ کرنا چاہیے۔ تاکہ ایک مدت تک باقی رہے اور دین و ایمان کی تقویت کا سبب بن سکے۔

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص لوگوں سے سوال کرے حالاں کہ نہ اسے فاقہ پہنچا اور نہ اتنے بال بچے ہیں، جن کے خرچ کی طاقت نہیں رکھتا تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔

نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا: جو شخص بغیر حاجت و ضرورت سوال کرتا ہے تو گویا وہ آگ کا انگارہ کھا رہا ہے۔

مذکورہ امثال اور شواہد سے واضح ہو رہا ہے کہ مال و دولت جمع کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی یہ تاکید اور تنبیہ بھی ہے اس کے جمع کرنے میں

شرعی حدود کو پامال نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی پڑھ لیجئے جو بہت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جب اپنی وفات کے بعد تمہارے اوپر اس دَور کے آنے سے اندیشہ کرتا ہوں جب دنیا کی تازگی و شادابی اور اس کی زیب و زینت تمہارے اوپر کھول دی جائے گی۔ یعنی اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اسبابِ عیش و عشرت کی فراوانی اور کثرت ہوگی۔

ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا خیر سے شر پیدا ہوگا؟ یعنی مال و دولت کا حاصل کرنا تو خیر ہے پھر یہ شر کا سبب کیسے ہوگا؟

اس وقت آپؐ نے سکوت فرمایا: یہاں تک کہ گمان ہوا کہ آپؐ پر وحی کا نزول ہو رہا ہے۔ ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانیٔ مبارک سے پسینہ صاف کیا اور سائل کے اس سوال پر تعریف کی۔ پھر ارشاد فرمایا:

خیر براہ راست اور بذاتِ خود شر کا سبب نہیں ہوگا۔ مگر ایک امر عارض اور واسطہ کی وجہ سے اس کو شر لاحق ہوگا۔ مثلاً حرص، بخل، اسراف، حدِ اعتدال سے تجاوز ان عوارض کی وجہ سے شر کا ظہور ہوگا۔

اس کے بعد آپؐ نے مال و دولت کے سببِ شر ہونے کو مثال سے واضح فرمایا کہ:

موسمِ بہار میں جو گھاس اور سبزے اُگتے ہیں، اس کو بہت زیادہ کھا لینے سے بعض دفعہ جانور مر جاتے ہیں یا قریب المرگ ہو جاتے ہیں تو جس طرح موسم بہار کے سبزوں اور پودوں میں بذاتِ خود شر اور ضرر نہیں ہے بلکہ یہ ضرر اور ہلاکت کھانے میں حرص اور افراط کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح مال و دولت کا حال ہے۔

اس مقام پر ملّا علی قاری کا یہ بیان بھی ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

جو شخص مال و دولت کی تحصیل اور جمع کرنے میں مبالغہ سے کام لیتا ہے اور حلال و حرام کا فرق و امتیاز نہیں کرتا تو وہ انجام سے غافل و بے خبر ہو کر تن آسانی اور عیش پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ رحم و کرم اور ہمدردی و غم گساری کا مادّہ دل سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ اہلِ حقوق کے حق کی بھی پروا نہیں کرتا۔ فخر و غرور اور تعلّی اس کا مزاج بن جاتا ہے۔ اور یہی مال اس کے لیے ہلاکت و تباہی اور خسارہ کا باعث ہو جاتا ہے۔

حاصلِ کلام!

مذکورہ دلائل و براہین اور توضیحات سے مال و دولت کی مختلف اور متنوع حیثیتیں اور جہتیں نمایاں ہوگئیں۔ اگر کچھ افراد اور اشخاص مال و دولت کے باب میں میانہ روی و توازن، توسط و اعتدال اور احتیاط کا دامن چھوڑ کر شرعی حدود کو پامال کرتے ہوئے اس کی تحصیل اور اس کے جمع کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین ٹھہرالیں تو یہ اُن کی ایمانی کمزوری اور آخرت فراموشی اور ان کی دنیاوی واخروی تباہی کی علامت ہے۔ اور اگر اس کے برعکس کوئی شخص جائز اور حلال راستوں سے مال و دولت حاصل کرے اور اس کے ذریعہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کو خوش گوار اور پُرمسرت بنائے اور قوم و ملّت کی زندگی کے گیسو سنوارے تو اس کا یہ اقدام اور عمل عنداللہ محبوب و مقبول اور دنیا و آخرت میں نفع بخش اور سود مند ثابت ہوگا۔

وما علینا الا البلاغ ••

•• بقیہ "جواھر القرآن" ص ۱۹ سے آگے •

لایتعبد بھا نسخھا فی حقہ وحق غیرہ وتکلیفہ باحکام ھذہ الشریعۃ اصلاً وفرعًا فلا یکون الیہ علیہ السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحاکما من حکام ملتہ بین امتہ ــ پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو آپؑ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے اس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے۔ لیکن آپ اپنی پچھلی شریعت کے عامل اور پیرو نہیں گے۔ کیوں کہ وہ آپؑ کے حق میں اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے۔ اور اب آپؑ اصول اور فروع میں شریعتِ مصطفویؐ کی اتباع و پیروی پر مکلف ہوں گے۔ لہٰذا آپؑ پر نہ اب وحی آئے گی اور نہ آپؑ کو احکام مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔ بلکہ آپؑ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپؑ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں ملّتِ محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے شرعی احکام کا نفاذ فرمائیں گے۔

درسِ نظامی کے نصاب کی معروف کتاب "شرح عقائد" میں مرقوم ہے: یتابع محمداً علیہ السلام لان شریعتہ قد نسخت فلا یکون الیہ وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفۃ رسول اللہ علیہ السلام۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے اس لیے کہ ان کی شریعت منسوخ ہو چکی اُن کی طرف نہ وحی آئے گی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے۔ بلکہ وہ نائبِ مصطفیٰ کی حیثیت سے دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں گے۔ ••

[جاری]

اسلام، ایمان، احسان

شاہ شیخ عبدالرحیم کاملی ویلوری

ایمان کیا ہے؟

یہاں بھی لطفِ کلام کی رعایت چاہتا ہوں ؎

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
بسمل نہیں ہے تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

جیسا کہ عمل کے لیے اخلاص ضروری ہے ایمان کے لیے حبِ محمدؐ (یا عشق) ضروری ہے ؎

ہیں عدد حبِ محمدؐ اور ایمان کے وہی جس کو ہو حبِ محمدؐ اُسے ایمان آیا
سچ پوچھو تو عشق ہی بنائے معرفت ہے خالق نے بھی یہی کہا۔ (مشہور حدیثِ قدسی ہے)
جب مجھے محبت ہوئی کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو پیدا کیا اور اول ما خلق اللہ نور
[حدیث: انا من نور اللہ و کلھم من نوری] خلق کو وجود میں لانے کے لیے حرکت کا باعث "عشق" ہے۔ وجہ تخلیق و تجلّی محبت ہے۔ وجود (حیات) بنائے عشق ہے۔ تصوّف کا اصلی مقام عشق ہوا۔ ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق دمِ جبرئیلؑ عشق دمِ مصطفٰےؐ
عشق خدا کا ہے رسولؐ عشق خدا کا ہے کلام

جان و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق! (اقبالؒ)

ہست معشوقے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنما یمت

ایک معشوق تیرے دل میں ہے
آنکھ رکھتا ہے تو آ، دکھلا دوں تجھے

در دلِ مسلم مقامِ مصطفٰےؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفٰےؐ است

مسلم کے دل میں مصطفٰےؐ کا مقام ہے
آبرو ہماری مصطفٰےؐ کے نام سے ہے

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر بنگری با دیدۂ صدیق اگر
میرے حرف کے معنی کے تحقیق اگر کرے اور صدیقؓ (یارِ غار) کی نظر سے اگر دیکھے تو

ےہ یہ خدا کا حبیب ہے کون ہے وہ بشر جس پہ خدا خود اور سارے ملائکہ درود پڑھ رہے ہوں

لیکن آج کیا حال ہے ۔ اسلام کو جان لیا ۔ ایمان کو نہیں جانا ۔ فتنوں اور تفرقوں کی آگ کی چنگاریاں جا بجا نظر آتی ہیں اور اس کے دھوئیں میں گھرا ہوا مسلمان اپنی بصارت ہی نہیں بصیرت بھی کھو بیٹھا ۔ لفاظی اور منطقی جملوں میں کھو گیا ۔ ےہ

بجھی آگ عشق کی اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (اقبالؒ)

صالحین کی اور اولیاء کی مثالیں جنھوں نے عشق کی آگ میں جل کر خود انگارے بن گئے ۔ تاریخ اسلام ان سے مزین ہے ۔ طوالت کے لحاظ سے یہاں گنجائش نہیں ۔

بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ ہے کہ عشق (محمدؐ سے) ہی ایمان کی جڑ ہے ۔ اس کے بغیر حقیقتِ محمدؐ کی پہچان محال ہے ۔ عشق حقِّ محمدؐ ہے ۔ حقِّ محمدؐ ادا نہ ہوا تو ایمان کہاں حاصل ہوا ۔

اسلام سے تسلیم رب کر لیا ایمان سے تصمیم رب کرنا ہے

اور عشق اتنا آسان بھی نہیں ہے آزمائش ہے اور آتشِ امتحاں سے گزرنا پڑے گا ۔ بقولِ حافظ شیرازی ےہ

کہ عشق آسان بود اول و لے افتاد مشکلہا

ناسمجھ نے مرتبہ و مقام کو نہ سمجھا ، عمر برباد کی ۔ جب ہدایت ہوئی تو پچھتایا اور کہنے لگا : ےہ

ہر فون کا نہ ور جو لوٹا تھوڑا سا آرام ملا ۔ دنیا کے قابل نہ رہے جب آئی سمجھ میں دنیا کیا

احسان کیا ہے :

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اور عمل کے لیے اخلاص ۔ اسی طرح اسلام اور ایمان کو پا لیا تو احسان ضروری ہے ۔ جس طرح اخلاص روح کی تربیت سے حاصل ہوتا ہے اور علمائے حق پرست سے حاصل ہوتا ہے ۔ اسی طرح احسان بھی سوائے حق پرستوں کے اور کوئی ذریعہ نہیں رکھتا ۔ یہ عبادت گاہیں ، اسلامی پوشاکیں ، ظاہری نماز کی جا بجا نمائشیں ، سیر و گشت ، نعرے و جلوس ، اسلام کا خوب پتہ دیتے ہیں ۔

ایمان ایک باطنی قلبی کیفیت ہے جو ہر مسلمان فرد کے لیے خاص ہے ۔ اس بات کا پتہ لگانا آسان نہیں ۔ عشق سے براست نسبت رکھتی ہے ۔

حدیث : (اس کو حدیثِ جبرئیلؑ کہتے ہیں ۔) فاعبد واللّٰہ کانّک تراہ فان لّم تکن تراہ فانّہ

یَرَاکَ (ترجمہ) عبادت کرو اللہ کی جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہ دیکھ سکو تو (ایسی) گویا وہ تم کو دیکھ رہا ہو۔

الفاظ پر غور فرمائیں (جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہوں) کیا یہ ممکن ہے؟ حدیثِ دجّال مشہور ہے۔ دنیا میں کسی کو اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ موسیٰؑ کو "لن ترانی" کا جواب مل چکا اور کیا یہ بھی مستقل تصوّر کر سکتے ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے؟

اگر یہ ممکنات سے نہ ہوتا تو پھر حدیث کی شکل میں کیوں مذکور ہوا؟ یہ مشق آسان نہیں نظر آتی؟ حضرت امامِ ربانی مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے کہ احسان علمائے حق پرست (صوفیاء) سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ علمائے ظاہری سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ سیدنا و مرشدنا حضرت ابوالحسن قربیؒ (قطبِ ویلورکا) ارشاد ہے۔ ؎

کرتے ہیں خود نمائی ہو کئیں بڑے فقیراں　　کمتر فقیر یاں کا یے تنک خدا نما ہے

خدا نما ہوا جو میں تو کچھ نہیں ہے عجب
ہر ایک ذرّہ ہے جہان میں خدا نمائے دوست

خدا کو دیکھنا یا خدا کی دید کے لیے مطمع نظر بن جانا اس کی توجّہ کو اپنی طرف مبذول کر لینا اس طرح کہ تمہاری آنکھ بن جائے جس سے تم دیکھتے ہو، کان بن جائے جس سے تم سُنتے ہو، ہاتھ بن جائے جس سے تم پکڑتے ہو، پاؤں بن جائے جس سے تم چلتے ہو.... اور اگر تم اس سے کچھ مانگو تو عطا ہو۔ (ایک حدیث کے الفاظ)

یہ فن صوفیا ہی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ مرشدِ کامل سے ہو سکتا ہے۔ ؎

قال را بگذار مردِ حال شو　　زیر پائے کاملے پامال شو　　(رومیؒ)

تمام اقوال کو چھوڑ کر مردِ حال بن　　ایک کامل کے پیر تلے پامال ہو جا

مردِ "حال" اور مرد "مقام" بننے کے لیے بھی چند تقاضے حائل ہیں۔ ان کی تفصیل ایک الگ موضوع ہے۔ خواجہ بندہ نوازؒ نے انھیں "علومِ عالیہ" کہا ہے۔ جیسے توبہ، زہد، تقویٰ، ورع، ریاضت، صبر، رضا، توکل محبت، مشاہدہ، مجاہدہ، محاسبہ، صدق و اخلاص، شکر و ذکر، فکر و مراقبہ، اعتبار، وجد، جمع و فرق، حقائق و دقائق ـــــ شہوات نفسانی سے پرہیز وغیرہم اس کو راہِ سلوک بھی کہتے ہیں۔

علم و عمل اور تکمیل کے لیے اخلاص کی راہ بتانا اور احسان کی تربیت کرنا علمائے ربّانی صوفیا کا ہی خاصّہ رہا ہے۔

انسانی علم کے مدارج یہیں سے شروع ہوں گے۔ ذاتِ بندہ اور ذاتِ حق میں فرق ثابت ہے۔ اس کو فرق کر کے جمع کرنا ایمان ہے۔ یہ فن بھی صوفیا ہی جانتے ہیں۔ ایمان ہی سے حق کا ظہور ہوگا یعنی علمِ حق ہوگا۔ علمِ حق، نورِ خدا۔ ایمان ہی سے نور کو پہچانا جا سکتا ہے۔ جب نور ظاہر ہو گیا تو ظلمت کا حجاب دور ہو گیا۔ انکارِ حقیقت کفر ہے۔ اس میں شک کیا تو منافق ہے۔

جنوبی ہند میں حضرت مکان کی خاص اہمیت ہے۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ محروم ہو کر نہیں جاتا میرے والد جناب لفٹنٹ محمد شریف صاحب نے پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں حصہ لیا تھا۔ واپسی کے بعد ویلور کو اپنا مقام بنالیا۔ حضرت مکان کے بزرگوں سے میل جول رہا اور یہاں کے ہر جلسے میں حصہ لیتے تھے۔ ہمارے گھر کی مستورات بھی یہاں آتی تھیں۔ اس طرح ایک خاندانی رابطہ قائم ہوا۔ اس دوران میرے دو بڑے بھائی جو مدرسہ میں تعلیم پا رہے تھے میرے والد ان کو ساتھ لے کر حضرت سلطان محی الدین سید شاہ عبد القادر قادری جو اس وقت کے سجادہ نشین تھے، کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت قبلہ سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت قبلہ نے حجرے میں بیٹھ کر دعا فرمائی اور یہ انھیں کی دعاؤں کی بدولت میرے دونوں بڑے بھائی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ سب سے بڑے بھائی محمد خلیل اللہ شریف ہندوستانی فوج کے بریگیڈیر کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے اور دوسرے بھائی محمد عزیز اللہ شریف نے I.A.S کا امتحان پاس کیا اور ٹمل ناڈو حکومت کے کئی شعبوں میں سکریٹری کے عہدے پر رہے اور ٹمل ناڈو سروس کمیشن کے چیرمن کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ سب حضرت مکان کے بزرگوں کی دعاؤں کا اثر ہے۔ اور یہ سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔

میرے والد صاحب مدرسہ کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول، ویلور کے انجمن والدین کے صدر تھے۔ ایک بار وہ اس انجمن کے جلسہ کی دعوت دینے کے لیے اسکول کے سامنے والے بنگلہ میں میونسپل کمشنر کو شرکت کی دعوت دے کر واپس آرہے تھے کہ اچانک ۱۵ر جنوری 1935ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مکان کی ایک اور ہستی کے متعلق، جن کو میں 1950ء سے جانتا ہوں، کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ بزرگ ہیں مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری المعروف بہ حضرت پیر صاحب، سابق ناظم

دار العلوم لطیفیہ ہیں ۔ جب مجھے امتحان میں ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا اور آپ سے ملا ۔ مجھے رنجیدہ دیکھ کر خندہ پیشانی کے ساتھ دریافت کیا ۔ احوال کو غور سے سنا اور سننے کے بعد میری ہمت بندھائی اور فرمایا : دراصل ناکامیاں، کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے ۔ اس کے بعد انسان اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی ہمت کرتا ہے ۔ پست ہمت ہونے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ کوشش کرنا اور نہایت توجہ کے ساتھ پڑھنا اور دماغ میں کامیابی کا تصور کرنا ضروری ہے ۔ ان شاء اللہ کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے ۔ یہ وہ نصیحت تھی جو میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ایک مضبوط ارادہ پیدا کرنے میں میری مدد کی ۔ جب کبھی آپ سے ملاقات ہوتی ہمیشہ کی طرح مجھے کچھ مفید باتیں بتاتے ۔ اور حضرت مکان کے بزرگوں کے واقعات بیان کرتے ۔ زمانہ گزرتا گیا اور میں کامیابی کی منزل ایک کے بعد دیگرے طے کرتا گیا ۔ بی اے، کیا اور پھر بی ٹی، مدرسہ میں استاد کا کام ملا ۔ بعد میں آگے چل کر ایم اے، کا امتحان پاس کر لیا ۔ یہ حضرت مکان کے بزرگوں کا فیض و کرم تھا کہ اسی اسکول یعنی اسلامیہ ہائیر سکنڈری اسکول میلوشارم میل وشارم میں مجھ کو ہیڈ ماسٹر کے عہدے پہ فائز کیا گیا اور جب یہ خوش خبری حضرت پیر صاحب قبلہ کو سنائی گیا وہ سن کر بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں ۔ میرے لیے یہ سنہرا دور تھا اور منزل کے اس حصے پہ پہنچا ۔

ایک طالب علم میں صبر و تحمل کا ہونا لازمی ہے ۔ اور دل میں خدا کا خوف اور لگن ہو تو کوئی کام مشکل نہیں ۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو صرف خدا کی خوشنودی کے لیے صرف کرے ۔

دنیا ایک عارضی گھر ہے ۔ جس میں سب کچھ تو ملتا ہے مگر ایک استاد کامل نہیں ۔ اس لیے طلباء کو چاہیے کہ وہ اپنے دور کے بزرگوں کے ساتھ میل جول رکھے اور ان کی باتوں پر عمل کریں ۔ ان شاء اللہ دل کو راحت نصیب ہوگی اور سکون ملے گا ۔

آج حضرت پیر صاحب ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں مگر وہ درس گاہ جہاں آپ چلتے پھرتے تھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہیں ۔

آج ان کی جگہ آپ کے داماد جناب مولانا سید شاہ عثمان پاشاہ قادری نے لی ہے ۔ یہ بھی قابل اور دور اندیش شخصیت ہیں ۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ مدرسہ (مدرسۂ لطیفیہ ویلور) ترقی کرے اور یہاں کے طلباء میں ایسے کردار نکھر آئیں جو قوم و ملت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں ۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ••

صحبتِ بد مانعِ ہدایت

مولوی حافظ جی۔ ہدایت اللہ ۔ کدری۔ متعلم جماعتِ ہفتم: دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

طلب کردن ز دانایان یکے پند   مرا گفتند با ناداں میپیوند   (سعدیؒ)

میں نے دانشوروں سے ایک نصیحت چاہی انہوں نے کہا کہ بد قماش لوگوں کے ساتھ نشست نہ رکھو۔

اسلام مہد سے لے کر لحد تک کی تعلیم دیتا ہے۔ جن کی نظر کسی خاص پہلو کی طرف گئی ہے وہ کوتاہ چشمی کا شکار ہیں۔ اسلام جس مخصوص تعلیم کو رواج دیتا ہے وہ اخلاق، کردار اور صحبتِ صالح ہے۔ کیوں کہ آدمی کا بننا، بگڑنا اخلاق سے ہے انسان کی ترقی و تنزلی کا راز صحبت میں مضمر ہے۔ نیک صحبت سے کتّا شرف و بزرگی پاتا ہے اور اچھی تعلیم سے طوطا انسانوں کی طرح باتیں کرتا ہے اور گھوڑا اپنی حیوانیت کو چھوڑ کر انسانوں کے کردار اپناتا ہے۔

چناں چہ قرآنِ کریم میں ہے وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید اور اصحابِ کہف کا کتّا اپنی باہیں چوکھٹ پہ پسارا رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں ابو الفضل جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے تو ان کی صحبت واجر کا حصّہ وہ بھی پاتا ہے دیکھو اصحابِ کہف کے کتے نے انؓ سے محبت کی اور ان کے ساتھ ہو لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی کر دیا۔

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب ایک کتّا صلحا اور اولیا کی صحبتِ نیک سے یہ مقام حاصل کر سکتا ہے تو تخمینہ کرو کہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اپنا رتبہ وہ کتنا بلند کر سکتا ہے!

حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ تجھے صحبتِ صالح ہی صالح بنائے گی اور بد قماش لوگوں کی صحبت بد قماش

اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام (جن کو آدم ثانی کہا جاتا ہے) کا بیٹا کنعان بری صحبت اختیار کر کے خود بھی برا ہوا اور خاندانِ نوحؑ سے کٹ بھی گیا۔ حضرت امام غزالیؒ نے اپنی تصنیف "احیاء العلوم" میں لکھا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی بُری صحبت کی شیدائی تھی۔ رات کو حضرت نوحؑ کے ساتھ تو صبح لوگوں میں جا کر کہتی کہ نوحؑ پاگل ہیں۔ العیاذ باللہ ..... اور جب سیلاب آیا، خدا کا قہر نازل ہوا تو خود حضرت نوح علیہ السلام ان کو نہ بچا سکے۔ اس لیے کہ دونوں کو صحبتِ بد نے بگاڑ کر ہدایت سے دور چھوڑ دیا تھا۔

حضرت شمعون علیہ السلام اسرائیلی، روم کے کسی شہر کے باشندہ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار اور رشد و ہدایت کرتے تھے۔ ان کے خاندان والے بتوں کی پوجا کرتے، قسم قسم کے واہیات کاموں میں مبتلا تھے اور ان کو شمعون سے ایک گونہ تعلق نہ تھا۔ یہ لوگ شمعونؑ کے قتل کے درپے ہو گئے اور شب و روز تاک میں رہتے تھے۔ شمعون کی بیوی بھی اُن لوگوں سے متاثر تھیں اور ان کی ہم جلیس اور اُن کے افعال بد کی تائید کرتی رہتیں۔ چناں چہ بُت پرستوں نے شمعون کی بیوی سے ساز باز کر کے خونِ شمعونؑ سے اپنے پلید ہاتھوں آلودہ کیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم افعالِ بد کا شکار تھی، چند فرشتے بصورت نوجوانان حضرت لوطؑ کے پاس آئے۔ قوم کے بدکردار نوجوانوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کا پیچھا کیے۔ وہ فرشتے غائب ہو گئے

زوجۂ لوط بُری صحبت کی مریضہ تھیں۔ انہیں بُری صحبت متاثر کر چکی تھی۔ انھوں نے جا کر لوگوں میں خبر دے دی کہ وہ نوجوان گھر ہی میں حضرت لوطؑ کے پاس موجود ہیں۔ قوم کے بُرے کرتوت کی یہ انتہا تھی کہ وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے کردار بُری صحبت سے جتنا متاثر اور مجروح ہوئے کسی اور سے نہیں اور صحبت میں اتنی تاثیر ہے جتنی سانپ اور بچھو کے زہر میں نہیں۔ چناں چہ حضرت سعدیؒ کے اس قول کی تائید اپنے اس شعر سے کرتے ہیں۔ ؎

ترا اژدہا گر بود یارِ غار		ازاں بہ کہ جاہل بود غمگسار

میں اچھا سمجھتا ہوں کہ اژدہا تیرا یارِ غار ہو۔ لیکن میں یہ خوب نہیں سمجھتا کہ تیرا غمگسار جاہل ہو۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام ایک مرتبہ دوڑے چلے جا رہے تھے ایسے کہ جیسے کوئی درندہ آپؑ کا پیچھا کر رہا ہو۔ ایک شخص نے پوچھا آپ کے پیچھے تو کوئی شئے نہیں پھر آپؑ پرندے کی طرح کیوں اُڑے جا رہے ہیں؟ آپؑ نے اپنی تیز روی کو جاری رکھا اس بات کو سُنی ان سُنی کر دی۔ وہ شخص تیزی رفتاری میں ساتھ نہ دے سکا تو دُور سے آواز دی کہ اے اللہ تعالیٰ کے نبیؑ! خُدا کے لیے اک پل ٹھہر جائیے اور بتائیے کہ آپؑ ایسے کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ میں احمقوں کی صحبت سے بھاگ رہا ہوں۔ اس نے پوچھا: کیا آپؑ وہ مسیحا نہیں جن سے اندھے، بہرے شفایاب ہوتے ہیں اور آپؑ وہ بادشاہ نہیں کہ مُردہ پہ کلامِ الٰہی کو دَم کر دیں تو شیر کی طرح جھوم کر کھڑا

ہو جائے! جب آپؐ ہیں اتنی قوت ہے تو خوف کس کا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: بے شک میں وہی ہوں۔ اس ربِّ کائنات کی قسم! اسمِ اعظم کو میں اندھوں، بہروں پر پڑھا تو شفا پا گئے، پہاڑوں پر دم کیا تو پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے اور مُردوں پر پڑھا تو جی اٹھے لیکن اسی اسمِ اعظم کو میں نے احمقوں بدقماشوں، ذلیلوں، نادانوں پر لاکھوں مرتبہ پڑھا لیکن اثر نہ ہوا۔ بلائیں آدمی کے رتبہ کو بلند کرنے لیے آتی ہیں اور رحمت ہیں مگر صحبت بد اور صحبتِ نادان تو سراپا زحمت ہے۔

اے عزیز! احمقوں کی صحبت نے بڑے فتنے برپا کئے ہیں۔ صحبتِ بد نے اخلاق کو مجروح کیا ہے جیسے ہوا آہستہ آہستہ پانی کو خشک کر دیتی ہے ویسے ہی بُری صحبت اخلاق کو غارت کر دیتی ہے۔ ؎

تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی نادان کو اُلٹا تو نادان نظر آیا

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت کا طوق پہنایا گیا تو آپؒ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: لوگو! میرا ہم نشین اور میرا ہم جلیس وہ ہوگا جو فریاد کرنے والے کی فریاد مجھ تک پہنچائے اور میرا مصاحب وہ ہوگا جو اہلِ حق کو مجھ سے حق دلائے گا۔ اور جی حضوری کرنے والا اور علم دین سے کورا، غیبت کرنے والا، جاہل، نادان، بدقماش میرا مصاحب نہیں ہوگا۔ کیوں کہ مجھے بہکنے کا خوف جتنا کہ جاہل اور نادان سے ہے اور کسی سے نہیں۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ جب تم کسی قوم سے میل جول رکھنا چاہو تو انتخابِ نظر معزز لوگوں کی جانب رکھو۔ ذلیل بدقماش، بدطینت لوگوں سے رابطہ نہ رکھو۔ کیوں کہ تم بھی انھیں جیسے بن جاؤ گے۔

حضرت فضیل ابن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے بادشاہ ہارون رشید اپنے ایک ہم نشین کے ساتھ بغرض ملاقات آئے۔ گفت و شنید کے درمیان فضیل نے فرمایا: اے بادشاہِ وقت ہم نشین عمدہ ڈھونڈ کیوں کہ تو اپنے ہم نشین سے پہچانا جائے گا اور اکثر بادشاہ بُرے مصاحبین کی وجہ سے مارے گئے، سلطنتیں الٹ گئیں اور آخرت برباد کر لی۔ کیوں کہ شہر میں معاملہ ہوتا ایک ہے اور خبر دیگر دی جاتی ہے اور فریاد کرنے والوں کی فریاد رسی نہیں ہوتی۔ بُرے ہم جلیس کی وجہ سے اہلِ حق اپنا حق نہیں پاتے۔

ان پُر تاثیر کلمات اور نصائح کو سن کر بادشاہ تو رونے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بادشاہ کا مصاحب ہم نشین بادشاہ کا اس طرح ہچکیوں کے ساتھ روتا دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور حضرت سے کہنے لگا: یا حضرت آپ تو بادشاہ کو مار ڈالا۔ آپؒ نے فرمایا: میں کیوں ماروں؟ جب کہ مارنے والے تو بُرے ہم جلیس، ہم نشین ٹھہرے۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے داماد مغیرہ ابن شعبہ سے فرمایا: اے برادر نیک جوئید ہم نشین۔ اپنا ہم نشین نیک تلاش کر کہ جس سے کوئی دینی فائدہ پہنچے گا ورنہ اُسے ترک کر اسی میں سلامتی ہے۔

سرورِ کشورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخال**: آدمی اپنے مصاحب اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے اسی لیے تم میں سے ہر ایک کو تفکر چاہیے کہ اس کا ہم نشین کون ہو! اگر کوئی نیک لوگوں

کا ہم نشین ہے تو باوجود خود بُرا ہونے کے نیک کہلائے گا۔ صلحاء کی بیٹھک اُسے صالح کردے گی اور صحبت کی تاثیر نمایاں نظر آئے گی۔ بُروں کی صحبت میں بیٹھنے والا بُرا ہی کہلائے گا۔ اگرچہ کہ نیک ہو کیوں کہ اُن کی بیٹھک اُسے برائی میں دھکیل دے گی۔ بُرے کرتوت کی تائید کرتا رہے گا یہ شئے بھی ہدایت سے رکاوٹ ہے۔

حضرت ساجد ابن الخورشیدؒ کہتے ہیں کہ میں جتنا رنجیدہ اور کبیدہ خاطر بُری صحبت سے ہوا ہوں کسی اور شئے سے نہیں۔ اس لیے کہ صحبتِ بد بَاعِدمن رحمۃ اللہ: اللہ کی رحمت سے دُور کرنے والی اور مانع ھدایت ہے۔

ابوالارسلان علامہ محمد حنیف رحمۃ اللہ علیہ گویا ہیں کہ میں نے جس شئے میں وفور تاثیر دیکھی ہے وہ ہم نشینی ہے۔ صالح ہو کہ بد۔ کیوں کہ وہ انقلاب آفریں ہے۔

ابوالثوبان خالدؒ رقمطراز ہیں کہ میں ایک جہاں دیدہ ہوں اور حکیم ہوں۔ جب سرفرازی دیکھتا ہوں تو نیک صحبت کا اثر دیکھا ہے اور خیالاتِ فاسدہ نے مجھے متزلزل کیا ہے تو نادانوں اور جاہلوں کی مصاحبت کا اثر دیکھا ہے۔

"کشف المحجوب" میں لکھا ہے کہ ایک شخص طواف کعبہ کر رہا تھا اور دُعا مانگتا تھا کہ اے ربِّ کعبہ! میرے ہم نشین ہم جلیس، مصاحبوں کی اصلاح فرما اور صحبتِ نیک عطا فرما..... کسی نے پوچھا: یہ آپ کیسی انیق دُعا مانگتے ہیں۔ تو اس نے کہا: اس لیے یہ دُعا مانگتا ہوں کہ اگر میرے ہم نشین خوب ہیں تو میں بھی خوب ہوں۔ دراصل وہ میرے تعارف کا باعث ہیں۔

حضرت سعدیؒ شیرازی گویا ہیں: ؎

گِل خوشبوئے در حمام روزے	رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری	کہ از بوئے دلاویز تو مستم
گفتا من گلِ ناچیز بودم	ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد	وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمہ: ایک دن حمام خوشبودار مٹی ایک محبوب کے ہاتھ سے مجھ کو ملی۔ میں نے اس مٹی سے کہا تو مشک ہے کہ عنبر کیوں کہ میں تیری خوشبو سے مست ہوں۔ مٹی نے کہا: میں ناچیز مٹی ہی تھی۔ لیکن ایک مدّت سے پھول کی ہم نشینی رہی ہے اس لیے مجھ میں وہ مست خوشبو پیدا ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بطفیل، صلحاء کی ہم نشینی بخشے۔ ثم آمین

وما علینا الا البلاغ ••

مولوی ایل۔ رحمت اللہ (بی۔ ٹی۔ ایم) لطیفی

آپؓ ہیں شمشیرِ دیں، تنویرِ دیں، توقیرِ دین　　دینِ حق کے رہنما، فاروقِ اعظم آپؓ ہیں
آج بھی جو گونجتی ہیں مسجدوں میں رات دن　　ان اذانوں کی بنا، فاروقِ اعظم آپؓ ہیں
اُجاگر کر رہی ہے اپنے جلوؤں سے زمانے کو　　تعالیٰ اللہ! سیرتِ حضرت فاروقِ اعظم کی!

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظیم شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپؓ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ایسا عظیم مدبّر، منتظم، سپہ سالار دنیا کی تاریخ پیدا نہیں کر سکی۔ اس کا اعتراف غیر مسلم مورخوں نے بھی واضح طور پر واضح الفاظ میں کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لو کان بعدی نبیٌ لکان عمر: میں نے عمر ابن الخطاب میں وہ خوبیاں دیکھی ہیں کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ (ترمذی)

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ اپنے علم وعمل، اخلاص واخلاق، نظم ونسق، تدبر وتفکر کی مدح خود کر لینے کی بہ نسبت یہ خوب ہے کہ اور لوگ اس کی مدّاح ہوں۔ و نیز لوگ جب ہی معترف، مداح وہم خیال ہوں گے جب کہ وہ اپنے ہم نشینوں، ہم جلیسوں اور رفیقوں میں اپنا رعب و وقار باقی رکھے۔ تو دیکھا جائے کہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ اصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نظر میں کیا حیثیت اور کیا مقام رکھتے ہیں:

خلیفۂ اول جناب صدیق اکبرؓ سے بوقت انتقال پوچھا گیا کہ عمرؓ جیسے سخت گیر انسان کو زمام امّت سونپ کر جا رہے ہیں، آپؓ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ آپؓ نے فرمایا: میں کہوں گا: اے اللہ! میں تیرے سب سے بڑے پرستار کو زمام امّت سونپ کر آیا ہوں۔

خلیفۂ ثالث عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا آپؓ عمر ابن الخطابؓ کیوں نہیں بن جاتے؟ تو

آپؓ نے فرمایا: میں لقمان بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یعنی عمرؓ بننا اتنا ہی مشکل امر ہے جتنا کہ لقمان حکیم بننا مشکل ہے۔

خلیفۂ رابعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد کفن کا کپڑا ہٹا کر فرمایا: بخدا اس وقت پُوری دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے اعمال میرے لیے اس زیرِ کفن شخصیت کے اعمال کے مقابلہ میں قابلِ رشک ہوں۔ ونیز کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے بارے میں یہ سوچوں کہ کاش! اس کا نامۂ اعمال مجھے مل جاتا۔

سعید ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ عمرؓ کے واصل بحق ہونے پر بہت روئے۔ کسی نے پوچھا: کیوں روتے ہو؟ فرمایا میں تو خود اسلام کو روتا ہوں، عمرؓ کی موت اسلام کا ایک کاری زخم ہے جو تا صبح محشر مندمل نہ ہو سکے گا۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کے سلسلے میں منقول ہے کہ جب کبھی حضرت عمرؓ کا ذکر چھڑ جاتا آپؓ پر گریہ طاری ہو جاتا اور فرماتے: یاد رکھو! عمرؓ اسلام کا مضبوط قلعہ تھے جس میں داخل تو ہوا جا سکتا ہے۔ نکلا نہیں جا سکتا۔ وہ کیا مرے کہ قلعہ میں دراڑیں پڑ گئیں، شگاف نمودار ہوئے۔ اب لوگ اس میں سے باہر آتے جاتے ہیں۔

حضرت ساجد ابن الخورشید رحمۃ اللہ علیہ سیرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں لکھتے ہیں کہ جب گوہر عمرؓ (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ) باپ کے حکم سے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچ کر نبیٔ اکرمؐ کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت مانگتے ہیں تو ام المؤمنین عائشہؓ نے رو کر فرمایا: کہ میں اس شخص کو وہاں مدفون ہونے کی اجازت کیوں نہ دوں کہ جس شخص کو خود نبیٔ اکرمؐ نے اپنی جھولی پھیلا کر یہ کہہ کر مانگا تھا: یا اللہ! عمر کو اسلام سے مشرف فرما۔ تیرے دین اسلام میں روح پڑ جائیگی حضرت ساجدؒ فرماتے ہیں کہ جب ذکرِ عمرؓ چھڑ جاتا ام المومنین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور رحمت کی دعا فرماتیں۔

اللہ رب العزت سے ہم سب مسلمانوں کو جرأت عمر اور فراست فاروق عطا فرمائے۔ آمین: وما علینا الا البلاغ۔
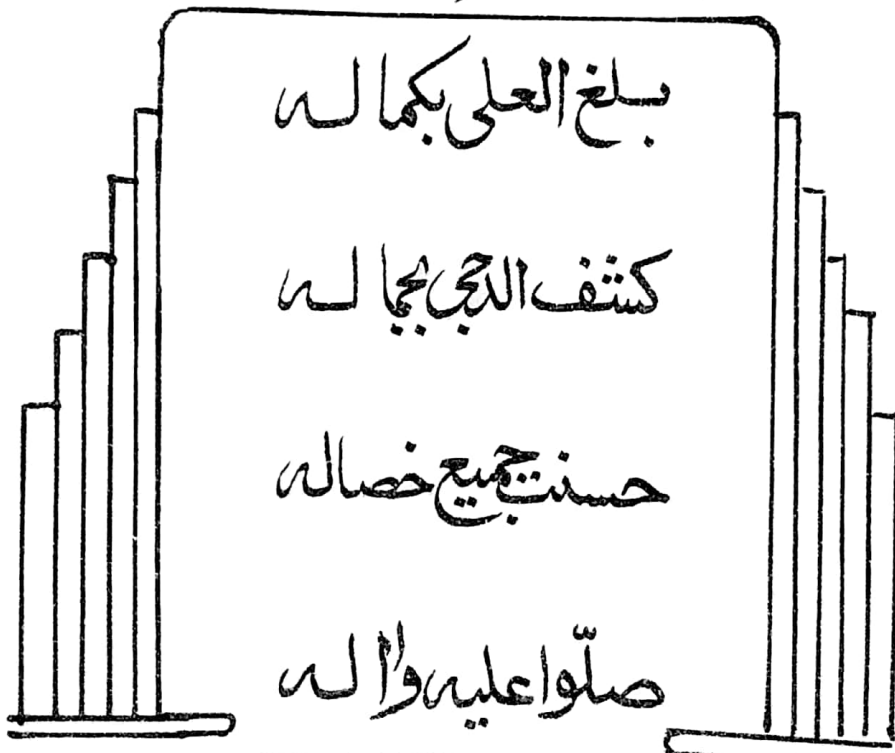
احادیث کی روشنی میں فضیلت

مولوی سید شاہ نور اللہ حسینی چشتی۔ بیجاپوری لطیفی۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین نے دین حق کی اشاعت کی۔ انھیں خلفاء راشدین میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بھی ہیں۔

آپؓ ذوالنورین کہے جاتے تھے۔ آپؓ کی ولادت با سعادت واقعہ اصحاب الفیل کے چھ سال بعد ہوی۔ آپؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سال چھوٹے تھے۔ آپؓ خاندان بنی اُمیہ سے تھے۔ آپؓ کے والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا۔ آپؓ کا خاندان عرب کے خاندانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ آپؓ بڑے قابل ولائق خلیفہ گزرے ہیں۔ آپؓ لکھنا پڑھنا بھی بخوبی جانتے تھے۔ اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا میر منشی بنایا تھا۔ وہ آپؓ کو بہت چاہتے تھے۔ مکہ کے رئیس التجاروں میں سے تھے۔ بزازی (کپڑوں کی) کی تجارت کرتے تھے۔ بہت سا مال و زر کمایا اور اسی مال و زر سے دینِ اسلام کی خدمت کی۔ غرباء اور مساکین کے لیے آپؓ کا دولت خانہ کھُلا رہتا تھا۔ کوئی مسکین کبھی آپؓ کے در سے خالی نہیں جاتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ کے نکاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ یکے بعد دیگرے آئیں۔ اسی فضیلت و سعادت کی وجہ سے آپؓ کو ذوالنورین کے لقب سے پکارے بھی جاتے تھے۔ اور یہ سعادت آپؓ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوی۔ اعلیٰ حضرت بریلویؒ فرماتے ہیں: ؎

نور کی سرکار سے پایا دوشالا نور کا
ہو مبارک تجھ کو ذوالنورین جوڑا نور کا

ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہؓ میں سے عثمان غنیؓ بلحاظ اخلاق مجھ سے بہت مشابہ ہیں۔

- طبرانی نے عصمت بن مالک کی روایت میں لکھا ہے کہ حضرت اُمّ کلثومؓ کے انتقال کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: تم لوگ ان کی شادی کہیں کرادو۔ بخدا اگر میری اور کوئی بیٹی ہوتی تو اس کو عثمانؓ کے عقد میں دے دیتا۔ حضرت رقیہؓ اور اُم کلثومؓ دونوں کا نکاح میں بر بنائے وحیٔ الٰہی کی تھی۔
- ابن عساکر نے زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے میں نے خود سُنا ہے کہ ایک مرتبہ عثمانؓ ہمارے پاس سے گزرے اس وقت ایک فرشتہ ہمارے پاس بیٹھا تھا۔ فرشتہ نے کہا: یہ وہ شہید ہیں جنھیں ان کی قوم قتل کردے گی۔ ہم سب فرشتے ان سے شرم کرتے ہیں۔
- شیخانؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی آمد پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے ٹھیک کرلیا کرتے اور فرماتے میں اس شخص سے شرم کیوں نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرم کرتے ہیں۔
- امام بخاری ابو عبدالرحمٰن سلمی سے روایت کرتے ہیں حضرت عثمانؓ جب محصور ہوگئے تو حصار کرنے والوں سے فرمایا: اللہ کی قسم دلاکر تم سب سے اور خصوصاً اصحابِ رسولؐ سے پوچھتا ہوں: تم کو معلوم ہے کہ رسولؐ نے فرمایا جو کوئی لشکرِ عسرہ کا سامان فراہم کرے وہ جنتی ہے۔ چناں چہ میں نے سامانِ جنگ فراہم کیا۔ تم کو رسول اکرمؐ کا یہ فرمان بھی معلوم ہے جو شخص چاہ رومہ خریدے گا وہ جنتی ہے۔ چناں چہ میں نے مدینۂ منورہ کے اس کنوئیں کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردیا تھا۔ جس کا مالک ایک یہودی تھا۔ اور آپؓ کی ہر بات کی صحابہؓ نے تصدیق کی۔
- ترمذی نے عبدالرحمٰن بن جنابؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لشکرِ عسرہ کی تیاری فرمارہے تھے۔ میں بھی اس وقت حاضر تھا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: سو اونٹ مع پالان اور سازوسامان کے میں پیش کروں گا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے صحابیؓ سے فراہمیٔ سامانِ لشکر کے لیے توجّہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے پھر عرض کیا: یارسولؐ اللہ تین سو اونٹ مع تمام سازوسامان کے فی سبیل اللہ پیش کروں گا اس پر سرورِ عالمؐ نے دوسرے صحابیؓ سے فراہمیٔ سامانِ لشکر کے لیے توجّہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے پھر عرض کیا: یارسولؐ اللہ! تین سو اونٹ مع سازوسامان کے فی سبیل اللہ میں پیش کروں گا۔ یہ سُن کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے اُتر آئے اور فرمایا: اب عثمانؓ کے جرم و گناہ اُن کو تکلیف نہ دیں گے۔
- ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی روایت کی کہ بیعت رضوان کے وقت حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر مکّہ بھیجا گیا تھا۔ چناں چہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعتِ رضوان کی اور آپؐ نے فرمایا: چوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے کام سے عثمان گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں خود اُن کی طرف سے بیعت کرتا ہوں۔ یہ فرما کر آپؐ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔
- ترمذی نے ابنِ عمرؓ کے حوالے سے لکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیندہ کے فتنہ و فساد کی خبر دی

اور حضرت عثمانؓ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ مظلوم (عثمانؓ) فتنہ وفساد میں شہید کر دئے جائیں گے۔

• ترمذی وحاکم اور ابن ماجہ نے بحوالہ الامرہ بن کعب لکھا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سُنا ہے: عنقریب ایک فتنہ رونما ہوگا، آپؐ کے ارشاد کے وقت ایک شخص اپنے کپڑوں میں لپٹا لپٹایا بارگاہِ نبویؐ میں آیا تو ارشاد ہوا یہ شخص اس فتنہ کے زمانہ میں بھی راہِ ہدایت پر گام زن رہے گا۔ میں نے کھڑے ہوکر دیکھا تو وہ حضرت عثمانؓ تھے۔ چناں چہ میں نے حضرت عثمانؓ کے چہرے کو رسولؐ اللہ کی جانب کرکے پوچھا کیا یہی عثمان بن عفانؓ راہ ہدایت پر ہوں گے؟ ارشاد عالی ہوا: ہاں! ہاں!! یہی!!!

• ترمذی وحاکم نے بحوالہ عائشہ صدیقہؓ لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمانؓ اللہ تعالیٰ تم کو قمیص (خلافت) عطا فرمائے گا۔ منافق تم سے وہ چھیننا چاہیں گے۔ تم اُسے منافقین کے حوالے نہ کرنا یہاں تک کہ تم ہم سے آملو گے۔

• ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں محصور رہتے ہوئے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے قول وقرار لیا ہے اور میں اس معاہدہ پر ثابت قدم ہوں۔ قتل کے خوف سے خلافت کو ترک نہیں کروں گا۔ میں اپنی وجہ سے مسلمانوں میں جنگ کے شعلے بھڑکنے نہیں دوں گا۔

• حاکم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عثمانؓ نے دو مرتبہ جنت مول لی ہے۔ پہلی مرتبہ بیر رومہ خریدا اور دوسری مرتبہ لشکر عسرہ کے لیے سازوسامانِ جنگ دے کر۔

• ابو یعلیٰ نے ابنِ عمرؓ سے روایت کی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرشتے جس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کی عزت وعظمت کرتے ہیں اسی طرح عثمان کا ادب کرتے ہیں۔ ••

قرآن کے آئینہ میں اولیائے کرام کا حسن و جمال

مولوی سید محمد عمر لطیفی ۔ بجاپالی (کرناٹک)

خود نہ تھے جو راہ پر عالم کے ہادی بن گئے		وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا، وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ

آیت مذکورہ میں اولیائے کرام کی فضیلت اور ان کا مرتبہ ان کا تقویٰ اور زندگی کی روح ہے ۔ اور سچے اولیائے کرام کی نشانی بتائی گئی ہے سچ کہا ہے کہ من کان اللّٰہ کان اللّٰہ لہٗ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اُن کا ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جنگل کے درندے ان سے ڈرتے تھے اور ان کے حکم کو مانتے تھے ۔ روم کا قیصر اور ایران کا کسریٰ اُن کی قدموں کی چاپ سے لرزہ بر اندام رہتے تھے ۔ وہ دریاؤں کی طرف بڑھتے تو دریا انھیں راستہ دے دیتے تھے ۔ عراقی فتوحات سے فارغ ہو کر عساکر اسلامی واپس لوٹنے لگے تو قائد لشکر اسلامی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو خیال آیا : فرمانے لگے : جی چاہتا ہے کہ ایرانی آتش پرستوں کو بھی حق پرستی کا سبق سکھایا جائے ۔ چناں چہ بہادر قائد نے شاہ ایران کے نام پیغام بھیجا ۔ ایرانیوں نے دریائے دجلہ کا پُل توڑ دیا اور کشتیاں بھی ہٹا دیں ۔ لشکر اسلام دریائے دجلہ کے کنارے کھڑے ہو کر اور قائد نے دجلہ کو حکم دیا جس کے حکم سے تو بہ رہا ہے اسی کے حکم سے ہم تیرے دہانہ پر پہنچے ہیں ۔ ہمارے لیے راستہ کھول دے ۔ اتنا کہہ کر بسم اللہ کہا اور دریا میں گھوڑے ڈال دیے ۔ گھوڑے تیرتے تیرتے تھک جاتے تو ان کے سموں تلے زمین نکل آتی تا کہ ذرا دم لے لیں ۔ ایرانی جواس کنارے پر کھڑے ان بزرگوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے ۔

اسی طرح سورۂ کہف میں خدا اللہ کے ولیوں کا بڑی تفصیل سے تذکرہ آیا ہے ، جنھوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جدوجہد کی اور جن کے تاریخ ساز انقلابی کردار کو قرآن کریم نے مثال بنا کر پیش کیا کہ ولی ایسے ہوتے ہیں انھوں نے دقیانوس بادشاہ کے دربار میں علی الاعلان کلمۃ الحق بلند کر کے ولایت کا معیار (بقیہ صـ ۱۲۷ پر)

مولوی شیخ عبداللہ لطیفی۔ گنتکل

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین درحقیقت نبوّت کا ظلِ کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالاتِ نبوت وجواہر رسول پہچانے جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ایک طبقہ عزیز ہو کہ اس کو راہ نما مانے تو وہ طبقہ، گروہ حضراتِ صحابہ کا ہے۔ جس کی شہادت قرآن وحدیث نے پیش کی ہے۔ قرآن میں ہے:

من اطاع الرسول فقد اطاع اللہ : جس شخص نے اطاعت کی رسول کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ ابوالفضل جوہری اور شیخ ابوالعالی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ سے اطاعت کو تابعداری کو دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے۔ جس کا معنی یہ ہوتا ہے طریق جدا جدا نہیں بلکہ جو اللہ عزوجل کا ہے وہی نبیٔ اکرمؐ کا راستہ ہے۔ ہو بہو ایسے ہی راہِ خدا معلوم کرنے کا معیار رسولؐ خدا کی راہ ہے اور نبیٔ اکرمؐ کی راہ معلوم کرنے کا معیار معیارِ صحابہؓ ہے

حدیث میں ہے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ خدا نے کہ میری اُمّت تہتّر ۷۳ فرقوں میں بٹ کر رہ جائے گی سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ پوچھا گیا: وہ خوش نصیب گروہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جو میرے اور میرے طریق پر چلیں۔

ایک حدیثِ دیگر میں مرقوم ہے: آپؐ نے فرمایا: اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم میرے صحابہؓ مانند ستاروں کے ہیں جو اُن کی اقتدا کو لازم پکڑے گا راہِ ہدایت پائے گا۔ شارحینِ حدیث لکھتے ہیں کہ صحابہؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور بہت تیز ہے اور نبیٔ اکرمؐ سے اقرب تر ہے۔ انھوں نے نبوّت کی زندگی سے قریب رہ کر معائنہ کیا اور اسکی شعاعوں کا نور قبول کیا۔ اسی لیے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی ہے بلکہ جائزات کی آڑ لے کر عمل کے اعلیٰ ترین حصّہ کو اپنا لیا جائے اور اپنے نفوس کی راحت طلبی کو ترک کر کے علم وعمل، اخلاص واخلاق، ریاضت ومجاہدہ

(بقیہ ص پر)

کی زندگی بنائی جائے۔ اگر ہم نے خواہشاتِ نفسانی و مرغوباتِ دنیا کو چھوڑ دیا اور راحتِ نفس سے راہِ فرار اختیار کر کے شریعت و اتباعِ رسول ﷺ و اقتدا ءِ صحابہ رض کو مسلک بنایا اور صحابہ رض کو نیاہ گاہ تصور کر کے اپنے عمل کا اظہار کیا اور عزمِ صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیاتِ الٰہی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنا لیا تو حیات خوش بخت ہے ورنہ زندگی بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔

صحابہ کرام جانتے ہیں تھے کہ حیثیتِ دنیا و حقیقتِ دنیا کہ عند اللہ اس کی حقیقت ایک مکھی کے پر کے مساوی نہیں تو تارکِ دنیا ہو گئے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام میں رہبانیت گوشہ نشینی ناپسندیدہ امر ہے۔ تو رہبانیت سے جدا بھی رہے۔ دنیا کے جاہ جلال دھن دولت، حکومت و سیاست کے ہجوم میں بھی رہے اور ادائے حقوقِ دنیا میں پیش پیش بھی۔ ہدایت اور کمالاتِ اعتدال کا پورا نقشہ جیسے صحابہ رض کرام کی زندگی مانند فضا کے ہے جو روحانی فضا ہے۔ فضا گندگی سے متاثر نہیں ہوتی۔ کوئی بالکل صحابہ رض پہ سب و شتم کرے یا ان کی حیات کا تمسخر اڑائے، اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ان کی زندگی کو دلیل بنائے فو تدینُ تدان، جیسی کرنی ویسی بھرتی کے تحت اپنے انجام کو پہنچے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو گستاخیٔ صحابہ رض سے محفوظ رکھے اور ان رض کے حسن اخلاق اور حسنِ عمل سے نوازے اور صحیح اقتدا کی توفیق بخشے — آمین۔ ••

اقوالِ زرّیں

• یم۔ بی۔ محمد فضل اللہ جنجی۔ زمرۂ خامسہ •

• انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت کا دامن داغ دار ہو جائے۔ (حضرت سفیان ثوری رح)

• وقت خام مسالے کے مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہے بنا لے سکتے ہیں۔ (حضرت امام غزالی رح)

• مصائب سے مت گھبرائیے کیوں کہ ستارے اندھیروں میں ہی چمکتے ہیں۔ (حکیم لقمان رح)

• محبت خدا کی امانت ہے اور وہی محبت پائیدار ہے جو صرف خدا کے لیے ہو۔

(حضرت جنید بغدادی رح)

• جسم بیمار ہوتا ہے تو درد و کرب میں مبتلا ہوتا ہے اور کھانے پینے میں لذت معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح دلوں کی بیماری گناہ ہے۔ جس طرح گنہ گار روح کو عبادت کی حلاوت و لذت محسوس نہیں ہوتی۔

(حضرت ذوالنون مصری رح)

• ایمان کے لیے اس طرح جد و جہد کرو جیسے لوگ اپنی دنیا کے لیے جد و جہد کرتے ہیں اور جو زبان کو قابو میں نہ رکھے گا وہ پشیمان ہوگا۔

(حضرت امام جعفر صادق رح)

• جو باتیں زیادہ کرے گا وہ غلطیاں کرے گا، جو غلطیاں زیادہ کرے گا اس میں شرم کم ہو گی جس میں شرم کم ہو گی اس میں پرہیزگاری نہیں ہو گی اور دوزخ میں جائے گا۔

(حضرت علی رض)

••

قاری سید شاہ محمد جمال اللہ بادشاہ کڈپوی زمرۂ خامسہ دارالعلوم لطیفیہ۔ ویلور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حیات میں نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی خلیفہ۔ حضور اکرم ہی اُمّت کے سردار تھے اور آپ ہی تمام دینی امور سے ادا کرنے کی راہیں بتلاتے تھے۔ آپؐ کے ارشاد اور احکام اور فیصلوں کو سبھی لوگ قبول کرتے تھے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن کو بھیجتے ہوئے ان سے دریافت فرمایا کہ اے معاذ! تم اہل یمن کے فیصلے کیسے کروگے؟ تو معاذؓ نے فرمایا: میں کتاب اللہ کے تحت فیصلہ کروں گا، اگر کتاب اللہ میں نہ پایا تو سنّت رسولؐ کے تحت فیصلہ کروں گا۔ اگر سنّتِ رسولؐ میں بھی نہ پایا تو دونوں کو سامنے رکھ کر قیاس کروں گا اور اس کے بعد پھر فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے یہ بات سن کر تبسم فرماتے ہوئے حضرت معاذؓ کو رخصت فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین کا دور آیا تو اس وقت قضاوت کا کام منظم طریقے سے جاری رہا۔ سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں قضاوت کو قائم رکھا۔ آپؓ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں شریح بن حارث کندی قاضی مقرر ہوئے۔ جو متواتر پچھتر (۷۵) سال تک اپنے عہدے پر فائز رہے۔ اسلامی قضائت میں یہ نہایت نامور اور مشہور رہے۔

مدینے کے سب سے پہلے قاضی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ تھے۔ مصر کے قیس بن ابی العاصؓ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عبداللہ بن قیس کو اصولِ عدالت پر ایک ہدایت نامہ لکھ کر روانہ کیا تھا۔

جس کی روشنی میں قضائت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ فیصلہ کا انحصار کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔

2۔ عدالت میں فریقین کو اپنے سامنے مساوی رکھو تاکہ جو ادنیٰ ہے وہ تمہارے عدل سے نا اُمید اور جو اعلیٰ ہے وہ تمہاری رعایت کا امیدوار نہ ہو جائے

3۔ ثبوت مدعی کے ذمّہ ہے اور وہ ثبوت نہ لائے تو قسم مدعی الیہ پر مصالحت جائز ہے۔ لیکن ایسی کہ جس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے۔

4۔ جو فیصلہ تم نے کیا ہے غور کرو اور اگر حق کے خلاف نظر آئے تو اس سے رجوع کر لو۔

5۔ جس معاملہ میں خلجان ہو اور وہ کتاب وسنّت میں نہ ملے تو اس کے نظائر کو دیکھو پھر انھیں پر قیاس کرو۔

6۔ مدعی کو ثبوت کے لیے ایک مدّتِ معیّنہ کی مہلت دو اگر وہ ثبوت لائے تو اس کا حق دو ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کرو۔

7۔ تمام مسلمان ایک دوسرے پر شہادت کے لیے قابلِ اعتبار رہیں بجز ان لوگوں کے جنھوں نے حدِّ شرعی میں دُرّے کھائے ہوں، یا جھوٹی شہادت میں اُن کا تجربہ ہو چکا ہو یا ولا اور وراثت کے معاملہ میں مشتبہ ہوں۔

اس مکتوب کو عام طور پر اُس عہد کے قاضیوں نے اپنا دستور العمل بنا رکھا تھا۔ جب عہد فاروقی ختم ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپؓ نے اپنے دور میں زید بن ثابتؓ کو مدینے کا قاضی مقرر کیا۔ آپؓ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ آپؓ نے بھی اپنے دور میں قضاۃ کے سلسلہ کو باقی رکھا۔

مقدمات کا فیصلہ قانونِ شرع کے مطابق خلیفہ کے فرائض میں تھا اور خلفاء اپنی مصروفیات اور ذمہ داریوں میں اضافہ کی وجہ سے اپنی طرف سے نائب مقرر کرتے تھے۔ خلیفہ اول کے عہد میں ہر شہر کا جو عامل ہوتا وہی فصلِ خصومات کی خدمات انجام دیتا تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں محکمۂ قضاۃ کو ایک جُدا گانہ اور مستقل صیغہ قرار دیا گیا۔ اس کو انتظامی امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قاضیوں کو تنخواہ بیت المال سے دی جاتی تھی اور ان تمام قاضیوں میں سے جو عہدہ پر مقرر کئے گئے تھے کسی ایک بارے میں بھی یہ نہیں سُنا گیا کہ انہوں نے کسی مقدمہ میں رورعایت کی ہو یا رشوت لے کر انصاف کا خیال نہ رکھا ہو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کی دورِ خلافت کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے آپ کا جنگی لباس

چوری کرلیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونے پر آپ اپنا دعویٰ قاضی کی عدالت میں پیش کرتے ہیں۔ قاضی اس کو مدعو کرکے پوچھتے ہیں کہ یہ جنگی لباس کس کا ہے۔ تو چور نے کہا کہ یہ لباس میرا ہے۔ حضرت علیؓ کا جواب بھی وہی تھا جو چور کا تھا۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے دو گواہ پیش کرنے کے لیے کہا۔ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے اور غلام کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ قاضی نے کہا کہ بچہ کی گواہی اور غلام کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ پھر فیصلہ سنایا یہ لباس آپ کا نہیں۔ یہ تو اسی شخص کا ہوگا۔ اور لباس اسی شخص کے سپرد کردیا۔

صحابہؓ، تابعینؒ کے دور تک فیصلے قرآن وحدیث اور خلفاءِ راشدین کے فیصلوں کے مطابق ہوتے پھر آئمۂ اربعہ نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں فقہ وقوانین شرع کی تدوین کی جس پر مسئلہ اور معاملہ پر روشنی ڈالی گئی۔ اور قاضیوں نے ان ہی کی روشنی میں اصولوں پر منصفانہ فیصلے کرنے لگے۔

قاضی مجتہد مطلق نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا کام یہ تھا کہ قانونِ شرعی کو اچھی طرح سمجھ کر جن واقعات اور حوادث میں کوئی صریحی حکم نہ ملے تو نظائر و امثال پر قیاس کرکے ان کا فیصلہ کریں یعنی قواعدِ کلیہ سے جزئی احکام نکالیں۔

قاضیوں کے علاوہ ہر شہر میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی پیدا ہوگئی تھی جو قوانینِ شرعیہ سے استنباط احکام کا تفقہ حاصل کرتی تھی۔ قاضی مشکل امور میں اس جماعت سے بھی مدد لیتے تھے۔

سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اُس زمانہ تک احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدوّن نہیں ہوئی تھیں۔ صحابہؓ متفرق دیار و امصار میں تھے۔ اور ایک کے پاس جو حدیثیں ہوتی تھیں وہ دوسروں کے پاس نہیں تھیں۔ اسی لیے قاضیوں کے ایک ہی قسم کے معاملات میں باہم مختلف ہوتے تھے۔ کسی کو کوئی حدیث مل جاتی تو وہ اسی کے مطابق فیصلہ کردیتا تھا۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ استنباط و اجتہاد سے کام لے کر دوسرے نتیجے پر پہنچتا تھا۔ ان فیصلوں کا اندراج کسی دفتر میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ فریقین کو اس فیصلہ کی باقاعدہ نقل دی جاتی تھی۔ اور نہ ان کی تنفیذ و اجراء کے لیے کوئی طاقت استعمال میں آتی تھی۔ بلکہ قاضی جو حکم دیتا تھا اس کی تعمیل فوراً ہوجاتی تھی۔

اس زمانہ میں فریقین کی حیثیت مستفسر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ جب اُن کو اپنے معاملہ میں شرعی حکم قاضی کی عدالت سے معلوم ہوجاتا تھا تو خود اس کے مطابق کاربند ہوجاتے تھے۔ اس سے لوگوں میں احکام شرعیہ پر عمل کرنے اور قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جب مغلیہ سلطنت تھی تو اس وقت بھی قاضی ہوا کرتے تھے۔ اور انھیں تنخواہ دی جاتی تھی اور وہ شرعی معاملات میں شرع کے مطابق فیصلہ دیا کرتے تھے۔ ہندوستان بھر کے ہر صوبہ میں قاضی مقرر تھے۔ جب مغلیہ سلطنت کو زوال آیا اور انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انگریزوں نے بھی قاضی کا عہدہ اور منصب برقرار رکھا۔ جب اُن کی حکومت مکمل طور پر ہندوستان پر مسلط ہو گئی تو انہوں نے اپنا قانون لاگو کیا۔ کورٹ کچہری، کلکٹر، مجسٹریٹ، جج جیسے عہدے مقرر کر دئے اور قاضی کے عہدے کو علاحدہ کر دیا۔ اس سے پہلے قاضی کے فیصلہ قابل قبول ہوتے تھے اور کورٹ کچہری میں بھی اسی فیصلے کی تعمیل کرتے تھے۔ لیکن اب ان کے قانون کی وجہ سے قاضی کا وہ رعب و دبدبہ نہ رہا۔ اور کوئی ذمہ داری قاضی کے اوپر نہ رہی۔ لیکن اتنا تو رہ گیا کہ مسلمانوں کے فیصلے منصف (میجسٹریٹ) قاضی کے فتویٰ کی روشنی میں کرتے تھے۔ لیکن یہ چیز بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی گئی۔ اور لوگ اپنے شرعی مقدّمات بھی حکومت کی عدالتوں میں لے جانے لگے اور قاضی کا منصب صرف ایک گزیٹیڈ افسر مانا جانے لگا۔

ہندوستان کے ہر ایک صوبے میں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ قاضی ہیں اور یہ اپنی دینی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اور ان قاضیوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ ان میں قضاوت وراثتاً سے چلی آ رہی ہے۔

موجودہ دور میں قضاوت کا منصب اور عہدہ کو بحال رکھا گیا ہے۔ اب صرف عیدین کا چاند وغیرہ کا اعلان ان حضرات کے ذمّہ ہے۔ ہاں ان کے دئے ہوئے فتوؤں کو حکومت مستند اور معتبر مانتی ہے۔ اور عدالت میں انہیں کی روشنی میں فیصلے ہوتے ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود اپنی شرعی عدالتیں علماء اور قاضیوں کی مدد سے قائم کرلیں اور اپنے معاملات ونزاعات کو شرعِ اسلامی (فقہ) کی مدد سے حل کرنے کی سوچیں اور عدالتوں کے دروازے کھٹ کھٹانے اور اخراجات کے بارِ گراں سے محفوظ رہیں۔

وما علینا الا البلاغ ••

مولانا راھی فدائی

نعتِ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
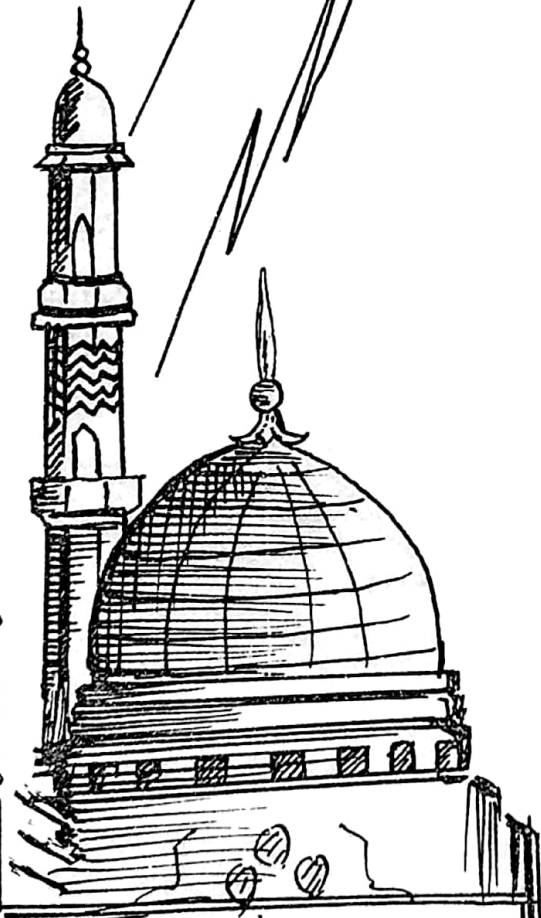
عشقِ نبیؐ حیات ہے زنداں ترے بغیر
کب ہو سکا ہے گھر یہ چراغاں ترے بغیر

انسانیت کے مدعی لاکھوں ہوئے مگر!
انساں نہ بن سکا کوئی انساں ترے بغیر

کتنا کوئی موحدِ اعظم ہی کیوں نہ ہو!
کہلائے گا نہ صاحبِ ایماں ترے بغیر

تُو وجہِ "کن فکاں" ہے تُو ہی جانِ کائنات
معدوم تھا یہ عالمِ امکاں ترے بغیر

داعی بھی عین دعوتِ اللہ بھی ہے تو!
کس کو بنائیں زیست کا عنواں ترے بغیر

سجدے ابوالبشرؑ نے کئے سینکڑوں برس
حاصل نہ کی عنایتِ یزداں ترے بغیر

خضرِ رہِ نجات! تو ہی باعثِ نجات
یکسر عبث ہے خلد کا ارماں ترے بغیر

پُر نور تیری ذات ہے قرآں ترے صفات
راھی بھلا ہو کس کا ثنا خواں ترے بغیر

مرسلہ: سید بلال احمد شطاری بنگلور

دارالعلوم لطیفیہ کا اندرونی منظر